80
خوامخواہ
مرزا امجد بیگ
ناکردہ جرم میں پھنسے
ایک شخص کا احوال

100
برابری کا بوجھ
محمد عثمان ذوالفقار
ایک ایسی دنیا جہاں
انفرادیت جرم تھی اور برتری گناہ

104
محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں بنی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

107
کھیل کھیل میں
ماہ وش طالب
ایک بھٹکی ہوئی روح کی
عیاش طبع نوجوان سے دل لگی

111
جنگ باز
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خونی سازشوں اور
زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

138
منصوبہ ساز
جاوید بسام
جیک دی ریپر کہلائے جانے
والے سیریل کلر کی کہانی

151
سفید چھڑی
صائمہ دانش
اپنے ماضی سے خائف ایک
خوبصورت لڑکی کی پریشانی

155
میرزا یحییٰ صبح ازل
ضیا تسنیم بلگرامی
خود ساختہ مدعیان نبوت میں سے ایک
جس کا اردو میں بہت کم ذکر کیا گیا

168
تریاق
فرح بخاری
الجھے معمے سلجھانے والے ایک
پرعزم نوجوان کی داستان

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

جون ایلیا

راکھ یا دھواں

ہم دیکھتے ہیں کہ چرندے، پرندے، درندے، گزندے، خزندے اور آبی جانور نہ ٹھٹھے لگاتے ہیں، نہ ہنستے ہیں اور نہ مسکراتے ہیں۔ بس انسان ہی ایسا جانور ہے جو مسکراتا ہے، ہنستا ہے اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔

بات شاید یہ ہے کہ دوسرے جانور بے حس نہیں ہیں جو اس نامہربان دنیا میں مسکرائیں، ہنسیں اور ٹھٹھے لگائیں اور وہ بردبار بھی ہیں...... اور انسان بہت حساس کہلائے جانے کے باوجود بے حس ہے اور عاقل اور باشعور ہونے کے باوصف بردبار نہیں ہے۔ انسان نے لاکھوں برس میں جو ترقی کی ہے اس کی اصل وجہ اس کا صرف عاقل ہونا ہی نہیں ہے، بے حس ہونا بھی ہے۔ وہ کیسی کیسی قدریں انتہائی بے حسی اور بے رحمی کے ساتھ پامال کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ان قدروں کے قصیدے بھی پڑھتا ہے۔ وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ کیسے کیسے جرم ظہور میں آتے نہیں دیکھتا اور سب کچھ بھول کر اپنے کاروبار میں لگ جاتا ہے۔ یاد رکھا جائے کہ جانور، قدریں پامال نہیں کرتے۔ ان کے ریوڑ، ان کے غول اپنے دشمن کے خلاف مہیب منصوبے نہیں بناتے۔ انسان نے اپنے بہت قصیدے کہے ہیں۔ اسے اپنی ہجو بھی سننی چاہیے۔ منطق نے اس عالی شان جانور کی چند تعریفیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک "حیوان ناطق" ہے۔ دوسری "حیوان ضاحک" یعنی ہنسنے والا جاندار اور تیسری "راست قامت" جاندار۔

میرے خیال میں ان تعریفوں میں سب سے درست تعریف حیوان ضاحک ہے۔ اس لیے کہ وہ اس دنیا کو اپنے جرائم اور مظالم کے ذریعے جہنم بنا کر کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا بلکہ اس پر مسکراتا، ہنستا اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔ وہ اپنی نوع کے لوگوں کو نیست و نابود کر کے کس قدر فخر محسوس کرتا ہے۔ فتح کے جشن مناتا ہے۔ جانور اپنے حریف جانوروں کو ہلاک کر کے فتح کا جشن نہیں مناتے۔ یہاں انسان کی طرف سے جو بات کہی جائے گی وہ یہ ہے کہ انسان عقل اور شعور رکھتا ہے اور جانور عقل اور شعور سے محروم ہیں۔ ذرا سوچیے کہ یہ جواب کتنا معقول ہے یعنی انسان چونکہ عقل اور شعور رکھتا ہے اس لیے زمین پر تباہی پھیلاتا ہے۔ اپنی نوع کے افراد کا بڑی مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ خون بہاتا ہے۔ قانون بناتا ہے اور خود ہی انہیں توڑ دیتا ہے۔ چونکہ وہ عاقل ہے، چونکہ وہ باشعور ہے۔

چشم بد دور انسان اب لاکھوں برس کا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر تیس پینتیس لاکھ برس سے کیا کم ہو گی۔ شاید زیادہ ہی ہو۔ اس مدت میں اس نے عجیب عجیب کمالات دکھائے ہیں۔ ہم اس پر چوٹیں کرنے سے باز نہیں آئیں گے مگر یہ بات ماننی پڑے گی کہ دنیا اس کی عقل اور اس کے علم کے کرشموں کی دنیا ہے۔ توانا ترین جانوروں اور ڈائنوسارز کی دنیا نہیں ہے جن کے سامنے وہ پدا ہے۔ مگر جاننا یہ ہے کہ آخر یہ عالی شان پدا چاہتا کیا ہے۔ کیا وہ اپنی عقل اور اپنے علم کا حق ادا کر رہا ہے؟ کیا وہ جتنی عقل رکھتا ہے اس میں اتنی ہی معقولیت بھی پائی جاتی ہے؟ کیا اس نے جتنا علم حاصل کیا ہے، اتنا ہی وہ انسانیت سے بھی بہرہ مند ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی "سمجھ بوجھ" اور اس کی ہنرمندی نے شمال، جنوب اور مشرق اور مغرب کے رہنے والوں کو ہراس اور ہول میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے علم نے نہ اسے معقولیت سکھائی اور نہ انسانیت۔ سوچنا یہ ہے کہ اگر عقل معقولیت کا سرچشمہ نہیں ہے تو پھر معقولیت کا سرچشمہ آخر کیا ہے؟ اور اگر علم انسانیت نہیں سکھاتا تو پھر انسانیت آخر کس طرح سیکھی جائے؟

قارئین کرام

السلام علیکم!

اپریل 2026ء کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ پہلے بات ہو جائے ملکی صورت حال کی کیونکہ اس وقت صورت حال بہت ہی ابتر ہے۔ عالمی منظرنامے کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں بھی صورت حال بہت نازک ہے۔ طاقت کے زعم میں بدمست اسرائیل و امریکا نے ایران کو تر نوالہ سمجھنے کی کوشش کی جس کے جواب میں ایران نے بھی کمال کی حکمت عملی سے کام لیا اور نہایت ہی عمدہ طریقے سے اپنا دفاع کیا اور دشمن کو بھرپور جواب بھی دیا۔ اور دنیا کو یہ باور کروایا کہ اسلام ہی واحد سپر پاور ہے۔ یہ وہی ایران ہے جو دہائیوں سے پابندیوں، بمباری اور تباہی کا سامنا کر رہا ہے لیکن اس کے ڈرون اور میزائل دنیا کے محفوظ ترین سمجھے جانے والے فضائی علاقوں تک پہنچ گئے۔ امریکا اور اسرائیل کی جانب سے تہران پر حملے اور سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای کی شہادت کے بعد ایران نے جوابی کارروائی کی۔ واضح رہے کہ دنیا کی کسی بھی فوج نے اس طرح کی کارروائی پہلے کبھی نہیں کی۔ مغرب کی جانب سے اربوں ڈالرز کے دفاعی نظام بنائے گئے جبکہ ایران نے ایسا عزم تیار کیا جو ان نظاموں کو عبور کر گیا۔ اس وقت آبنائے ہرمز کی بندش کے باعث دنیا بھر میں پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے اثرات پاکستان پر بھی پڑے ہیں جس کے باعث پیٹرول و ڈیزل کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ بہر حال جو بھی ہو، ایران نے کمال جرأت و بہادری دکھائی ہے وہ امتِ مسلمہ کے لیے ایک مثال ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ تمام مسلم امّہ کو اسرائیل جیسے بدمعاش کی شرپسندی سے محفوظ رکھے اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ اب آتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں قارئین کے تبصرے ہمارے منتظر ہیں۔

❁ عون احمد، ملیر، کراچی سے شامل محفل ہیں۔ "مارچ کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی حیرت کا جھٹکا لگا۔ اتنا سلم اور اسمارٹ پرچہ یعنی صفحات کی کمی، لیکن پھر ادارے والوں کی مجبوری کا دھیان آیا تو یہ کمی گوارا لگنے لگی۔ ٹائٹل پر رنگوں کا استعمال بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ رسالہ کھولا تو فہرست بھی کھلی کھلی سی نظر آئی۔ جون ایلیا صاحب کے انشائیے کی تو کیا ہی بات ہے۔ حکومت کی "طلق اللسانی" کے رجحان کا کیا خوب تجزیہ پیش کیا اس انشائیے میں۔ خطوط کی محفل میں ایڈیٹر صاحب بھی اور ادارے میں سانحہ گل پلازا پر بات کرتے نظر آئے۔ سانحہ گل پلازا ایک ایسا دکھتا ہوا زخم بن چکا ہے جو ہمیشہ رستا رہے گا۔ اللہ تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ خطوط کی محفل کے قارئین بھی اس سانحے کی وجہ سے اداس و ملول نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ اس غم کا ازالہ فرمائے۔ "ظالم مظلوم" کا آخری حصہ پڑھا۔ زویا صفوان نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہمیں پھولن دیوی کے حالات سے آگاہ رکھا۔ اتنے مہینوں سے ہم ہر مہم میں اس کے ہمراہ رہے۔ بالآخر پھولن اپنے انجام کو پہنچی لیکن اس کو جبراً اس دنیا سے بھیجنے والوں کی رسی کو اللہ نے ڈھیلا رکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی اپنے برے انجام کو پہنچے ہوں گے۔ اس مرتبہ مارچ کا شمارہ لگتا ہے کہ کہانیوں کے انجام کا شمارہ تھا، اس میں دیس پردیس کی بھی آخری قسط تھی۔ روزگار کی تلاش میں اپنا گھر اور اپنا ملک چھوڑ کر جانے والے نوجوان کی پوری زندگی اور اس میں پیش آنے والی مشکلات کو ناہید سلطانہ اختر نے نہایت خوبصورتی سے تحریر کیا اور قارئین نے بھی نہایت دلچسپی سے تمام اقساط کو پڑھا۔ "رمز شناس" کی کیا تعریف کی جائے، بے حد زبردست تحریر ہے۔ دیکھیے آگے مزید کون سے واقعات سامنے آتے ہیں۔ صائمہ دانش کی کہانی "موذی ریچھ" پڑھی۔ بیرسٹ نے مسز احمد کے مسئلے کا اچھا حل تلاش کیا جو کہ مستقل بھی تھا، یہ اس کی عقلمندی کی نشانی بھی تھا۔ "خود غرض" ملک صفدر حیات نے روایتی ہوشیاری سے بھولا کے قتل کا معاملہ حل کیا اور قاتل کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ کاش اس دور میں بھی ایسے فرض شناس پولیس افسر میسر ہو سکیں۔ اس کے بعد بات کرتے ہیں "خالہ کی کڑواہٹ" کی جس میں بے چاری نظر آنے والی خاتون نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ساجد کو عرفان کے بنائے گئے جال میں پھنسنے سے بچایا۔ بظاہر بُرا نظر آنے والی خاتون میں بھی بھلائی کا عنصر چھپا ہوتا ہے۔ میوق بخاری نے ساجد کو بچا لیا اور عرفان کا منصوبہ فیل کروا دیا۔ خالہ جیسے لوگوں کی ڈانٹ ڈپٹ میں بھی بھلائی کا عنصر چھپا ہوتا ہے۔ بوبورگا کا مجسمہ نے پرانے دور کے بزرگوں کی یاد تازہ کر دی۔ "جنگ باز" اپنے روایتی انداز میں آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ سہراب نت نئی مہمات سر کرنے میں لگا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی اس کی ہر مہم میں شریک ہوتے ہیں۔ سہراب کے لیے ایک چیلنج ہے جس کے حصول کے لیے سہراب کو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ دیکھیں کب کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ لبنیٰ خان اس مرتبہ "مکر" کے نام سے کہانی لے کر آئی ہیں۔ اس میں بھی راشن نے مکر و فریب سے اپنے شوہر سے نجات حاصل کی لیکن اپنی نحوست کے اثرات اپنے

گھر میں چھوڑ دی کہ پھر اس کے بعد وہ گھر آباد نہ ہو پایا۔ اچھی تحریر تھی۔ ''تماشا'' میں عائشہ نصیر نے بڑے اچھے انداز میں مشہور ہونے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے والوں کو بے نقاب کیا۔ واقعی آج کل اچھی یا بری شہرت معنی نہیں رکھتی بس کسی طرح سے مشہور ہو جائیں یہی آج کے لوگوں کا نصب العین ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ تصوف ہمیشہ بہترین ہوتا ہے، یعنی تبع ازل کے بارے میں پڑھا۔ ہر دور میں اس طرح کے فتنے سر اٹھاتے رہے ہیں، اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔ محفلِ شعر و سخن ہمارا پسندیدہ سلسلہ ہے، اسے جاری رکھیے۔ کترنوں نے خوب مزہ دیا۔ آپ لوگوں کی محنت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اجازت طلب کرتے ہیں، ان شاء اللہ آئندہ ماہ تبصرے کے ہمراہ حاضر ہوں گے۔''

❁ سیما شاہ کی مصروفیت ڈیرہ غازی خان سے۔ ''ماہ مارچ کا شمارہ فروری کی آخری تاریخوں میں موصول ہوا۔ ٹائٹل گرل کی تیاری کو سراہ کر جون ایلیا کا ''ناگزیر'' پڑھا، سمجھا، سراہا، تائید کی اور پھر خطوط کی جانب پیش قدمی کی جہاں سیدہ روبینہ شاہین کرسیِ صدارت پر زبردست تبصرے کے ساتھ براجمان تھیں، بہت مبارک باد۔ اپنے خط کے شائع ہونے کی خوشی سناتے بشریٰ امیر بھی شاملِ محفل تھے۔ آپ کے لیے دعا بھی کرتے ہیں اور آپ کی دعا پر آمین بھی۔ تبصرہ اچھا تھا۔ ہمیشہ سے بہترین تبصرہ لکھنے والے سید محی الدین اشفاق بھی محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ روبینہ اشعر کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ ایم ظفر اللہ ضیا کی ''شکایت برائی'' تبصرہ مختصر تھا۔ انجم فاروق ساحلی صاحب کا خط پڑھ کر دل غمگین ہو گیا۔ اللہ آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو صبر دے اور مرحومین کی مغفرت کرے، آمین۔ آپ یقیناً مزید لکھ پائیں گے، ان شاء اللہ۔ آپ کی اگلی تحریر کا انتظار رہے گا۔ ملک وحید نے اس بار مختصر بھی نہیں لکھا؟ اب ذکر کہانیوں کا۔ ''ظالم مظلوم'' کا اختتام ہو گیا۔ زندگی میں اپنے دشمنوں سے ان کے ظلم کا بدلہ لیتی پھولن نے خوب نام اور مقام بنایا مگر آخر کار سازش کا شکار ہو گئی۔ ''دیس پردیس'' میں رجب علی کے ساتھ کچھ اچھا ہونے سے پہلے ہی برا لکھا جا چکا تھا۔ تیسری بیوی قدر کرنے والی ملی تو موت نے آلیا۔ اختتام کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ایسے میں عیوق بخاری کی ''خالہ کی کڑواہٹ'' نے دل بہلایا اور خوب ہنسایا۔ دلچسپ تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی ''تماشا'' میں ٹونی اور ڈیزی نے جان لیوا پلان بنایا جو کہ آج کل چل بھی رہا ہے۔ نوجوان نسل مشہور ہونے اور پیسا کمانے کے لیے یہی کر رہی ہے۔ اچھی تحریر تھی۔ لبنیٰ خان کی ''مکر'' میں مسکان نے سچ، جھوٹ کی تصدیق کرنے کے بجائے گھر چھوڑنے کا صحیح فیصلہ لیا، عمدہ تحریر تھی۔ رمضان المبارک کی مصروفیات کے پیش نظر کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اشعار اور کترنیں خوب رہیں۔ جتنا پڑھا، شمارہ زبردست رہا۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔''

❁ سید محی الدین اشفاق کی آمد حج پور لیہ سے۔ ''بہار کا موسم جوبن پر ہے، رنگ برنگے پھولوں کی شگفتگی، تازگی اور مہک نے دل خوش کر دیا ہے، موسم بہار اور ڈھیروں پھول عطا کرنے والے رب سے دعا ہے کہ وطن اور اہلِ وطن کو ہر موسم میں بہاری خوشیاں عطا کرے۔ دلوں میں خوشی کے پھول کھلیں اور زندگی میں ان پھولوں کی طرح رنگ ہی رنگ ہوں، آمین۔ خطوط کی محفل میں سیدہ روبینہ شاہین روبی کرسیِ صدارت پر بیٹھی تھل والوں کے جذبات اہلِ وطن کو پہنچا رہی تھیں۔ بڑے کرب سے انہوں نے اپنوں کا دکھ بیان کیا ہے، ان کی دعا پر آمین۔ بشریٰ امیر اپنی مثبت سرگرمی کامیابی سے آگے بڑھا رہے ہیں، ویل ڈن۔ سیما شاہ کا تبصرہ بھی خوب رہا۔ کراچی والی روبینہ یعنی محترمہ روبینہ اشعر صاحب نے طویل اور تجزیاتی تبصرہ لکھا۔ محمد ظفر اللہ ضیا صاحب! آپ کا لفظ ''ظالم سماج'' پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوا کہ آپ کو رسالے سے کتنا عشق ہے۔ آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ادارے سے (ہماری طرح) بات کر کے چھ ماہ یا سالانہ خریدار بن جائیں۔ بہت جلد سے بھی جلد رسالہ مل جایا کرے گا (ہمارا ذاتی تجربہ ہے)۔ انجم فاروق ساحلی صاحب سے دل کی گہرائیوں سے تعزیت، خدا انہیں صبرِ جمیل اور مرحومین کو بلند درجات عطا کرے، آمین۔ دانیال حسن چغتائی کی غیر حاضری کے بعد حاضری خوشگوار لگی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر کی ''دیس پردیس'' کا آخری حصہ پڑھا۔ پیسوں، مستقبل کے لیے دیارِ غیر جانے والے رجب علی کی داستان کا اینڈ اداس کر دینے والا تھا۔ زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' بھی ختم ہو گئی ہے۔ پھولن دیوی معاشرے سے انتقام لیتے ہوئے بیک وقت ظالم اور مظلوم دکھائی دی۔ عیوق بخاری کی ''خالہ کی کڑواہٹ'' مزاحیہ اور دلچسپ تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی ''تماشا'' اور صائمہ دانش کی ''موذی ریچھ'' عمدہ تحریریں تھیں۔ اشعار اور کترنیں بھی دلچسپ تھے۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔''

❁ روبینہ اشعر، کراچی سے۔ ''مارچ کا شمارہ حسبِ معمول جلد مل گیا۔ رمضان کے مہینے میں روزہ، عبادات اور گھریلو کام نمٹاتے ہوئے ٹائم نکالنا بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب بھی ٹائم ملا، اپنا پسندیدہ رسالہ پڑھتے رہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل سادہ

مگر پُرکشش رہا، پسند آیا۔ فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے آگے بڑھے اور جون ایلیا کے انشائیہ ”ناگزیر“ سے مستفید ہوئے۔ انہوں نے درست فرمایا کہ اچھی حکومت وہ ہے جسے معاشرہ اپنے احساسِ آزادی کا ضامن اور وکیل سمجھتا ہو۔ خطوط کی محفل میں مدیر صاحب کی پُرمغز گفتگو اچھی رہی۔ محفل میں سیدہ روبینہ شاہین روبی کرسیٔ صدارت پر اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ روشنیوں کے شہر کا غم محفل کے ٹیلوں تک واضح محسوس کیا گیا۔ ان کی ہر دعا پر آمین کہتے ہیں۔ مبشر امیر کا تبصرہ بھی خوب رہا۔ دیگر احباب میں سیتا شاہ، سید محی الدین اشفاق، محمد ظفر اللہ ضیا، انجم فاروق ساحلی، دانیال حسن چغتائی بھی اپنے شاندار تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھاتے رہے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب سے دلی تعزیت۔ ان کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں، اللہ پاک سے دعا ہے کہ مرحومین کے درجات بلند فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ملک وحید کی غیر حاضری محسوس ہوئی۔ ان کا نام محفل میں شامل نہ ہونے والوں میں بھی نہ تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا صفوان کی ”ظالم مظلوم“ کا آخری حصہ پڑھا۔ پھولن دیوی سماج سے ٹکراتے اور لڑتے ہوئے بالآخر قتل کر دی گئی۔ واقعی وہ ظالم مظلوم تھی۔ صائمہ دانش کی ”موذی ریچھ“ اچھی رہی۔ نازیہ کامران کاشف کی ”رمز شناس“ میں نیکی اور بدی کی قوتوں کا ٹکراؤ دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ کہانی اپنی تمام تر دلچسپی اور سنسنی خیز واقعات کے ساتھ تیزی سے اپنے اختتام کی جانب رواں ہے۔ روڑے کی حالت میں طیب سنگھانوی کی ”اندھیرے تلے“ پڑھی جو سرسے گزر گئی۔ جرائم کی دنیا سے ملک صفدر حیات کی ”خو گرفتہ“ اچھی رہی۔ ملک صفدر حیات کی کڑی تفتیش کے بعد بدری جیسا ننگِ انسانیت کردار اپنے انجام کو پہنچا۔ لبنیٰ خان کی ”مکر“ متاثر کن تحریر تھی۔ ہلکے پھلکے مزاح میں تحریر کی گئی عیوق بخاری کی کہانی ”خالہ کی کڑواہٹ“ زبردست رہی۔ خالہ کی عقلمندی نے ساجد کو آوارہ لوگوں سے بچا لیا۔ عائشہ قیصر کی تحریر ”تماشا“ خوب رہی۔ ڈیڈی اور ٹونی وائرل ہونے کے جنون میں مبتلا تھے اور اس کے لیے انہوں نے غلط طریقہ اپنایا۔ خود ساختہ مدعیانِ نبوت میں سے ایک کا قصہ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ”میرزا یحییٰ صبح ازل“ میں پڑھنے کو ملا۔ آئندہ قسط کا انتظار ہے۔ جاوید بسام کی تحریر ”قیدِ تنہائی“ نے متاثر کیا۔ ایڈورڈ کی نام نہاد آزادی درحقیقت اس کے لیے قیدِ تنہائی بن گئی تھی اور کسی دوسرے انسان کو دیکھنے کا شاک ہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ”دیس پردیس“ کے آخری حصے نے دل اداس کر دیا۔ روزی روٹی کی تلاش میں اپنے ملک اور اپنے پیاروں کو چھوڑ کر پردیس جانے والے رجب علی کی داستانِ حیات ترکِ وطن کر کے نئے دیس جا بسنے والے ہزاروں، لاکھوں تارکینِ وطن کی نوحہ بہ نوحہ ان گنت داستانوں میں سے ایک ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں تمام اشعار اچھے تھے۔ کترنوں نے لطف دوبالا کر دیا۔“

✽ قیدی مبشر امیر، پشاور سینٹرل جیل سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”خوبصورت حسینہ کا ٹائٹل فوٹو اس دفعہ تو بہت زیادہ اچھا لگا، دوپٹے میں حسینہ کچھ زیادہ ہی باحیا لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے کچھ ملکی حالات شیئر کر دوں کہ ہمارے ناسمجھ اور کم عقل بلکہ بے وقوف کہنا بجا ہوگا، ہمسایہ ملک افغانستان نے ایک دفعہ پھر سے دراندازی کی ہے اور ہمیشہ کی طرح ہماری بہادر اور دلیر افواج نے نہ صرف بھرپور دفاع کیا ہے بلکہ آخری اطلاعات تک متعدد خوارج کو مار گرایا اور کئی چوکیوں پر قبضہ کر کے پاکستانی پرچم لہرا دیا۔ خیر دعا ہے کہ رمضان کے مبارک مہینے کے صدقے افغانی حکمرانوں کو بھی اللہ ہوش کے ناخن دے اور وہ غیروں کے ایجنڈے سے باز رہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بری خبر بھی تھی جو چاہتا تھا کہ سب لوگوں سے شیئر کروں کہ پاکستانی ٹیم تقریباً ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی نہ صرف انڈیا سے ہار گئی بلکہ ورلڈکپ کی دوڑ سے بھی باہر ہو چکی ہے۔ پتا نہیں وہ دن کب آئیں گے کہ جب ہماری ٹیم کوئی بہت بڑا ٹورنامنٹ جیتے گی۔ ایک اور بات آپ قارئین سے شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے مہینے میری والدہ محترمہ جو میرے لیے دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی ہستی تھیں، وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اللہ نے میرے سر سے ماں جیسا عظیم سایہ واپس لے لیا، ایسا لگتا ہے کہ میں کھلے آسمان تلے آ گیا ہوں۔ اللہ میری والدہ کے درجات بلند فرمائے اور ان صاحبان کے والدین کے بھی درجات بلند فرمائے جن کے والدین اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں، آمین۔ اب شمارے کی طرف آتا ہوں تو ”انشائیہ“ میں جون صاحب نے حکومت اور حکمرانی کو ایک شر سے تشبیہ دی ہے، خیر یہ ان کی اپنی منطق ہو سکتی ہے لیکن میں اس سے بالکل بھی متفق نہیں ہوں۔ خطوط میں سیدہ روبینہ شاہین روبی صاحبہ کو ڈھیر ساری مبارکباد کیونکہ کرسیٔ صدارت اس دفعہ ان کو نصیب ہوئی۔ اپنا نام پڑھ کر مسرت ہوئی، خط شائع کرنے کے لیے تمام ذمے داران کا بے حد شکریہ۔ اس کے بعد سیتا شاہ کا تبصرہ بھی اچھا تھا، محی الدین صاحب، روبینہ اشعر صاحبہ، محمد ظفر اللہ، انجم ساحلی اور دانیال حسن کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ کہانیوں میں ”ظالم مظلوم“ کا اختتام بے حد اچھا تھا۔ زویا صفوان نے کہانی کو اچھے انداز میں اختتام پذیر کیا۔ پھر باری آئی ہم سب کی پسندیدہ ”رمز شناس“ کی۔ حلیمہ نے کتاب چوری تو کر لی ہے لیکن اب دیکھو کہ خود حلیمہ کے ساتھ شیطانی عملیات کیا کیا ہوتے ہیں کیونکہ اس نے اپنی روح کو شیطان کے حوالے خود ہی کر دیا ہے اور عباد کے بارے میں بھی دیکھنا ہے کہ وہ کتاب واپس لانے کے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔ عباد سے ایک

اور غلطی بھی ہو چکی ہے کہ وہ جس کو کانا دجال سمجھ رہا تھا وہ تو ایک بہت ہی بڑی قابلِ عزت اور قابلِ احترام ہستی نکلی۔ خیر شاندار طریقے سے کہانی جاری ہے مگر ”اندھیرے تلے“ کہانی پڑھی بالکل بھی سمجھ نہ آئی، معذرت چاہتا ہوں۔ محفلِ شعر و سخن پڑھی، بہت ہی معذرت کے ساتھ بہت زیادہ اشعار بالکل ہی بچکانہ اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوئے لگے۔ ”جنگ باز“ بھی خوب جا رہی ہے۔ ہیرو سہراب تو ہمیشہ ہی دشمنوں سے ایک قدم آگے رہتا ہے۔ ”دیس پردیس“ کا آغاز کی طرح اختتام بھی اچھا تھا۔ اس کہانی میں بڑے ہی اچھے انداز میں مغرب کی برائیوں کو واضح طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم ایشیائی لوگ اپنی فیملی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ امید ہے ان کہانیوں کے اختتام کے بعد نئی آنے والی کہانیاں بھی اسی طرح شاندار ہوں گی ایک دفعہ پھر سے آپ سب سے دعا ہے کہ تمام مرحومین اور خصوصاً میری والدہ محترمہ کے لیے دعائے مغفرت کیجیے گا (اللہ پاک آپ کی والدہ محترمہ کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین) اور آخر میں میری بیرک کے بھائی محمد عباس اور ماجد علی اور میری طرف سے تمام قارئین کو ایڈوانس میں ڈھیر ساری عید الفطر مبارک ہو اور دعا ہے اس رمضان کے صدقے اللہ ہم سب قیدیوں کو بھی جلد اپنے گھر جانے کا سبب پیدا فرمائے، آمین ثم آمین۔“

❁ سیدہ روبینہ شاہین روبی کی خوشی تحصیل ساہیوال پنجاب سے۔ ”حاضر ہیں اپنوں کی محفل میں۔ اپنے آپ کو صدرِ محفل دیکھ کر خوشی ہوئی، ادارے کا شکریہ کہ میرے جذبات اور لفظوں کو توقیر دی۔ بشریٰ امیر کا خط لکھنا بہت اچھا اقدام ہے۔ کتاب، رسالے سے وابستگی یقیناً ایک مثبت عمل ہے۔ بینا شاہ نے بھرپور طریقے سے حاضری دی اور عمدہ تبصرہ لکھا۔ سید محی الدین اشفاق سانحہ گل پلازا پر نہایت دکھی نظر آئے۔ خدا آپ کا درد کم کرے اور ہمیں آئندہ ایسے سانحات سے محفوظ رکھے، آمین۔ میری ہم نام یعنی روبینہ اشعر نے کیا خوب لفظوں کا چناؤ کر کے زبردست تبصرہ لکھا ہے۔ روبینہ جی او بلی ڈن۔ محمد ظفر اللہ ضیا کی مختصر سی حاضری اور رسالہ وقت پر نہ ملنے کا شکوہ پڑھا۔ دعا ہے ان کی یہ شکایت دور ہو جائے۔ انجم فاروق ساحلی کا خط پڑھ کر دکھی ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، اللہ پاک ساحلی صاحب اور فیملی کو صبرِ جمیل دے، آمین۔ دانیال حسن چغتائی کا تفصیلی خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اپنوں کی محفل میں سب اپنوں کا ساتھ بہت اچھا رہا۔ زویا صفوان کی ”ظالم مظلوم“ پھولن دیوی انجام کو پہنچی۔ زویا جی نے اچھے طریقے سے کہانی کو بیان کیا۔ صائمہ دانش کی ”موذی ریچھ“ اچھی تحریر تھی۔ عیوق بخاری کی ”خالہ کی کڑواہٹ“ دلچسپ تحریر تھی۔ صفیہ خالہ کے غصے کی حالت میں واقعات پڑھ کر بے اختیار مسکراہٹ لبوں پر آتی رہی اور پھر ایک معاملے کو اپنی کڑواہٹ سے سلجھا کر خالہ نے دل جیت لیا۔ جاوید بسام کی ”قیدِ تنہائی“ اور طیب سنگھانوی کی ”اندھیرے تلے“ دلچسپ تحاریر تھیں۔ اشعار بہت پسند ہیں اس لیے سارے ہی ایک دم پڑھ لیے۔ ہری پور سے طارق اسماعیل نے خوبصورت شعر بھجوایا۔ رجب علی کا انجام بھی پڑھ لیا۔ ناہید سلطانہ اختر نے ”دیس پردیس“ میں ایسے شخص کا حال بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے جو پیسوں کی چاہ میں بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھتے ہوئے سارے رشتے پیچھے چھوڑ گیا۔ سبق آموز تحریر تھی۔ ناہید صاحبہ کو مبارک اور آئندہ ان کی تحاریر کے منتظر رہیں گے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ سب کے لیے نیک خواہشات۔“

❁ ملک وحید کا مختصر نامہ کراچی سے۔ ”مارچ کا شمارہ اپنے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ نظر آیا تو فوراً خرید لیا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور پھر جون ایلیا کے مختصر انشائیہ ”ناگزیر“ سے فیض یاب ہوئے۔ خطوط کی محفل میں سیدہ روبینہ شاہین روبی کو کرسیٔ صدارت ملنے پر مبارک باد۔ محفل میں اپنی حاضری نہ دیکھ کر دکھ ہوا۔ دیگر احباب میں روبینہ اشعر، بشریٰ امیر، بینا شاہ، سید محی الدین اشفاق، محمد ظفر اللہ ضیا، انجم فاروق ساحلی، دانیال حسن چغتائی کے تبصرے بھی خوب رہے۔ کہانیوں میں نادیہ کامران کاشف کی ”رمز شناس“ زبردست جا رہی ہے۔ زویا صفوان کی ”ظالم مظلوم“ کا آخری حصہ پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ طیب سنگھانوی کی ”اندھیرے تلے“ کچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ صائمہ دانش کی ”موذی ریچھ“ پسند آئی۔ ملک منظور حیات کی ”خود غرضی“ خوب رہی۔ لبنیٰ خان کی ”مکر“ نے متاثر کیا۔ عیوق بخاری کی تحریر ”خالہ کی کڑواہٹ“ زبردست رہی۔ عائشہ قیصر کی تحریر ”تماشا“ متاثر کن تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ”میر دا بکیٹ صبحِ ازل“ اچھی رہی، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ جاوید بسام کی کہانی ”قیدِ تنہائی“ پسند آئی۔ ناہید سلطانہ اختر کی ”دیس پردیس“ کا آخری حصہ زبردست رہا۔ رجب علی کے انجام نے دل اداس کر دیا۔ محفلِ شعر و سخن میں تمام اشعار کا انتخاب اچھا تھا۔ کترنوں نے لطف دیا۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

رضا علی، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد حسین، کراچی۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ امتیاز احمد، چھالیہ۔ جاوید اقبال، لیہ۔ غلام سرور، میر پور خاص۔ احسان اللہ، بھکر۔ راحیل علی، کراچی۔

کالا طوفان

اے آر راجپوت

جنگیں جو اپنے ساتھ صرف تباہی لاتی ہیں... اور جسے اپنے اثرات کے اعتبار سے بربریت کا نشان سمجھا جاتا ہے... زیادہ تر تاریخی جنگیں خودغرضی سے شروع ہوکر انسانی جانوں کے زیاں اور بربادی پر منتج ہوئیں... اور افسوس کہ جنگی جنونیوں نے ہر دور میں اس دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا... جنگِ عظیم اول اس کی جیتی جاگتی مثال ہے... جو ایک شہزادے کے قتل سے شروع ہوئی اور پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آخر کار کروڑوں انسانوں کی بھینٹ لے کر اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور کن طاقتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا؟ یہ دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جنگ و پیکار، عہدِ وحشت کی یادگار اور اپنے اثرات کے اعتبار سے بربریت کا نشان سمجھا جاتا ہے لیکن یہ امر واقع ہی ہے کہ یہ جذبہ کچھ اس طرح انسانی فطرت میں رچا ہوا اور انسانیت کے خمیر میں گندھا ہوا ہے کہ ہزاروں برس کے علم و خرد، تحقیق و تجربہ اور مسلسل اخلاقی اور روحانی ریاض کے بعد بھی اسی شدت اور قوت سے دنیا پر غالب نظر آتا ہے۔

ہاں ہم...... اگر دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں اس قدر ہولناک جنگوں کی لرزہ خیز داستانیں نظر آئیں گی جنہیں انسان آج تک بھلا نہیں سکتا۔ جنگ اگرچہ انسانی فطرت کا حصہ نہیں سمجھی جاتی تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان قدیم ہے۔ دنیا کی تاریخ اور جنگوں کا تجزیہ کرنے سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ آج تک جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں وہ معمولی باتوں سے ہی شروع ہوئیں۔ زیادہ تر جنگیں بادشاہوں، ریاستوں اور حکومتوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر شروع ہوئیں جن سے لاکھوں انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی وحشت کا نشانہ بنے۔ دنیا کی تاریخی جنگیں انسانی کھوپڑیوں کے مینار، بھوک، افلاس اور تشدد سے بھری پڑی ہیں اور حیران کن بات یہ ہے کہ ایسی جنگیں انسانی خود غرضی کی وجہ سے ہوئیں جن کی لرزہ خیز داستانیں آج بھی لوگوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔

یوں اگر دنیا کی قدیم ترین جنگوں کو چھوڑ کر آخری سو سال کی جنگوں کا جائزہ لیا جائے تو بھی ایسی داستانیں سامنے آئیں گی جنہیں سننا یا برداشت کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ دنیا کی جدید اور بڑی جنگوں کی تاریخ آج سے 112 سال قبل جنگِ عظیم اوّل سے شروع ہوتی ہے اور اس جنگ نے انسانوں کے خیالات اور رویوں کو بھی تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جنگِ عظیم اوّل سے لے کر عرب، اسرائیل جنگ اور پھر 9/11 حملوں کے بعد دہشت گردی کے خلاف جدید جنگوں نے دنیا کو صرف تشدد، خوف، بھوک اور بے بسی ہی دی ہے۔ تاہم جنگِ عظیم اوّل سے لے کر اب تک کی تمام جنگوں کا جائزہ لینے سے یہ پتا چلے گا کہ یہ جنگیں معمولی باتوں اور کچھ شخصیات کی انا کی وجہ سے ہی لڑی گئیں۔

جنگِ عظیم اوّل 1914ء سے 1919ء تک لڑی جاتی رہی۔ اس جنگ کو دنیا کی جدید تاریخ کی سب سے بڑی، پہلی اور خوفناک جنگ سمجھا جاتا ہے جو 1914ء سے لے کر 1919ء تک یورپ کے متعدد ممالک کے درمیان لڑی گئی۔ یہ جنگ اس وقت کے آسٹریا، ہنگری کے شہزادے

Archduke، ان کی اہلیہ Sophie کو Bosnia and Herzegovina کے شہر Sarajevo میں جون 1914ء کو قتل کرنے کے بعد شروع ہوئی۔ شہزادے اور ان کی اہلیہ کو قتل کرنے کا الزام سربیا کی قوم پرست جماعت کے کارکن پر لگا اور یوں آسٹریا، ہنگری کے سربیا سے تعلقات کشیدہ ہوگئے، جن کے تعلقات پہلے ہی مسائل کا شکار تھے۔ تاہم شہزادے اور ان کی اہلیہ کے قتل نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دونوں ممالک ایک دوسرے کے شدید مخالف ہوگئے۔

دونوں ممالک کو یورپ کے مختلف ممالک کی حمایت بھی حاصل رہی۔ سربیا کو روس، برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک جبکہ آسٹریا، ہنگری کو جرمنی اور سلطنت عثمانیہ (ترکی) جیسے ممالک کی حمایت حاصل رہی۔ یوں دو ممالک کی جنگ نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پانچ سال تک جاری رہنے والی جنگ میں کم سے کم 8.5 ملین فوجی اور ہزاروں عام شہری ہلاک ہوئے۔ اس جنگ کے خاتمے کے بعد جہاں جرمنی کو کمزور کر کے رکھ دیا گیا، وہیں سلطنت عثمانیہ کے بھی ٹکڑے کردیے گئے اور برطانیہ کی شہنشاہیت بھی کمزور پڑنے لگی۔ یورپ میں بھی بھوک اور غربت نے ڈیرے جما لیے، بیماریوں نے سر اٹھائے اور دنیا پہلی بار جنگ کے خوف سے ڈرنے لگی۔

اسی جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کی عظیم خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ جنگ عظیم میں دونوں فریقوں کے تقریباً ایک کروڑ آدمی کام آئے اور دو کروڑ کے لگ بھگ ناکارہ ہوگئے۔

دنیا کی بیشتر اقوام اس جنگ میں آہستہ آہستہ حصہ بننے لگیں اور یوں پوری دنیا جنگ کی آگ میں جھلستی چلی گئی۔ دنیا میں پہلی بار جدید ٹیکنالوجی استعمال کی گئی۔ پہلی بار دنیا نے کیمیائی اور زہریلی گیس کا استعمال دیکھا۔ یہ انسانی تاریخ کی تباہ کن جنگ تھی جس میں تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ اور بعض کے نزدیک تقریباً دو کروڑ لوگ ہلاک ہوئے اور اتنے ہی افراد غربت، بھوک اور بیماری کی نذر ہوگئے۔ تاریخ کے مطابق انیسویں صدی کے اواخر میں یورپ میں اتحاد بننے لگے تھے۔ 1904ء میں فرانس اور برطانیہ نے ایک معاہدہ کیا جو باقاعدہ اتحاد تو نہیں تھا تاہم قریبی تعلقات کے لیے بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ اسی طرح 1907ء میں ایک معاہدہ برطانیہ اور روس کے مابین (Triple le Entente) کے نام سے ہوا تھا جس میں روس، فرانس اور برطانیہ شامل تھے۔ اب یورپ تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف جرمنی، ہنگری، سربیا اور اٹلی جبکہ دوسری جانب روس، فرانس اور برطانیہ تھے۔ جاپان بھی 1902ء میں برطانیہ سے معاہدہ کرچکا تھا اس لیے اس نے برطانیہ کی طرفداری کرتے ہوئے اعلانِ جنگ کیا۔ اسی خوف اور طاقت کے نشے میں دنیا کے بیشتر ممالک اس جنگ کا حصہ بنتے چلے گئے۔

پہلی جنگ عظیم بیسوی صدی کا پہلا تنازعہ تھا۔ اس تنازعے کی بظاہر ابتدا ایک قتل سے ہوئی لیکن جنگ کے سائے کافی عرصے سے ان علاقوں پر منڈلاتے رہے تھے اور اس کا باقاعدہ آغاز 1914ء میں قتل کے بعد ہوا۔ پہلی جنگ عظیم جدید تاریخ کی سب سے زیادہ تباہ کن لڑائی تھی۔ اس جنگ میں عام شہریوں کے ساتھ ساتھ ایک کروڑ فوجی بھی ہلاک ہوئے۔ ہلاکتوں کی اتنی تعداد اس وجہ سے تھی کیونکہ بری، بحری اور فضائی لحاظ سے جدید تر ہتھیاروں کا آزادانہ استعمال ہوا۔

اس جنگ میں ایک طرف جرمنی، آسٹریا، ہنگری، سلطنت، ترکی اور بلغاریہ...... اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی، پرتگال اور امریکا تھے۔ 11 نومبر 1918ء کو جرمنی نے جنگ بند کردی اور صلح کی درخواست کر ڈالی۔ 28 جون 1919ء کو فریقین کے مابین معاہدہ ورسائی ہوا۔ مسلمان دنیا پر اس کا بہت برا اثر پڑا کیونکہ ترکی، جرمنی کا اتحادی رہا۔ اس لیے اسے اس جنگ کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

☆☆☆

جنگی قیدیوں کی بلند و بالا سفید عمارت جو یونان کے دارالحکومت ایتھنز کے مضافات میں واقع تھی، اس میں الگ سے پہلے ایک گرلز اسکول ہوا کرتا تھا۔ اس عمارت کو جدید طرزِ تعمیر کے خطوط پر بہت مضبوط بنایا گیا تھا جو صلیب کی شکل کی طرح تھی۔ یہ عمارت ایک کھلے اور بڑے وسیع میدان میں کوکینا نامی قصبے میں بنائی گئی تھی۔ یہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر قصبے کے مکانات کے درمیان یونانی فوج کی کچھ پرانی بیرکیں بھی تھیں جن میں نسبتاً کم بیمار یا اسپتال سے ڈسچارج ہونے والے جنگی قیدیوں کا کیمپ بنا دیا گیا تھا۔

اسپتال کا نظم و نسق زیادہ تر قید ہونے والے برطانوی ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں تھا جو جرمن فوجی افسروں کی زیرِ نگرانی چلایا جاتا تھا۔ یہاں دواؤں کی کمیابی کے باوجود علاج معالجے کے سلسلے میں مریضوں سے عملے کا برتاؤ اچھا تھا۔ اسپتال کے تقریباً تمام وارڈز برطانوی جنگی زخمیوں سے بھرے پڑے تھے جنہیں یونان یا کریٹ کے محاذوں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ جونہی کوئی زخمی قیدی چلنے پھرنے کے ذرا قابل ہوتا، اسے فوراً جنگی کیمپ میں منتقل کردیا جاتا۔ کیمپ اور اسپتال دونوں ایک ہی جرمن آفیسر کے ماتحت تھے جو چیکوسلواکیہ کا باشندہ تھا۔ وہ

ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت گیر اور غصیلا تھا۔ ابتدا میں تو قیدیوں کے تعلقات اس سے بہت دوستانہ تھے مگر فرار کے پہلے واقعے کے بعد سے اس نے بہت تنگ نظری اور غیر مصلحت اندیشی کے ساتھ قیدیوں کو دی جانے والی رعایت میں کمی کرنا شروع کر دی۔

اسپتال میں کھانے کا انتظام بہت خراب تھا۔ جتنی گنجائش پیش نظر رکھی گئی تھی، زخمیوں کی آمد اور تعداد اس کے حساب سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ناشتے میں صرف پودینے کی چائے ہوتی تھی جسے پینے کے بعد بھوک کا احساس مزید سوا ہونے لگتا تھا۔ اس پر مستزاد دوپہر کے کھانے میں سوکھی ڈبل روٹی کا صرف ایک توس اور بکری کے دودھ کا پنیر اور رات میں کھانے کے نام پر شوربے کا ایک پیالہ اور روٹی کا ایک ٹکڑا ہوتا تھا۔ کھانے کی یہ مقدار ان زخمیوں کو زندہ رکھنے کے لیے تو کافی تھی جو چوبیس گھنٹے پلنگ پر پڑے رہا کرتے تھے لیکن جو لوگ چلنے پھرنے کے قابل تھے، ان کے لیے بالکل ہی ناکافی تھی۔

نیوزی لینڈ کے کئی زخمی قیدیوں کے پاس موسیقی کے آلات تھے جنہیں انہوں نے یکجا کر کے ایک بینڈ کی شکل دے رکھی تھی اور گاہے بگاہے مختلف وارڈوں میں موسیقی کے پروگرام پیش کرتے رہتے تھے۔ ابتدا میں یونان کی ریڈ کراس کے افراد کو قیدیوں سے ملنے اور تحائف دینے کی اجازت تھی مگر جب یہ شبہ پیدا ہوا کہ اس طرح قیدی بیرونی ہمدرد تنظیموں سے روابط استوار کر رہے ہیں تو اس سہولت کو ختم کر دیا گیا۔ قیدیوں کو ہر دس دن بعد اپنے عزیز و اقارب کے نام ایک مختصر سا خط لکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یوں اسپتال میں چھ ہفتے گزارنے کے بعد ان خطوط کے جوابات بھی ملنا شروع ہو گئے تھے۔

بہر کیف...... بحیثیت مجموعی اسپتال میں قیدیوں کا ضبط اور حوصلے کا معیار اتنا زیادہ بلند نہ تھا۔ کئی لوگ تو اس بات سے ہی نالاں تھے کہ جنگ غلط حکمت عملی کے تحت لڑی جا رہی ہے کیونکہ وہ یونان اور کریٹ میں اپنی شکست اور گرفتاری کو غلط حکمت عملی کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ کچھ لوگ خوش بھی تھے کہ وہ جنگ کی قیامت خیزیوں سے محفوظ ہیں اور لڑائی کے بعد یقیناً خیر و عافیت سے اپنے عزیزوں سے جا ملیں گے مگر بیشتر تعداد ایسے افراد پر مشتمل تھی جو قیدیوں کی فرار کی پے در پے ناکامیوں سے بالکل ہی ہمت ہار چکے تھے۔ ان میں سینئر افسروں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ آدمی جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس میں خطرات اور ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کی استعداد اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ عام فوجی زندگی میں اس رجحان کا اندازہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر منصوبہ بنایا گیا کہ کیمپ کے تمام قیدی یکبارگی قوّالی بول کر فرار ہو جائیں۔ تقریباً ایک ہزار قیدی تھے جن کی نگرانی ایک وقت میں صرف چار سنتری کرتے تھے۔ ویسے ان کی کل تعداد بھی بیس سے زیادہ نہ تھی۔

آس پاس کی تمام یونانی آبادی دوست تھی اور عین ممکن تھا کہ سنتریوں کا اسلحہ چھین کر اس کی مدد سے قیدی ساحل سمندر پر موجود کسی جنگی کشتی پر قبضہ کر لیں۔ کریٹ کے ایسے تجربہ کار افسر موجود تھے جو اس کشتی کو بحفاظت مصر لے جا سکتے تھے۔ فضائیہ کے ایسے پرجوش نوجوان بھی قیدیوں میں شامل تھے جو قریبی ہوائی اڈے "مالوئی" پر حملہ کر کے وہاں کھڑے ہوئے تمام طیاروں کے ذریعے ان قیدیوں کو ترکی یا مصر پہنچا سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک خطرناک منصوبہ تھا لیکن نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے قابل افسران کی موجودگی میں اس کی کامیابی کا ففٹی ففٹی چانس تھا مگر اس منصوبے کو صرف اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ قیدی سینئر افسر اس کی ناکامی اور نتیجے میں ملنے والی سزا سے خوفزدہ تھے مگر انہیں جانوں کی ہلاکت کا بھی خطرہ تھا۔ ان کے دماغوں میں یہ بات کسی طرح نہیں اتاری جا سکی کہ "قیدیوں" کی حیثیت سے یہ اپنے ملک و قوم اور اس کی جنگی جدوجہد کے لیے بہر حال قطعی بے کار اور لاحاصل ہو چکے ہیں۔

یوں ان بدقسمت قیدیوں کے شب و روز اپنے جنگی نقصانات شمار کرنے یا اگلے کھانے کا انتظار کرنے میں بیت رہے تھے۔ انہیں ہر ماہ کچھ مارک (جرمن سکے) دیے جاتے تھے جنہیں وہ اسپتال کی کینٹین میں ہی خرچ کرنے کے مجاز تھے۔ یہ کینٹین ایک یونانی ٹھیکیدار چلاتا تھا۔ بعد ازاں ان مارکوں نے ایک خصوصی اہمیت اختیار کر لی کیونکہ رفتہ رفتہ قیدیوں کو پتا چلا کہ اگر وہ چاہیں تو ان جرمن سکوں کو مقامی کرنسی میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ یوں جیسے جیسے ان کی صحت بحال ہوتی جا رہی تھی، ان کے درمیان "فرار" کے امکانات پر غور و خوض بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ویسے تو اس بارے میں باتیں تو بہت سے لوگ بناتے ہی رہتے تھے لیکن ان میں ان لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جو پوری سنجیدگی سے کسی منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار تھے۔

وارڈ کے اس گوشے میں جس میں قیدی تھے، ایک کمانڈو آفیسر نے ایک "فرار کمیٹی" تشکیل دی جس میں صرف چار افراد تھے۔ ایک وہ خود، ایک دوسرا کمانڈر، ایک نیوزی لینڈ کا پرجوش باشندہ اور چوتھا فیران۔

اول الذکر کمانڈو آفیسر (قیدی) کا نام رابن تھا۔ وہ ملکہ

urdunovels.com

کے خاص باڈی گارڈ دستے میں شامل تھا۔ دوسرا کمانڈر میکسول نامی تھا جبکہ نیوزی لینڈ کے باشندے کا نام سن کلیئر تھا۔ رابن اور میکسول کے زخم معمولی نوعیت کے تھے جو اس ٹرک کے اچانک ہی الٹنے سے لگے تھے جس میں انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ سن کلیئر کے چہرے پر گولی لگی تھی اور اسے کھانا کھانے میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت فیرن کی تھی۔ اس کی ران میں کافی چوڑا اور بہت گہرا زخم تھا۔ جرمن سرجن نے آپریشن کرکے بم کا وہ ٹکڑا نکال دیا تھا جو اس کی ران میں پیوست ہوگیا تھا۔

بہرکیف...... اب فیرن تیزی سے روبہ صحت تھا۔ یوں قیدیوں کے زیادہ تر منصوبے محض خیالی اور ناقابل عمل ہوتے تھے۔ یہ سب قالیروں کے ساحل سے ایک بحری طیارہ چرانے کے امکانات پر بحث کرتے رہتے تھے مگر انہیں خوشی تھی کہ انہوں نے اس خیال کو بروئے کار لانے کی حماقت نہیں کی۔ ویسے ان کی باہمی ملاقاتوں میں زیادہ تر جس بات پر توجہ مرکوز رکھی جاتی تھی، وہ یہی تھی کہ یہ لوگ اسپتال کے سنتریوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں اور قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونے کے امکانات کا بغور جائزہ لیں۔ اس بات پر تقریباً ان سب کا ہی اتفاق تھا کہ یہ جسمانی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ پیدل مارچ کرکے ترکی پہنچنے کی کوشش کریں اور یہ کہ یونان سے ان کے کامیاب فرار کی اگر کوئی صورت ممکن ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ سمندری راستہ اختیار کریں۔

افواہیں سننے میں آئی تھیں کہ ایتھنز میں کوئی خفیہ دوست تنظیم ہے جو بھاگنے والے قیدیوں کی ہر ممکن مدد کرتی ہے مگر اس وقت انہیں کوئی ایسا قیمتی عمل حاصل نہ تھا کہ بحیثیت مجموعی یونان کی عام آبادی کا برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہوگا۔

رابن نے البتہ وعدہ کیا تھا کہ وہ قیدیوں کے کیمپ سے جہاں وہ بہت جلد منتقل کیا جانے والا تھا، فیرن کو مفید معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ باہمی رابطے کے لیے ان خاکروبوں کو ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا جو روزانہ اسپتال میں صفائی کرنے آتے تھے۔

عام یونانی آبادی کے دوستانہ طرز عمل کی قیمتی معلومات انہیں پہلی بار اس وقت حاصل ہوئیں جب قیدیوں کے کیمپ سے ایک کنسرٹ پارٹی کو اسپتال بھیجنے کی اجازت دی گئی تاکہ وہ موسیقی کا پروگرام پیش کرکے مریضوں کی تفریح اور دل بستگی کا سامان کرے۔ اس پارٹی کا سربراہ ایک میجر رائے تھا اور چونکہ وہ پائپ (فوجی بین) بجاتا تھا اس لیے لوگ اسے میجر پائپ ہی کہتے تھے۔ جب یہ پارٹی کیمپ سے روانہ ہوئی تو میجر پائپ نے قصبے کی سڑکوں پر اپنا ساز بجانا شروع کردیا جسے سن کر لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ میجر پائپ کیمپ سے اسپتال تک بین بجاتا ہوا آیا اور اس کے اس اقدام سے لوگوں میں اتنا جوش و خروش پیدا ہوگیا کہ جرمن سپاہی طاقت کا انتہائی مظاہرہ کرکے ہی اس خطرے کو دبانے میں کامیاب ہوسکے تھے جو ایک متوقع فساد کی صورت میں سامنے نظر آرہا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی فرار کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جس کی پاداش میں اسپتال اور کیمپ دونوں کے قیدیوں کو یکساں طور پر نت نئی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے نیوزی لینڈ کے دو باشندوں نے اسپتال کی لانڈری کے میلے کپڑوں میں چھپ کر بھاگنے کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو چادروں کے ایک بنڈل میں لپیٹ لیا اور جرمن سپاہی انہیں دوسرے میلے کپڑوں کے ساتھ اسپتال کی سیڑھیوں سے لے کر اترے۔ عجیب بات تھی کہ انہوں نے اس اضافی وزن کی طرف بھی کوئی توجہ نہ دی جو کپڑوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ بعد میں ان دونوں نے فیرن وغیرہ کو بتایا کہ وہ تقریباً دو گھنٹے تک دھوپ میں سیڑھیوں پر پڑے پڑے دم گھٹنے کے قریب ہوچکے تھے کہ آخرکار لانڈری کی وین میلے کپڑے لینے آئی اور انہیں اٹھا کر وین میں ڈال دیا گیا۔ یہ ان کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے جس وقت وین سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تھی اس وقت وین پرانی یونانی بیرکوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ چنانچہ انہیں فوراً دیکھ لیا گیا۔ نتیجتاً وہ دھر لیے گئے اور انہیں بری طرح مارنے پیٹنے کے بعد دوبارہ اسپتال بھیج دیا گیا۔

اس سے اگلی کوشش زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ نیوزی لینڈ کا ایک فوجی "جم کریگ" اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ سنتریوں کے درمیان زمین پر رینگتے ہوئے کیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔

اس کے چند روز بعد...... جولائی کے آخر میں دو آسٹریلین ایک نہایت دلچسپ منصوبے کے ذریعے اسپتال سے بھاگ نکلے۔ صورت حال یہ تھی کہ اسپتال کے مریضوں کو جو چلنے پھرنے کے قابل تھے، شام کے چار بجے نصف گھنٹے کے لیے کمپاؤنڈ میں نکلنے کی اجازت تھی۔ یہ کمپاؤنڈ اسپتال کی عمارت اور خاردار تاروں کی چار دیواری کے درمیان واقع تھا۔ آسٹریلین یہ وقت عموماً ایک خاص کھیل میں گزارتے تھے جسے وہ لوگ "ٹواپ" کہتے تھے۔ مزید برآں ایک برطانوی سپاہی جو اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم تھا، بہت اچھا مصور تھا اور سنتریوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے فالتو اوقات میں ان

کی شبیہ بنایا کرتا تھا۔ فرار والے روز اس مصور سپاہی نے اسپتال کے عقبی حصے میں متعین ایک سنتری کو اس کی تصویر بنانے کے بہانے اپنی طرف متوجہ رکھا اور وہ دونوں آسٹریلین اپنا کھیل کھیلتے ہوئے بڑی پھرتی سے تاروں کے نیچے سے رینگ کر نکلے اور باہر جا کر دو گہرے گڑھوں میں چھپ کر بیٹھ رہے۔

انہیں رات کی تاریکی پھیلنے کا انتظار تھا تاکہ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر آگے بڑھ سکیں۔ زمین کی سطح سے تو وہ ان گڑھوں میں چھپے ہوئے نظر نہیں آ سکتے تھے مگر اسپتال کی بالائی منزل سے قیدی وغیرہ انہیں بہ آسانی دیکھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں بڑا اشتیاق ہوتا کہ وہ انہیں آزادی کی طرف لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا دیکھیں لیکن اس طرح ان بیچاروں کے منصوبے کے کھل جانے کا خطرہ تھا لہٰذا وہ بڑی مشکل سے خود کو اس منظرِ آزادی سے لطف اندوز ہونے سے روک سکے۔

فرار کے ان دونوں کامیاب واقعات نے باقی قیدیوں کی دشواریوں میں نمایاں اضافہ کر دیا۔ جواب میں قیدیوں کی جانب سے بھی اصول و قواعد کو توڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو خاصی طویل مدت تک جاری رہا اور اس کے نتیجے میں وہ کچھ مراعات دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

جرمنوں نے انہیں بہلانے پھسلانے کی ایک اور صورت اختیار کرنی چاہی۔ انہوں نے قیدیوں سے کہا کہ اگر وہ اپنے عزیزوں، رشتے داروں کے نام مختصر پیغامات ریکارڈ کرا دیں تو وہ انہیں ریڈیو سے نشر کر دیں گے۔ دراصل یہ بھی پروپیگنڈا کرنے کے لیے دشمن کا ایک حربہ ہی ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ ایک عام قیدی اس کے نفسیاتی اثرات سے واقف نہیں ہوتا۔

لہٰذا...... بہت شدید زخمی قیدی جن کی قوتِ مدافعت تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے کمزور پڑ چکی تھی، ایسے پیغامات ریکارڈ کرانے پر آمادگی کا اظہار کر بیٹھے۔ نہایت شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں یہ چار بھی شامل تھے جو فرار کے منصوبے پر غور کر رہے تھے۔ تاہم خوش قسمتی سے ان کے نسبتاً تندرست اور ہوشیار ساتھیوں نے انہیں اس اقدام کے خراب نتائج و عواقب سے آگاہ کر دیا اور ان کا خیال تھا کہ بعد میں تقریباً سبھی نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

شروع میں اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ اس اسپتال اور کیمپ کا ایک ہی کمانڈر تھا جو چیکوسلواکیہ کا باشندہ تھا۔ اب یہ شخص انتہائی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ اس نے اپنے دو جاسوس رائل آرمی میڈیکل کور کے اردلیوں کے بھیس میں اسپتال بھیجے جن کا کام یہی تھا کہ وہ قیدیوں کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اسے پہنچاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ایک برطانوی باشندے کی طرح انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ اس خامی کو چھپانے کے لیے یہ عذر تراشا گیا کہ وہ دونوں ایک طویل مدت غیر ممالک میں رہے ہیں اس لیے ان کا لب و لہجہ بدل چکا ہے مگر اس بہانے کو جلد ہی پکڑ لیا گیا۔

☆☆☆

انگریز نے عربوں کو ترکوں کے خلاف جنگ پر اکسایا۔ اس طرح مسلمانوں میں قومیت کی بنیاد پر جنگ لڑی گئی اور ترکی کے بہت سے عرب مقبوضات ترکی کے سلطان کے ہاتھ سے چلے گئے۔ بعد میں انگریز نے ترکی پر بھی قبضہ کر لیا اور ترکی کی تقسیم کا فیصلہ کیا گیا لیکن کمال اتاترک نے برطانیہ اور یونان کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

سب سے زیادہ جانی نقصان جرمنی اور روس کو اٹھانا پڑا، جب جرمنی کے 17 لاکھ 73 ہزار 7 سو اور روس کے 17 لاکھ فوجیوں کی ہلاکتیں ہوئیں۔ فرانس کو اپنی متحرک فوج کے 16 فیصد حصے سے محروم ہونا پڑا۔ محققین کے اندازے کے مطابق اس جنگ میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ہلاک ہونے والے غیر فوجی افراد کی تعداد ایک کروڑ تیس لاکھ ہے۔

اتنی بڑی ہلاکتوں کی وجہ سے ”اسپینش فلو“ پھیل گیا جو تاریخ کی سب سے موذی انفلوئنزا کی وبا ہے۔ لاکھوں کروڑوں افراد بے گھر ہوئے یا اپنے گھروں سے بے دخل ہو گئے۔ جائیداد اور صنعتوں کا نقصان بہت خطیر تھا۔ خاص طور پر فرانس اور بیلجیم میں، جہاں لڑائی خاص طور پر شدید تھی۔

11 نومبر 1918ء کو صبح کے گیارہ بجے مغربی محاذ پر جنگ بند ہو گئی۔ اس زمانے کے لوگ اس جنگ کو ”جنگِ عظیم“ کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ یہ بند ہو گئی لیکن اس کے اثرات بین الاقوامی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حلقوں میں آنے والی کئی دہائیوں تک جاری رہے۔

جنگِ عظیم اوّل سے قبل جرمنی بہت طاقتور ملک تھا مگر جنگ کے اختتام تک وہ کمزور ہو چکا تھا اور پھر فرانس، برطانیہ اور روس جیسے ممالک نے امریکی مدد سے اسے مزید کمزور اور کمتر کر دیا تھا۔ یوں وہ 1919ء سے 1930ء تک ایک شکست خوردہ ملک کی طرح چھتار رہا تھا۔

بہرکیف...... ان ساری باتوں کے باوصف شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ یورپ کی مہذب اقوام کے درمیان 1914ء میں جس مہیب جنگ کا آغاز ہوا تھا، اس کے اغراض و مقاصد خالصتاً ”تجارتی“ تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ پچھلی دو صدیوں

میں یورپ کی بعض چالاک اقوام نے اپنے سیاسی جوڑ توڑ اور فطری چالبازیوں سے ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور امریکا کے بعض زرخیز علاقوں میں پہلے تو در خور حاصل کیا۔ اس کے بعد وہاں کی خام پیداوار پر قبضہ کر کے ان میں اپنی مصنوعات کے لیے وسیع پیمانے پر تجارتی منڈیاں قائم کر لی تھیں اور ان منڈیوں کے ذریعے ان علاقوں کی دولت کھینچ کھینچ کر یورپ میں اپنا معاشی بھرم اور سیاسی اقتدار بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ان اقوام کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو یورپ کی دوسری قومیں زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکیں۔ ان میں بے چینی پیدا ہوئی اور بے چینی کے ساتھ ساتھ آپسی رشک و رقابت بڑھنا شروع ہو گئی۔ نئی قوموں کے ابھرنے سے پرانی قوموں کو اپنے مقبوضات کے لیے خطرہ محسوس ہوا۔ اس خطرے کے مقابلے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھیوں کی جتھا بندی شروع کر دی اور اسی جتھا بندی کے سبب وہ جنگ برپا ہوئی جسے ہم پہلی جنگ عظیم کہتے ہیں۔

اب آیئے ہم "جنگ عظیم" کے اصل مقاصد، محاسن، محرکات اور عواقب پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جو بہت دلچسپ اور حیران کن ہیں لیکن عبرت اثر بھی......

1900ء میں جرمنی میں سائنس اور صنعت کا شباب تھا لیکن اس کے قبضے میں کوئی تجارتی منڈی نہیں تھی۔ بحری تجارت کے تمام وسائل پر انگلستان اور فرانس کا تسلط تھا۔ جرمنی نے نہایت تیزی اور سرگرمی سے اپنی بحری قوت بڑھانا شروع کر دی۔

انگلستان اور فرانس دونوں کو جرمنی کی اس تیاری سے خطرہ سا محسوس ہونے لگا۔ ابتداً انگلستان نے یہ کوشش بھی کی کہ جرمنی سے اپنی بحری برتری تسلیم کرا لے اور بعض علاقوں میں اسے بھی تجارتی مراعات بخش دے لیکن جرمنی نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ معاشی حیثیت سے برطانیہ کے زیر اثر نہیں آنا چاہتا تھا۔ فرانس، جرمنی سے اس طرح کی کوئی بات چیت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے کہ تیس برس پہلے اس کی جرمنی سے جنگ ہو چکی تھی اور اس جنگ میں فرانس اپنے دو صوبوں سے جرمنی کے حق میں ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس کو ان دو صوبوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا بڑا قلق تھا اور اس وقت سے برابر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح جرمنی کو نیچا دکھا کر یہ دونوں صوبے پھر اس سے واپس چھین لے کہ جرمنی کی طرف سے اسے اس نئے خطرے سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فرانس اور انگلستان، افریقہ کے شمالی علاقوں میں اپنے لیے "تجارتی" منڈیاں قائم کر رہے تھے۔

انگلستان، مصر میں اپنا اقتدار چاہتا تھا اور فرانس الجیریا اور مراکش کو اپنے تصرف میں لانے پر تلا ہوا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں قومی منافرت کے ساتھ ساتھ سیاسی اختلافات بھی تھے۔ اس لیے افریقہ کے ان علاقوں پر بھی آپس میں جھگڑا ہونے لگا۔ جرمنی نے جو موقعے کی تلاش میں تھا ان دونوں کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر مراکش پر اپنے "تجارتی" حق کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے فرانس اور برطانیہ دونوں چونک پڑے اور انہیں اپنی سلامتی اسی میں نظر آئی کہ اپنے سیاسی اور قومی اختلافات کو ختم کر کے فوراً متحد ہو جائیں۔ چنانچہ انگلستان اور فرانس کے درمیان پوری طرح صلح صفائی ہو گئی اور شمالی افریقہ کے مالِ غنیمت کی تقسیم اس طرح عمل میں آئی کہ مصر و سوڈان، برطانیہ کے حصے میں آیا اور مراکش، فرانس نے ہتھیا لیا۔ یہ معاہدہ انگلستان اور فرانس کے مابین 1904ء میں ہوا لیکن 1905ء میں قیصر جرمنی، مراکش پہنچا اور وہاں کے سلطان کو ہموار کر کے اس نے پھر مراکش پر اپنے تجارتی حق کا دعویٰ کر دیا۔ جرمنی کے اس دعوے سے یورپ میں ہلچل مچ گئی۔

برطانیہ، فرانس کی مہربانی سے مصر ہضم کر چکا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس معاملے میں فرانس کا ساتھ دے۔ اٹلی بھی جو اس مالِ غنیمت کی تقسیم میں بحر روم کی ایک طاقت ہونے کے باعث فرانس کو دبا کر لیبیا کا ایک حصہ ہتھیا چکا تھا، اس معاملے میں جرمنی کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں یورپ کی کانفرنس جب مراکش کے مسئلے کو حل کرنے بیٹھی تو جرمنی کو شکست ہوئی اور فرانس، برطانیہ اور اٹلی کو اپنے اپنے مقبوضات میں مداخلتِ غیر کا کھٹکا نہ رہا۔

☆☆☆

ایک رات چار آسٹریلین فوجیوں نے ان میں سے ایک جاسوس کی خوب مرمت کر ڈالی اور اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ چار دیواری کے تاروں کو اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا اور ایک دن کمانڈر نے انتہائی غصے اور جھنجلاہٹ میں تمام زخمیوں کی پٹیاں نوچ کر پھینک دیں۔ اسے شک تھا کہ ان قیدیوں میں سے کچھ لوگ سرے سے زخمی ہی نہیں ہیں بلکہ زخمی ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں۔ یہ حرکت قیدیوں کی قوت برداشت کے لیے آخری تازیانہ ثابت ہوئی اور قیدیوں نے اجتماعی حکم عدولی کا فیصلہ کر لیا۔

اسپتال کے چلنے پھرنے والے مریضوں اور کیمپ کے صحت مند قیدیوں نے "رول کال" (اجتماعی حاضری) میں گڑبڑ کرنا شروع کر دی۔ نام پکارے جانے پر بھی وہ اپنا عہدہ، نمبر، کچھ بتاتے اور کبھی کسی دوسرے کی باری پر خود بول پڑتے۔ یہی نہیں بلکہ آگے چل کر وہ اس وقت تک قطار میں کھڑے نہ

ہوتے تھے جب تک سکھوں کی آہنی ٹوک ٹھوکر انہیں مجبور نہ کر دیا جاتا۔

جب یا اسپتال کی چھت کے باہر پہرا دیتے ہوئے سنتریوں پر پڑتے ہوئے لوٹا پھینکے جاتے یا ان کے سروں کا نشانہ لے کر کنکر یا پتھر مارے جاتے۔ جواب میں سنتریوں نے یہ کیا کہ انہیں چھت پر جو بھی نظر آ جاتا، بلا تصدیق و تامل گولی چلا دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سنتریوں کی سائیکلوں کے ٹائروں سے مستقل ہوا نکال دی جاتی تھی اور دیواروں پر ملی سے توہین آمیز نعرے اور فقرے بڑے بڑے نمایاں حروف میں لکھ دیے جاتے تھے۔

ایک طرف ان کی کارروائیاں تھیں تو دوسری طرف کمانڈر کے انتقامی احکامات کا سلسلہ بھی جاری و ساری تھا۔ کسی نے بتایا کہ قیدی کینٹین میں فروخت ہونے والی مٹھائیوں اور ٹافیوں کے ذریعے باہر کے لوگوں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں چنانچہ اس نے حکم دے دیا کہ تمام ٹافیوں اور چاکلیٹ کے پیکٹوں سے ان کے پیکنگ پیپر پھاڑ کر پھینک دیے جائیں اور اس پر فوراً عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ پھر ایک اور حکم جاری ہوا کہ ہر قیدی خواہ کسی بھی حالت میں ہو، کمانڈر کو دیکھتے ہی سیلوٹ کرے گا۔ خلاف ورزی کرنے والے کو تین دن کی قید تنہائی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

لیبرن اگست کے شروع میں اس قابل ہو گیا تھا کہ بیساکھیوں کے سہارے تھوڑا بہت چل سکے۔ ایک صبح وہ کمانڈر کو سلیوٹ نہ کر سکا۔ کمانڈر نے ایک سنتری کو حکم دیا کہ وہ پوری قوت سے اس کی پشت پر لات مارے۔ اس نے بلا تامل تعمیل کی اور لیبرن بے چارے کو ایک ہی لات سے راہداری میں دور تک لڑھکا کر رکھ دیا۔ لیبرن کو اس قدر تاؤ آیا کہ اس نے ایسی حرکت کرنے کا ارادہ کر لیا جس سے کمانڈر کو اس ظالمانہ حکم کا پورا پورا بدلہ دیا جا سکے۔ لیبرن کے باہر میدان میں ایک طرف لکڑی کی کچھ بینچیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں صرف بھوسا بھرا ہوا تھا۔ اس شام لیبرن نے انہیں آگ دکھا دی۔ یہ شاید ایک احمقانہ حرکت تھی کیونکہ اس سے کمانڈر کو مزید غصہ دلانے کے علاوہ کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ البتہ نقصان یہ پہنچا کہ اس نے سزا کے طور پر سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کر دی اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ جو بھی خلاف ورزی کرے گا، اسے نہ صرف تین دن کی قید تنہائی میں رہنا ہوگا بلکہ اسے راشن بھی آدھا دیا جائے گا مگر اس حکم سے سگریٹ نوشی پھر بھی بند نہ ہوئی۔ ہر شخص سگریٹ پیتا تھا اور پکڑا جاتا تو پھر داخل زندان کر دیا جاتا تھا۔ کوٹھڑیوں کی تعداد محدود تھی... بہت جلد تمام کوٹھڑیاں قیدیوں

اسما قادری کے سحر انگیز قلم سے

نیا شاہکار

جانباز

امارت کے نشے میں چور...... کمزوروں پر ظلم اور اپنے زیر دست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے والے ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری......

ظلم کے خلاف سینہ سپر نوجوان کی داستان

اسے اپنی محبت کو حاصل کرنے کا جنون بھی تھا اور مجرموں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔

تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ......

سسپنس کے صفحات پر جلد آ رہا ہے

سے بھر گئیں۔ آخر کار کمانڈر کو اپنا یہ حکم "دانت کچکچاتے" ہوئے واپس لینا پڑا۔

پھر جب قیدیوں کی کنسرٹ پارٹی نے اپنے موسیقی کے پروگراموں میں دو تین قابلِ اعتراض گانے شامل کیے تو کمانڈر نے اس پارٹی کو ہی توڑ دیا اور تفریحی پروگرام بالکل ختم کروا دیے۔ اس دوران میں ایک آسٹریلوی اور ایک نیوزی لینڈ کے باشندے نے انتہائی غیر معمولی نوعیت کے فرار کا مظاہرہ کیا۔ ان دونوں نے ایک ایک بانس اٹھایا۔ دور سے دوڑتے ہوئے آئے اور بانس کی مدد سے خاردار چاردیواری کو آسانی سے پھلانگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ ان پر بے شمار گولیاں برسائی گئیں مگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب رہے۔

اس روز خاکروبوں کے ساتھ رابن، فیرن سے ملنے اسپتال آیا۔ وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے فیرن کو بتایا کہ وہ کیمپ سے باہر کچھ یونانی دوستوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ کسی صراحت میں نہیں گیا لیکن اس نے وعدہ کیا کہ فرار ہونے سے ایک دن پہلے وہ فیرن تک اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کرے گا جس میں یہ تمام تفاصیل شامل ہوں گی۔

اس رات زبردست طوفان آیا۔ ہوا اتنی تیز اور پرشور تھی کہ خود اپنی آواز سنائی دینا مشکل تھی۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ یوں اس طوفانِ بادوباراں میں قیدیوں کے کیمپ سے تیرہ آفیسر اور تیرہ جوان فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں فیرن کے تمام دوست شامل تھے۔ رابن، نکولس، بن کیلر اور میکمر یائپ...... فیرن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس واقعے پر خوش ہو... یا افسردہ۔ وہ خود کو اب بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ فیرن کو ان پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے فیرن کو ضروری معلومات فراہم کر دیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اب وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

کمانڈر کا [illegible] ایک فطری بات تھی۔ اس نے قیدیوں کو جمع کیا اور کہا کہ اب اگر کوئی قیدی بھاگا تو اسے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ یہی نہیں بلکہ سزا پانے کا بھی پورا امکان تھا۔ اس لیے خواہ کچھ ہو جائے، اب وہ کسی کو فرار ہونے کا ذرا بھی موقع نہیں دے گا۔ اس نے قیدیوں کے کیمپ کے گرد گن مشینیں نصب کر دیں۔ خاردار چاردیواری کو مزید اونچا اور مضبوط کر دیا گیا۔ اس طرح پہرے داروں کی تعداد بھی دگنی کر دی گئی۔ اسپتال میں بھی اس اعتبار سے حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے۔ اس سے پہلے مقامی آبادی کے لڑکوں کا دستور تھا کہ وہ سائیکلوں پر خاردار چاردیواری کا چکر لگاتے رہتے تھے اور وہ لوگوں کے لیے سگریٹوں کے پیکٹ اور دوسری اشیا پھینکتے رہتے تھے۔ اس سلسلے کو بھی جبراً روک دیا گیا۔ انہیں سبق دینے کے لیے گولیوں کی باڑ ماری گئی۔ دس لڑکے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ باقی اپنی جان بچا کر بھاگے اور پھر انہوں نے پلٹ کر آنے کی ہمت نہ کی۔

اس کے تقریباً پندرہ روز بعد فیرن نے محسوس کیا کہ وہ اتنا چل پھر سکتا ہے کہ اپنے فرار ہونے کے امکانات کا سنجیدگی سے جائزہ لے سکے۔ یوں بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونا اسپتال سے بھاگنے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ یہ کیمپ ایک کھلے میدان میں تقریباً ایک ہزار مربع گز کے قطعہ اراضی پر واقع تھا۔ خاردار چاردیواری کی اونچائی بھی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ چاردیواری کے ہر کونے میں ایک سنتری موجود رہتا تھا اور اندھیرا ہونے پر ایک مسلح ٹکڑی رات بھر باہر کی جانب گشت کرتی رہتی تھی۔ پھر کیمپ سے یونانی آبادی بھی بہت قریب تھی۔ صرف ایک سڑک درمیان میں پڑتی تھی اور سب سے بڑی اور اہم بات اس اجمال کی یہ تھی کہ ابھی تک اسپتال کے مقابلے میں کیمپ سے زیادہ لوگوں نے فرار کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہے تھے۔ چنانچہ فیرن نے فیصلہ کیا کہ اسے بھی قیدیوں کے کیمپ میں منتقل کیے جانے کے سلسلے میں اقدامات کرنے چاہئیں۔ فیرن کی ران کا گہرا زخم مندمل ہونے کے لیے ابھی کافی وقت درکار تھا پھر بھی اس نے اپنے برطانوی ڈاکٹر کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے کیمپ بھیجنے کی ہدایت کرے۔ کچھ ایسی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں کہ شاید سب کو جرمنی یا اٹلی بھیج دیا جائے اس لیے یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ فیرن نے جو کرنا تھا، وہ جلد کرتا تھا لیکن اس کے زخم کا حال یہ تھا کہ جب آخرکار اسے کیمپ منتقل کرنے کے احکامات آ گئے اور وہ پیدل مارچ کرتا ہوا اسپتال سے کیمپ تک پہنچا تو تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ دو دن تک تو وہ چلنے پھرنے کے بالکل ہی قابل نہ ہو سکا تھا۔

کیمپ میں داخل ہو کر اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ قیدیوں کے آخری بڑے فرار کے بعد سے جرمنوں نے حفاظتی انتظامات بہت سخت کر دیے تھے۔ اتنے سخت کہ فیرن کو بھاگنے کا کوئی راستہ، کوئی طریقہ سجھائی نہیں دیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کیمپ اور یونانی آبادی کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ سڑک کے دوسری جانب یونانیوں کے مکانات قطار در قطار بنے ہوئے تھے اور ان مکانات میں سے ایک کی چھت پر ایک حسین یونانی لڑکی اپنی دلکش، سریلی آواز میں روزانہ خوبصورت گیت گایا کرتی تھی۔ روزانہ شام کو

ایک مقررہ وقت پر اس کی سریلی آواز قیدیوں کے کانوں میں رس گھولا کرتی۔ اتفاق ہی تھی، ان میں سے کچھ لوگوں نے اس مکان کی کھڑکی سے ایک بھاگے ہوئے فوجی کو جھانکتے دیکھا تھا۔ اگر یہ سب جرمن خفیہ پولیس ''گستاپو'' کی کوئی چال نہیں تھا تو وہ مکان اور اس کے رہنے والے یقیناً قیدیوں کے دوست ہی معلوم ہوتے تھے۔

فیرن کو کیمپ میں آئے ہوئے ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ ایک اسکاٹ ڈاکٹر نے زخم پر پٹی باندھتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی کہ شام کو چہل قدمی کے وقفے میں اس سے جھونپڑی کے باہر ملے۔ پھر شام کو وہ اس سے ملا تو اس نے چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے فیرن کو میکسول کا پیغام دیا۔ اس نے بتایا کہ فیرن باورچی خانے میں متعین ایک نیوزی لینڈ کے کارپول سے رابطہ کرے۔

فیرن اگلی صبح اس کارپول کے پاس گیا۔ پہلے تو اس نے سختی سے انکار کیا کہ وہ میکسول یا کسی بھی اور دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن جب فیرن اس سے کافی دیر تک اصرار کرتا رہا تو وہ اسے ایک طرف لے گیا اور دبے لہجے میں بولا۔

''اگر تم واقعی فرار ہونا چاہتے ہو تو میں تمہارا یہ پیغام باہر کچھ دوستوں تک پہنچا سکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے راشن کے ٹرک کے ساتھ ہر روز باہر جانے کا موقع ملتا رہتا ہے اور جب ٹرک میں کھانے پینے کی اشیا رکھی جاتی ہیں تو اس دوران میں کوئی بھی پیغام مزدوروں کے ذریعے متعلقہ افراد کو دے سکتا ہوں۔ اب تم اگلے منگل کو مجھ سے آکر ملو۔ میں ان کا جواب لا دوں گا۔''

اگلے منگل کو فیرن اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ کسی طرح کیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے تو یہاں سے پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک تباہ شدہ مکان میں کچھ دوست جمعرات کی رات میرا انتظار کریں گے۔ اس نے مزید بتایا کہ میں جمعرات کی صبح کو اسے حتمی طور پر بتا دوں گا کہ میں اس مکان تک پہنچ سکتا ہوں کہ نہیں۔ یہ ایک بہت دشوار اور کارِ محال تھا اس لیے کہ ہنوز فیرن کی سمجھ میں کوئی ایسا طریقہ نہیں آیا تھا جس سے سنتریوں کی عقابی نظروں کو چکما دے کر وہ کیمپ سے باہر جا سکے۔ اس کی ٹانگ بھی چلنے کے قابل نہ تھی۔ اس حالت میں کسی خاص مقررہ وقت میں نکل بھاگنا تو ماہر سے ماہر مفروروں کے لیے بھی تقریباً ناممکن ہی تھا۔ بہرکیف، جمعرات کی صبح کو اسے با دلِ ناخواستہ اس سے کہنا پڑا کہ وہ آج رات اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

چند روز کیمپ میں گزارنے کے بعد فیرن کو یقین ہو گیا کہ یہاں حفاظتی انتظامات اتنے سخت اور کڑے تھے کہ کم از کم اس جیسا ''لنگڑا'' آدمی تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا کہ اسپتال واپس جا کر قسمت آزمائی کرے۔ وہاں کے سنتری اتنے ہوشیار اور چوکس نہیں رہتے تھے۔ اتفاق سے فیرن کو بخار ہو گیا اور بخار کے عالم میں اس نے اپنے جرمن ڈاکٹر کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کر ڈالی کہ اس کا زخم پھر سے بگڑنے لگا ہے۔ جب بھی وہ اس کی ٹانگ کو ہاتھ لگاتا، فیرن اس بری طرح چیختا اور کراہتا کہ وہ اچھل پڑتا۔ اس میں کوئی شک تو نہ تھا کہ زخم واقعی خراب ہو رہا تھا مگر زخم سے زیادہ اس کی بھرپور اداکاری نے ڈاکٹر کو متاثر کیا کہ اس نے اس ڈاکٹر کے خلاف رپورٹ کر دی جس کی ہدایت پر فیرن کو اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تھا اور اسے بلا تاخیر دوبارہ داخل کرنے کا حکم دے دیا۔

اگر فیرن چاہتا تو چل کر اسپتال جا سکتا تھا مگر ڈاکٹر نے اسے تقریباً زبردستی ایک اسٹریچر پر لٹا دیا جسے جرمن بوبی (سپاہی) اٹھا کر اسپتال لے گئے۔

جب وہ اپنے پرانے وارڈ کے بستر پر پہنچ گیا تو اس نے پورا ایک ہفتہ فرار کے لیے ضروری اشیا فراہم کرنے میں صرف کیا۔ اپنے محفوظ شدہ جرمن مارک کو اس نے پہلے ہی اسپتال کی کینٹین کے تعاون سے مقامی کرنسی میں تبدیل کرالیا تھا۔ فیرن نے مختلف اوقات میں بچائی ہوئی یا باورچی خانے سے چرائی ہوئی کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی جمع کر رکھی تھیں۔ ایک زخمی پادری کے پاس یونان کا چھوٹا سا نقشہ تھا۔ اس کی کاربن کاپیاں ان میں سے بیشتر نے اتار کر محفوظ کرلی تھیں۔ فرار سے قطع نظر فیرن کا سب سے بڑا مسئلہ شہری کپڑوں کا حصول تھا۔ اس نے دو چار پاجاموں کو ایک مرہم کی مدد سے گہرا نیلا رنگ کیا تھا۔ یہ مرہم رگوں اور پٹھوں کے درد کے لیے تھا جو بآسانی اسپتال سے مل جایا کرتا تھا۔

کسی نے فیرن کے ہاتھ ایک سفید قمیص فروخت کر دی تھی اور فیرن نے اپنے اوور کوٹ کے بدلے آسٹریلیا کے بنے ہوئے براؤن بوٹ بھی حاصل کرلیے تھے لیکن یہ جوتے اتنے تنگ رہے تھے کہ انہیں پہنا پانے کے لیے فیرن کو ان پر مٹی رگڑنا پڑی۔ پھر اتفاق سے ایک روز یونانی پلمبر اسپتال میں پانی کا ایک پائپ درست کرنے آیا تو فیرن نے اس سے اس کا ہیٹ خریدنے کی کوشش کی مگر وہ بہت خوف زدہ تھا۔ بار بار یہ کہہ کر انکار کر دیتا تھا کہ جرمن بوبی (سپاہی) اسے شوٹ کر دیں گے۔ اس نے کام کرنے کے دوران ہیٹ اتار کر رکھا تو مجبوراً فیرن نے اسے چرا لیا۔

اپنا یہ تمام زادِ راہ فیرن نے ایک بڑے تکیے کے غلاف میں چھپا کر اپنے پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ فرار کے بارے میں اس نے سوچا تھا کہ راشن کے ٹرک کو ذریعہ بنایا جائے جو روزانہ مین گیٹ سے اسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ اگرچہ قیدی مریضوں کو بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی پھر بھی وہ روزانہ اس تکیے کے غلاف کے ساتھ (جو تمام چیزیں اندر بھرنے کے بعد ایک تکیے کی ہی صورت اختیار کر گیا تھا) اس نے سیڑھیوں پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ ہاتھ میں ایک کمکل کتاب پکڑ لیتا تاکہ سنتری یہ سوچیں کہ وہ وہاں بیٹھا مطالعہ کر رہا ہے جبکہ وہ کتاب کی اوٹ سے اس امر کا جائزہ لیتا رہتا تھا کہ یہاں سے بھاگ کر راشن کے ٹرک میں چھپنے کے امکانات کس حد تک روشن ہو سکتے ہیں۔ آغاز میں تو سنتری اسے وہاں بیٹھنے نہیں دیتے تھے اور ڈانٹ ڈپٹ کر اٹھا دیتے تھے مگر وہ بار بار ٹھیک اسی جگہ پر پہنچ جاتا۔ بالآخر وہ اس صورتِ حال کے عادی ہو گئے اور فیرن کے چہرے کے سپاٹ پن نے انہیں غالباً یہ باور کروا ہی دیا کہ وہ کسی قسم کے ذہنی مرض میں مبتلا ہے۔ فیرن نے سوچا کہ اگر ٹرک میں گھس کر کسی طرح اسے اسٹارٹ کر لے تو یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ اسے لے کر گیٹ سے نکل جانے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اگر بدقسمتی سے ٹرک اسٹارٹ نہ ہو سکا تو پھر ناکامی کے جو بھیانک نتائج برآمد ہوں گے وہ ہر اعتبار سے اس کے لیے سنگین ترین حد تک جان لیوا ثابت ہو سکتے تھے۔

اس دوران میں روزانہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اسپتال کی چھت پر جا کر ڈیڑھ دو گھنٹے تک دھوپ میں لیٹا رہتا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ دھوپ کی گرمی سے اس کے چہرے اور جسم کی رنگت تانبے جیسی ہو جائے تاکہ دیکھنے والے اسے یونان کا باشندہ خیال کریں۔ اگست کے وسط میں ایک روز اس نے اچانک دیکھا کہ گیٹ پر کھڑا سنتری ایک یونانی عورت کو گھور رہا تھا جو گیٹ کے باہر ایک گوشے میں رکھے ہوئے کوڑے کے ڈرم میں غالباً سوکھی روٹی کے ٹکڑے تلاش کر رہی تھی۔ وہ کچھ سوچا سا معلوم ہو رہا تھا۔ فیرن اس سنتری کو بہت دنوں سے جانتا تھا۔ وہ ایک آنکھ سے محروم اور کچھ احمق سا آدمی تھا۔ یہ ایک سنتری سوچ رہا تھا کہ اسے ہاتھ سے ضائع کر دینے کی صورت میں فیرن کبھی خود کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

لہٰذا وہ تیزی سے دوڑ کر اپنے وارڈ میں آ گیا۔ پلنگ کے نیچے سے تکیے کا غلاف نکالا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ مخالف جانب کھڑے ہوئے دوسرے سنتری نے اسے کوئی جمعدار سمجھا ہو گا جو ڈرم میں کوڑا کرکٹ ڈالنے جا رہا ہو۔

☆☆☆

فرانس اور برطانیہ کی صلح صفائی تو ہو چکی تھی، اب جرمنی کے بڑھتے ہوئے عزائم کو دیکھ کر ان دونوں کو آپس میں سیاسی اور فوجی اتحاد کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس ضرورت کا احساس خصوصاً اس لیے اور بڑھ گیا کہ جرمنی نے شمالی افریقہ کے معاملے میں مات کھا کر بلقان اور ایشیا کو چک میں اپنا سیاسی اور معاشی اثر بڑھانے کی تدبیر اختیار کرنا شروع کر دی تھی اور ان تدابیر میں آسٹریا بھی اس کا شریک ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ بوسنیا ہرزیگووینا کو ترکی سے چھین کر وہ اب اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بحیرۂ ازمین اور بحیرۂ ایڈریاٹک میں اسے دخل ہو جائے۔ برطانیہ اور فرانس نے جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد کا جواب یہ دیا کہ روس کو باسفورس اور دردانیال کا لالچ دے کر جن پر مدت سے اس کی نظر تھی، اسے جتھے میں شامل کر لیا۔

اب روس خود بھی بلقان کو صرف اپنے ہی زیرِ اثر رکھنا چاہتا تھا اور جرمنی اور آسٹریا کے بڑھتے ہوئے اثر کے باعث اسے بلقان میں پوری طرح اپنے قدم جما لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے وہ بڑی خوشی سے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ ہو گیا۔ البتہ اٹلی کی پوزیشن بہت عجیب تھی۔ اس نے ایک طرف تو جرمنی سے معاہدہ اتحاد کر رکھا تھا اور دوسری طرف فرانس اور برطانیہ سے بھی اپنے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ جس فریق کا پلہ بھاری دیکھے، اسی کی طرف کو جھک جائے تاکہ کسی صورت میں بھی اسے خسارہ نہ اٹھانا پڑے۔

مدت سے اٹلی کی ایک طرف آسٹریا کے دو صوبوں ”ٹرانسی اور ٹرنیو“ پر اور دوسری طرف فرانس کے شمالی افریقہ والے مقبوضے ”تیونیشیا“ پر نظر تھی۔ اسی لیے اس نے دونوں فریقوں کو گانٹھ رکھا تھا کہ اگر موقع مل جائے تو فرانس کی مدد سے دونوں صوبوں کو ہضم کر لے اور آسٹریا اور جرمنی کا پلہ بھاری دیکھے تو ان کی مدد سے تیونیشیا پر قبضہ جما لے لیکن یورپ میں اٹلی کی فوجی قوت کو چونکہ کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اس لیے ابتدائاً تو آسٹریا اور جرمنی نے اس کو تیونیشیا کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور نہ فرانس اور برطانیہ نے ہی اسے منہ لگایا! مگر اٹلی چونکہ بلقان کی ہمسایہ سلطنتوں میں سے ایک سلطنت تھی اور بحیرۂ ایڈریاٹک اور بحیرۂ روم میں بھی تھوڑا بہت اپنا اثر رکھتی تھی اس لیے اسے پوری طرح نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فریقین نے اس کے مسئلے کو ضرورت اور وقت کے لیے اٹھا رکھا۔

اٹلی کے علاوہ بلقان کی دو چھوٹی ریاستیں بھی اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ رومانیہ ٹرانسلوینیہ کا علاقہ ہنگری سے اور سربیہ کا علاقہ روس سے چھین لینے کی فکر میں تھا اور سربیا، آسٹریا کے سرحدی علاقے بوسنیا اور

ہڑپ کر جانا چاہتا تھا۔ یہ مقامی رقابتیں بھی فریقین کے مقصد کے لیے مفید تھیں۔ انہیں زندہ رکھ کر ان سے بھی وقت پر کام لیا جا سکتا تھا۔

جنگ کا پہلا سال جرمنی کے حق میں ہوا۔ جرمنی نے ایک ساتھ اپنی شمال مشرقی سرحد پر روس کی یورش کو روک لیا اور دوسری طرف نہایت تیزی کے ساتھ بیلجیئم کو روندتے ہوئے فرانس کے اندر اپنی فوجیں پہنچا دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے 1/4 فرانس پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی کی ان زبردست کامیابیوں سے یورپ میں تہلکہ مچ گیا اور برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کی کامیابی کے امکانات مشتبہ ہو گئے۔

جرمنی کو حرکت میں دیکھ کر فرانس کی جان پر بن گئی۔ اس کے لیے اپنے وجود کی حفاظت کی خاطر فوراً میدانِ جنگ میں آنا ضروری ہو گیا اور فرانس کے ساتھ برطانیہ کو بھی جنگ میں کودنا پڑا۔ اس لیے کہ فرانس سے اس کا فوجی معاہدہ بھی تھا۔ وہ جرمنی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی بحری طاقت کو خود اپنے وجود کے لیے بھی خطرہ سمجھتا تھا۔ اس طرح 1914ء کے ختم ہونے سے پہلے یورپ کی پانچ بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے الجھ گئیں اور اس طرح وہ ہولناک جنگ شروع ہوئی جسے تاریخ میں "پہلی جنگِ عظیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لہٰذا پھر سیاسی داؤ پیچ شروع ہوئے اور یورپ کے جو ممالک اس لڑائی سے بچ رہے تھے، ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے فریقین کی دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ بلقان کی ریاستوں میں بلغاریہ کو اس جنگ میں جھونکا گیا اور بحیرۂ روم کے پانیوں میں اٹلی اور ترکی پر ڈورے پڑنے لگے۔ اٹلی ابھی تک حالات کے مطالعے میں مصروف تھا اور غالباً دیکھ رہا تھا کہ کون سا فریق اس کی منہ بولی قیمت ادا کرتا ہے لیکن ترکی پر اس وقت نوجوان پارٹی حکمراں تھی اور اس پارٹی کے جوشیلے لیڈر انور کمال پاشا نے جنگ کے قرائن اور ترکی کی فوجی قوت کا صحیح اندازہ لگائے بغیر نومبر 1914ء میں جرمنی کی حمایت کا اعلان کر دیا اور طرابلس اور بلقان کے معرکوں کی تھکی ہوئی ترکی فوجوں کو اتحادیوں کے خلاف جنگ میں جھونک دیا۔

برطانیہ اور فرانس کی طرف سے فوراً ترکی کا جواب حاضر کیا گیا اور اٹلی کو جو خود اپنی قیمت مقرر کیے بیٹھا تھا، لالچ دے کر اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اٹلی اور برطانیہ کے درمیان یہ خفیہ معاہدہ 26 اپریل 1915ء کو لندن میں ہوا تھا۔

1915ء میں جنگ کی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ مغربی محاذ پر جرمنی کا دباؤ برابر رہا۔ شمال مشرق کی روسی فوجوں کو جرمنوں نے میلوں اپنی سرحد سے پیچھے دھکیل دیا۔ ترکوں نے دردانیال میں انگریزی حملے کا منہ توڑ جواب دیا۔ اطالویوں کے الپس کی وادی کے حملوں کو آسٹریا کی فوجوں نے پسپا کر دیا۔ اسی کے ساتھ بحیرۂ شمالی اور بحیرۂ اٹلانٹک میں جرمنی کی آبدوز کشتیوں نے برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کے تجارتی جہازوں میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ غرض اتحادیوں کے حق میں یہ سال بھی برا رہا۔ انہیں کہیں بھی جرمنوں سے جم کر مقابلہ کرنے کا موقع نہ ملا لیکن یہ ضرور ہوا کہ جرمنوں کی ان پے در پے کامیابیوں سے ان کا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ یہ برابر ایک فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں کرتے رہے۔

مصر پر جو سلطان ترکی کے ماتحت تھا، ترکی کی طرف سے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے بعد ہی برطانیہ نے فوجی قبضہ کر لیا اور یہاں اپنی فوجی چھاؤنی قائم کر کے سلطنت ترکی کے خلاف فوجی اور سیاسی کارروائیوں کی بنیاد ڈال دی۔

عربوں سے 1916ء میں حکومت برطانیہ نے ایک معاہدہ کر لیا تھا جس میں انہوں نے عربوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر وہ ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں اور انگریزی فوجوں کے ساتھ مل کر جزیرہ نما عرب ترکوں سے خالی کرا لیں تو اس علاقے میں آزاد عرب سلطنت قائم کر دی جائے گی۔

عرب بہت دنوں سے اپنی آزاد سلطنت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ برطانیہ کے اس "وعدے" میں انہیں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی اور انہوں نے یک لخت ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس وقت عرب میں دو بااثر سردار تھے۔ ایک عبدالعزیز ابن سعود، دوسرا شریف حسین۔ عبدالعزیز نجد میں اپنا اثر بڑھا رہا تھا اور شریف حسین حجاز میں۔ انگریزوں نے یہ معاہدہ شریف حسین ہی سے کیا تھا اور لاکھوں پاؤنڈز اور برطانوی ہتھیاروں سے اس کی مدد کی تھی۔ چنانچہ شریفی فوجیں شریف حسین کے لڑکے فیصل کی سرکردگی اور برطانوی جاسوس کرنل لارنس کی راہنمائی میں ترکوں کو دباتی ہوئی شام تک پہنچ گئیں اور شام کے پایۂ تخت دمشق کو فتح کر لیا۔

شریف حسین کے ساتھ برطانیہ نے ابن سعود کو بھی پانچ ہزار پاؤنڈز ماہوار وظیفہ دے کر اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس سے برطانیہ کو یہ کام لینا منظور تھا کہ نجد میں ترکوں اور جرمنوں کی چالوں کو کامیاب نہ ہونے دے۔ ابن سعود برطانوی روپے اور انگریز مشیروں کی مدد سے نہ صرف نجدی ترکوں اور جرمنوں کے اثر کو دور کرتا رہا بلکہ نجد اور اطراف کے بہت بڑے علاقے پر قابض اور ایک بڑی طاقت کا مالک بن بیٹھا۔

یوں برطانیہ نے جنگ میں عربوں سے مدد لینے کے لیے عرب آزاد سلطنت کا وعدہ کر لیا تھا لیکن عربوں سے معاہدہ

کرنے سے پہلے وہ اس معاہدے کے متعلق فرانس اور روس سے ایک خفیہ معاہدہ کر چکا تھا جس کی رُو سے برطانیہ اور فرانس نے فلسطین اور شام کے علاقے آپس میں تقسیم کر لیے تھے اور روس کو اناطولیہ کے شمال مشرقی علاقے بخش دیے۔

☆☆☆

فیرن گھوم کر گیٹ کی طرف بڑھا تو اس کا سنتری بدستور مخالف سمت میں اس عورت کی طرف دیکھنے میں مصروف تھا۔ فیرن سیدھا خاردار چاردیواری کی طرف بڑھتا چلا گیا اور جب قریب پہنچا تو زمین پر لیٹ کر تار کے نیچے سے رینگتے ہوئے باہر چلا گیا۔

فیرن اس وقت عجیب ذہنی کیفیات سے دوچار تھا۔ صرف ایک خیال ہی اس کی تمام حسیات پر مسلط تھا کہ کہیں سنتری گھوم کر نہ دیکھ لے اس لیے اسے کچھ احساس نہیں تھا کہ خاردار تار کے نیچے سے نکلتے ہوئے وہ اس سے اُلجھا تھا یا نہیں۔ البتہ جب باہر نکل کر چند قدم چلا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ران کی پٹی کھل کر نیچے گر گئی ہے مگر وہ وقت اس کی فکر کرنے کا نہیں تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک نظر اب بھی سنتری پر لگی ہوئی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے اپنی گردن گھمائی، فیرن لپک کر فوراً ایک گڑھے میں چھپ گیا۔

وہ دیر تک گڑھے میں لیٹا ہانپتا رہا۔ اس کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قدر آسانی کے ساتھ قید سے رہائی پانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد سنتری پھر پلٹ کر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پہلی کوشش میں خاردار تاروں سے تقریباً ڈیڑھ، دو سو گز دور آ چکا تھا۔ اب سنتری کی نظر ہٹی تو وہ پھر اٹھا، گڑھے سے نکلا اور جس حد تک تیز رفتاری سے ممکن تھا، چلتے ہوئے سڑک کے دوسری طرف واقع یونانی گھروں کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی نزدیک ترین منزل ایک جھونپڑی تھی۔

اس کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو اسپتال کی چھت سے کسی نے رومال لہرا کر الوداع کہا۔ جواب میں فیرن نے بھی اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ اب وہ اتنی دور آ چکا تھا کہ اسپتال کی حدود سے دیکھنے والا کوئی شخص اسے نہیں پہچان سکتا تھا لہٰذا اس نے اپنی رفتار کم کر دی اور آرام سے چلنے لگا۔ پہلی جھونپڑی کے نزدیک پہنچ کر وہ اس کی آڑ میں آتے ہوئے ایک تنگ اور سنگی گلی میں گھوم گیا۔ یہاں کچھ عورتیں ایک پھلوں کے ٹھیلے والے سے مول تول کر رہی تھیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ اپنے حلیے پر شرمندگی محسوس کرتا لیکن اس وقت فیرن کا ذہن اپنی آزادی کی مسرت کے علاوہ ہر خیال سے عاری تھا۔ ایک بوڑھی کسان عورت اس کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک جھونپڑی میں داخل ہوا۔

بوڑھی عورت نے اشاروں کی زبان میں فیرن سے پوچھا کہ کہیں جرمنوں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا؟ فیرن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ عورت نے ایک چھوٹی لڑکی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے گلی میں لے آئی۔ وہ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ کچھ دور جا کر ایک لڑکا بھی ساتھ ہو لیا۔

وہ اسے گاؤں کے تقریباً وسط میں ایک چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں لائے جہاں ایک خوبصورت کسان عورت نے جس کا نام ماریا تھا، ان کا استقبال کیا۔ اس نے اس طرح فیرن کی آزادی پر حیرت کا اظہار کیا اور پھر اسے بیرونی کمرے میں بٹھا کر چلی گئی جہاں اس کے علاوہ تقریباً درجن بھر بچے بھی موجود تھے۔

کمرے کا بڑا حصہ ایک ڈبل بیڈ سے گھرا ہوا تھا جس پر ہر عمر کے بچے بڑی خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے، بلکہ فیرن کو تو کمرے میں ہر طرف بچے ہی بچے نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک جانب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ قلب و ذہن ابھی تک آزادی پر مسرت سے جھوم رہے تھے۔ عورت نے نہ صرف کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے بلکہ جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر گئی تھی لیکن فیرن بہرحال تشکیک میں مبتلا رہا۔ وہ ہر آواز پر چونک پڑتا تھا۔ ایک بار کسی ٹرک کے انجن کی گھڑگھڑاتی آواز ابھری اور معاً اس کے سنتے ہوئے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ کہیں ان لوگوں نے اسے جرمنوں کے ہاتھوں فروخت تو نہیں کر دیا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ کچرا اٹھانے والا ٹرک تھا۔

تقریباً گھنٹے بھر بعد ملاقاتیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اس کے لیے طرح طرح کے تحائف لے کر آئے تھے۔ سب سے پہلے آنے والا ماریا کا شوہر تھا۔ وہ نارنگیاں فروخت کرتا تھا اور اسے انگریزی زبان کا صرف ایک ہی فقرہ یاد تھا۔ "سر! نارنگیاں بہت اچھی ہیں۔" مگر ظاہر ہے کہ اس سے گفتگو میں کیا مدد ملنا تھی اس لیے فیرن نے ایک کاغذ پر نقشے اور شکلیں بنا کر انہیں سمجھایا کہ وہ کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ پھر کچھ لوگ آئے جنہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ان لوگوں نے ایک بہت بڑی پلیٹ میں مختلف قسم کے [illegible] اس کے سامنے ڈھیر کر دیے اور اس کی جیبیں سگریٹ کے پیکٹوں سے بھر دیں۔ کچھ لوگ اپنا قومی گیت گاتے ہوئے اس کے اردگرد رقص کرنے لگے پھر ایک بہت خوب صورت لڑکی آئی

جو بدقسمتی سے ایک آنکھ کھو چکی تھی۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ اس کا شوہر البانیہ کی جنگ میں مارا گیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ فیرن اس سے شادی کر لے۔ ماریا نے دیکھ لیا کہ فیرن بری طرح الجھ گیا ہے کیونکہ یہ سب اس کے لیے غیر متوقع اور عجلت میں پیش آ رہا تھا لہٰذا اس نے اپنے شوہر کو سمجھا دیا کہ اس نوعیت کے مسئلے پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔

دوسری طرف فیرن سوچ رہا تھا کہ ابھی وہ جرمن کیمپ سے اس قدر نزدیک ہے کہ خود کو قطعی غیر محفوظ سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کے ذہن میں شادی کر کے یہیں اپنا گھر بسا لینے کا کوئی خیال تک نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اندھیرا ہونے پر وہ کیمپ کے سامنے واقع اس گھر تک پہنچنے کی کوشش کرے گا جس کی چھت پر وہ حسین لڑکی گانا گاتی رہتی تھی۔ یوں فیرن کے اس فیصلے سے ماریا کے شوہر کو بہت افسوس ہوا اور ماریا تو باقاعدہ رو دی مگر فیرن اپنے دوستوں کے پاس پہنچنے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے پر وہ ماریا کے شوہر کے ساتھ اس مکان کی طرف روانہ ہوا۔ وہ دونوں متعدد سڑکوں اور گلیوں سے گزرے۔ ایک بڑی سڑک جس پر بہت سے کیفے اور ریسٹورنٹ واقع تھے، جرمن سپاہیوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتے رہے مگر انہوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آخرکار وہ ایک پتھر سے بنی ہوئی دیوار تک پہنچ گئے۔

دیوار کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا باغ نظر آ رہا تھا۔ وہ دیوار پھلانگ کر باغ میں پہنچے۔ ایک آدمی اپنے ہاتھ میں بڑی سی قینچی لیے درختوں کی شاخیں اور پتے تراشنے میں مصروف تھا۔ فیرن نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کہا کہ وہ ایک برطانوی آفیسر ہے۔ مارے حیرت کے اس کے ہاتھ سے قینچی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی پھر ایک قریبی مکان کی طرف اشارہ کیا۔

بعد میں پتا چلا کہ اس مکان میں فاشسٹ نظریات کے حامل لوگ رہتے تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کی ہمدردیاں جرمنوں کے ساتھ تھیں۔ وہ فیرن کو باغ میں بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد ایک پری جمال لڑکی اندر داخل ہوئی۔ فیرن نے اندازہ لگایا کہ یہی وہ لڑکی تھی جو مکان کی چھت پر گایا کرتی تھی۔ شروع میں وہ لوگ کچھ مشکوک سے معلوم ہوئے لیکن جب اس نے ان سے اپنے دوست میکسول کا ذکر کیا تو وہ ایک دم خوش ہو گئے۔

اس خوب صورت لڑکی نے فیرن کے سر سے پرانا ہیٹ اتار کر ایک نئی ٹوپی دی پھر اس نے ماریا کے شوہر کو سمجھایا کہ اسے لازمی طور پر اپنے دوستوں کے پاس جانا ہے۔ اس کا چہرہ بجھا اداس ہو گیا۔ فیرن کو اسے چھوڑتے ہوئے افسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ یونان کی سرزمین پر اس کا پہلا مددگار تھا اور انتہائی مخلص اور ہمدرد بھی معلوم ہوتا تھا۔ غالباً اس کا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان دنوں یونان کی فضا ایسی تھی کہ انہیں ان میں سے ہر گھر سے اپنے ہمدرد اور بہی خواہ مل سکتے تھے۔ بلاشبہ یونانی دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ مہمان نواز ہیں۔ ان کے بارے میں فیرن کے جذبات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ جنگ نے انہیں جس پریشان کن صورتِ حال سے دوچار کر رکھا تھا، اسے دور کرنے کے لیے فیرن ان کی خاطر جان بھی دے سکتا تھا۔

بہرکیف، اس خطرناک مقام سے نکل کر وہ ایک بازار میں پہنچے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور چاروں طرف خوب روشنی ہو رہی تھی۔ اس جگہ لڑکی کا بھائی کسی اور یونانی کے ساتھ ان سے آملا۔ اس یونانی نے فیرن کو بتایا کہ اس کا نام سارٹرس ہے۔ اس نے فیرن سے بہت سے سوالات کیے۔ پوچھا کہ وہ انگلینڈ میں کہاں رہتا تھا؟ فیرن نے بلاتامل برمنگھم بتا دیا جو سراسر غلط تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے شہر کا نام لیا تو ضروری نہیں کہ سارٹرس اس سے واقف ہو جبکہ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ کسی ایسی جگہ کا نام لے جسے وہ بھی جانتا ہو۔ اس طرح وہ اس پر جلد اعتبار کر لے گا۔ پھر سارٹرس نے پوچھا کہ وہ کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا اور فوج کے کس یونٹ سے تعلق رکھتا تھا؟ اس سوال کا فیرن نے درست جواب دیا۔

آخرکار کئی اور دوسرے سوالات کے بعد اسے اطمینان ہو گیا کہ فیرن واقعی کوئی برطانوی آفیسر ہے اور جرمن خفیہ پولیس ”گسٹاپو“ کا کوئی جاسوس نہیں۔ اس نے فیرن کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

سارٹرس اسے ایک مکان میں لے گیا۔ وہ سیڑھیاں طے کر کے ایک کمرے میں آ گئے۔ اندھیرے سے ایک دم روشنی میں آنے کی وجہ سے فیرن ابھی کھڑا اپنی آنکھیں ہی جھپکا رہا تھا کہ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ اس وقت تک صرف اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ ایک میز کے گرد تین یونانی بیٹھے تھے جن میں سے کوئی بھی اس کا شناسا نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے ان میں سے ایک نے فیرن کو گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ یہ میکسول تھا۔

اس نے اپنا حلیہ قدرے بدل رکھا تھا۔ اس نے اپنے سیاہ بال رنگے ہوئے تھے، کانوں کے دونوں طرف قلمیں خوب بڑھائی تھیں اور ہونٹوں کے اوپر باریک سی مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ اتنا مکمل بھیس تھا کہ وہ بہت غور سے دیکھنے پر ہی اسے

urdunovels.com

پہچان سکتا تھا۔
اپنے دوست سے مل کر فیرن کو بے حد خوشی ہوئی۔ اسے اور دوسرے لوگوں کو کیمپ سے فرار ہوئے ایک مہینا بیت چلا تھا۔ اس دوران اسے بڑے بڑے تجربات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ دونوں رات گئے تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے اور ان سے کچھ دور یونانی میزبان بھی بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بعد میں ان کا تعارف بھی کرایا گیا۔ فیرن کو بتایا گیا کہ یہ جو موٹا آدمی ہے، یہ ایک دندان ساز ہے اور اس کا نام میٹو ہے۔ یہ گھر بھی اسی کا ہے۔ سارٹرس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک بہترین ملاح ہے اور اس نے اپنے کچھ دوستوں کو ساتھ ملا کر ایک گروہ ترتیب دیا ہے جو بھاگے ہوئے جنگی قیدیوں، بالخصوص برطانوی قیدیوں کی مدد کرتا ہے۔
فیرن کو بعد میں معلوم ہوا کہ اس گروہ میں دو افراد بہت نمایاں تھے۔ ایک کا نام والسیا کی تھا جو یونانی بحریہ میں کیپٹن تھا اور دوسرے کا نام پاپا سٹیرس تھا۔ مشہور سگریٹ ساز کمپنی کے مالک میٹو کی بیوی ایک خوبصورت عورت تھی اور وہ فیرن کے خیال میں میکسول سے بری طرح متاثر تھی مگر یہ بات ان کے یونان سے فرار ہونے کے منصوبے کے حق میں نہ تھی۔
وہیں اسے پتا چلا کہ رابن گلے ہیروس کے ایک جوہری کے گھر میں پناہ گزیں ہے اور ٹن گلیئر ساحل سمندر کے قریب ایک مکان میں پوشیدہ ہے۔ معلوم ہوا کہ انہیں عنقریب ایک موٹر بوٹ حاصل ہونے کی پوری امید تھی جس کے ذریعے وہ سب ترکی یا مصر پہنچ سکتے تھے لیکن ابھی فیرن کو آئے ایک ہی دن ہوا تھا کہ وہ ذریعہ ہی ہاتھ سے نکل گیا جس کی وساطت سے بوٹ ملنے کی امید تھی۔ فیرن تقریباً ایک ماہ یونان میں رہا اور اس دوران انہیں کم و بیش پندرہ مرتبہ کسی موٹر بوٹ یا کسی آبدوز کے ذریعے نکل جانے کی امید پیدا ہوئی اور ٹوٹ گئی۔
ان کی ناامیدیوں کا سلسلہ اس قدر طوالت اختیار کرنے لگا کہ انہیں شک ہوا کہ ان کے یونانی دوست بالخصوص دیگر میزبان...... انہیں مصر یا ترکی بھیجنے کے معاملے میں مخلص نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کی خواہش ہے کہ یہ لوگ ان کے ساتھ ہی رہیں اور اس عام بغاوت میں ان کا ساتھ دیں جس کا وہ منصوبہ بنا رہے تھے لیکن اب فیرن یہ محسوس کر رہا تھا کہ ان کے یہ شکوک و شبہات ان کے خلوص کے ساتھ مکمل ناانصافی پر مبنی تھے۔ وہ اپنی جگہ پوری طرح کوشاں تھے مگر حالات ہی ایسے تھے کہ ان کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ قصور کچھ ان کا بھی نہیں تھا۔ جب کوئی اتنی طویل مدت تک دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہو تو اس کا ذہن اور اعصاب متاثر ہو ہی جاتے ہیں۔
بہرکیف...... بات اس رات کی ہو رہی تھی۔ فیرن کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ اس کے بالوں کا رنگ کالا کر دیا گیا۔ یہ کام میٹو کی بیوی نے انجام دیا۔ اس نے کوئی ایسی چیز استعمال کی تھی جو بالوں پر لگتے ہی انہیں کالا کر دیتی تھی۔ بالوں کا رنگ نہ صرف اس کے یونان کے قیام کے دوران باقی رہا بلکہ مصر پہنچنے کے دو ماہ بعد تک بھی قائم رہا تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ بال بڑھنے کی وجہ سے ان کا قدرتی رنگ ظاہر ہوا تو فیرن اپنے کھچڑی بالوں کے ساتھ کافی دنوں تک دوستوں کے مذاق کا نشانہ بنتا رہا تھا۔ اس رنگ سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنے میں اسے چھ ماہ لگ گئے تھے۔
اس رات فیرن اور میکسول بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن رات کو دیر سے سونے کے باوجود میٹو نے انہیں دوسرے دن علی الصباح اٹھا دیا۔ اس نے بتایا کہ جرمن سپاہی پورے ''کوکینا'' میں ایک ایک گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ سپاہیوں کا ایک دستہ اس محلے تک پہنچ گیا تھا لیکن میٹو ان کی آمد سے قطعی ہراساں نہ تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ اگر ہم چاہیں تو بالکنی میں دو کرسیاں ڈال کر بیٹھ جائیں اور جرمن سپاہیوں کی پریشانی کا تماشا دیکھیں۔
لیکن فیرن یہ خبر سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گھر گھر تلاشی کا یہ نیا دور محض اس کے فرار ہونے سے شروع ہوا ہے مگر میکسول نے اسے تسلی دی۔ اطالین سپاہی لوہے کا ہیٹ سر پر اوڑھے چار چار کی قطار بنائے سڑکوں پر گشت کر رہے تھے جبکہ جرمن سپاہی ٹرک سے اتر اتر کر گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔
انہوں نے دیکھا کہ انہوں نے تمام ہوٹلوں اور چائے خانوں سے سارے گاہکوں کو باہر نکال کر بھگا دیا تھا اور ہر اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا تھا جس کے پاس اس کی شناختی علامت نہ تھی۔
جب سپاہی تلاشی لیتے ہوئے میٹو کے گھر کے قریب پہنچے تو اس نے انہیں اندر بلا کر بیڈ روم کی کھڑکی کے قریب سے گزرتا ہوا ڈرینج پائپ دکھایا تاکہ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر وہ اس کے ذریعے اتر کر بھاگ نکلیں اور پھر کمرے کی ایک بڑی الماری کے پیچھے چھپا دیا لیکن فیرن کے اندیشے بیکار ہی ثابت ہوئے۔ میٹو نے نیچے اتر کر جرمن سپاہیوں کو ایسے ایسے خوبصورت جھوٹ سنائے کہ انہوں نے گھر میں قدم رکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور دروازے سے ہی لوٹ گئے۔
کافی دیر کے بعد سارٹرس ان سے ملنے آیا۔ وہ بہت اداس اور چڑچڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک جرمن آفیسر آج صبح چار بجے اس کے بھائی کے گھر پہنچا۔ اس وقت سارٹرس اپنے

[illegible] تیسرے نے اس کے بھائی [illegible] کو گرفتار کر لیا۔ اس کی بیوی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور بیمار پڑ گئی۔ ان حالات سے سارژیں بہت فکرمند بھی تھا اور خود بھی روپوش ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ایڈولف ہٹلر کے نام کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔

ان دنوں ہٹلر اپنے گاؤں برگ ہاف میں اپنی بہن فرائیو رابن اور بھانجی گیلی رابن کے ساتھ رہتا تھا۔ جرمنی کے نئے چانسلر کا انتخاب ہونے والا تھا اور ہٹلر رات دن اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اسے اپنی کامیابی کی پوری امید تھی کیونکہ وہ جرمنی کا سب سے زیادہ طاقتور اور محبوب لیڈر تھا۔ ہٹلر کو کئی کئی ہفتے گھر سے دور رہنا پڑتا تھا۔

یوں ادھر کچھ دنوں سے اس کا قابل اعتماد شوفر بیمار پڑ گیا تھا اور ہٹلر کو دوسرے ڈرائیور کی خدمات حاصل کرنا پڑی تھیں۔ وہ ایک ہفتے کے لیے باہر گیا تھا مگر ایک ضروری کام کی وجہ سے اسے تیسرے دن ہی گاؤں واپس آنا پڑا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ قصداً پہلے واپس آگیا ہو۔

ہٹلر کی اچانک واپسی سے اس کی بہن فرائیو رابن کانپ اٹھی۔ ہٹلر نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہر طرف ایک سرسری نظر ڈالی پھر بہن سے پوچھا۔

"گیلی کہاں ہے؟"

"وہ......وہ......!" فرائیو رابن کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ "گ......گیلی کی طبیعت خراب تھی، وہ سیر کو گئی ہے۔"

"شوفر کہاں ہے؟" ہٹلر نے فرائیو کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

فرائیو اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اسے مزید جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ "شوفر گیلی کو سیر کرانے لے گیا ہے۔"

ہٹلر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ دانتوں میں دب گئے۔ اس نے بہن سے کچھ نہ کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکل گیا۔ ہٹلر کی گاڑی گاؤں کے قریب واحد سیرگاہ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ وہی سیرگاہ تھی جہاں ہٹلر اپنے فرصت کے لمحات اپنی سگی بھانجی گیلی رابن کے ساتھ گزارتا تھا۔ ہٹلر نے طاقت کے زور پر بھانجی سے عشق کرنے کا حق زبردستی حاصل کر لیا تھا اور معصوم گیلی رابن جو عمر میں ہٹلر سے انیس سال چھوٹی تھی، اس کے پنجوں میں گرفتار تھی۔

ہٹلر نے گاڑی سیرگاہ سے تھوڑی دور پہلے ہی روک لی اور پیدل چلتا ہوا سیرگاہ میں داخل ہو گیا۔ گیلی اور شوفر تمام عالم سے بے خبر پیار و محبت کی گفتگو میں مصروف تھے۔ گیلی کی جوانی شعلہ جوالہ تھی تو شوفر کی وجاہت بھی کسی طرح کم نہ تھی۔ وہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اسے اپنے آقا سے بڑی محبت تھی مگر جب اسے گیلی کی بے پناہ قربت حاصل ہوئی تو وہ سب کچھ بھول گیا۔

اس نے سوچا ہی نہیں کہ وہ اپنے آقا ہی نہیں بلکہ جرمنی کے سب سے زیادہ طاقتور انسان کی محبوبہ سے محبت کر رہا ہے۔ یوں گیلی کو اپنے ماموں ہٹلر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی الڈتی جوانی کو جوان دست و بازو کی ضرورت تھی اور ہٹلر اس وقت عمر کے اس حصے پر کھڑا تھا جہاں الڈتی جوانی کے تقاضے برداشت نہیں کر سکتا۔ شوفر سے محبت کر کے گیلی اپنا حق سمجھتی تھی اور ہٹلر، گیلی کا ماموں ہونے کی وجہ سے گیلی پر شوفر سے زیادہ اپنا حق جتاتا تھا۔

ہٹلر بہت آہستہ آہستہ ان کی پشت پر پہنچا تھا لیکن شوفر اس بے خودی کے عالم میں بھی اپنے آقا کے پیروں کی چاپ کو پہچان گیا۔ اس کی آواز ایک دم رک گئی۔ شاید وہ ہٹلر کے پستول سے نکلنے والی گولی کی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔

آج صبح ہی سے اس کا دل کچھ بے چین تھا۔ یوں تو گیلی کی محبت میں الجھتے ہی اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنی موت کو خود آواز دے رہا ہے مگر محبت اندھی اور بہری ہوتی ہے اور عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ شوفر کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہٹلر اسے شک کی نظروں سے دیکھتا ہے مگر پھر بھی وہ کوئی احتیاط نہ کر سکا اور جب ہٹلر طویل سفر پر روانہ ہونے لگا تو وہ بیماری کا بہانہ کر کے گھر ہی پر ٹھہر گیا۔

یہ گیلی کی والہانہ محبت تھی جس نے شوفر کو اپنے آقا سے بے وفائی پر آمادہ کر دیا تھا۔ گیلی اسے نشیلی آنکھوں سے دیکھتی تو شوفر سب کچھ بھول جاتا اور ایک روز تو گیلی نے اسے ہٹلر کے خلاف اکسایا تو شوفر نے اس سے صاف الفاظ میں وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی ہٹلر کو اپنے راستے سے ہٹا دے گا۔ اس وقت بھی وہ دونوں ہٹلر کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے اور اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے مختلف تدبیروں پر غور کر رہے تھے۔

ہٹلر ان کے اس قدر قریب تھا کہ دونوں کی سانسوں کی آوازیں بھی اسے محسوس ہو رہی تھیں۔ شوفر کے ایک دم خاموش ہو جانے سے گیلی رابن نے چونک کر اسے دیکھا۔ شوفر کا رنگ فق ہو گیا اور آنکھیں بے نور سی۔ گیلی کو بھی کسی شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے شوفر پر سے نگاہیں ہٹا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہٹلر پستول تانے شوفر کے سر پر ملک الموت بنا کھڑا تھا۔ گیلی رابن کا پورا بدن ٹھنڈا اور بے جان ہو گیا۔ اس نے کوشش کی کہ ہٹلر کی طرف منہ پھیر لے

مگر اس کی گردن ایک ہی جگہ جم کر رہ گئی۔

یکایک شوفر کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے موزے میں لگا خنجر کھینچا اور چاہا کہ کھڑے ہو کر ہٹلر پر وار کرے مگر اسی لمحے ہٹلر کا فوجی بوٹ شوفر کے سر پر اس زور سے پڑا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک گہرے کھڈ کے دہانے پر پہنچ گیا۔ پھر ہٹلر کے پستول کی تمام گولیاں شوفر کے جسم میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ شوفر کا جسم ایک دو بار پھڑکا اور پھر وہ لڑھک کر کھڈ میں گر گیا۔

کیلی رابنسن نیم بے ہوشی کے عالم میں کانپ رہی تھی۔ شوفر کو مرتے دیکھ کر اس کی آدھی جان نکل گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب اس کی باری ہے لیکن وہ اپنی موت کا روح فرسا منظر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگی۔

"کیلی رابنسن......!"

کچھ دیر بعد کیلی کے کانوں میں ہٹلر کی آواز آئی تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

ہٹلر کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس نے اسی لہجے میں کہا۔ "کیلی! کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تم میری تنہائیوں کی ساتھی ہو۔ تمہاری جوانی صرف میرے لیے ہے اور یہ جوانی میری تنہائیوں میں سلگ سلگ کر جلتی رہے گی۔ اس آگ کو بجھانے کی جو بھی کوشش کرے گا، اس کا یہی انجام ہوگا۔"

کیلی رابنسن اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ غور سے سن رہی تھی۔ اسے اپنی زندگی کی امید ہوئی تو اس نے کہا۔

"مجھے معاف کر دیجیے ماموں!"

"ماموں نہیں، مجھے صرف ایڈولف کہو کیلی!" ہٹلر نے اسے تنبیہ کی۔

"ایڈولف! مجھے معاف کر دو، اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔" کیلی نے آواز میں لوچ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیلی! اگر تمہیں معاف نہ کیا گیا ہوتا تو تم بھی اس نمک حرام کے ساتھ اس کھڈ میں پڑی ہوتیں۔" ہٹلر نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

کیلی کی نگاہیں ندامت سے جھک گئیں۔

"کیلی! یہ بات ذہن میں رکھنا۔" ہٹلر اب کے نرم لہجے میں بولا۔ "ہٹلر جو چیز پسند کرتا ہے وہ چھین کر حاصل کرتا ہے اور جو چیز پسند ہو وہ صرف اپنا حق ہی سمجھتا ہے۔"

کیلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہٹلر کے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ اس کے پاس کہنے کو تھا ہی کیا۔ یہی کیا کم تھا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد ایک اعلان کے ذریعے برطانیہ نے فلسطین کو وطنِ یہود بنا دینے کی اپنے سر ذمے داری لے لی تھی۔ چنانچہ جب عرب فوجوں نے شام فتح کر لیا تو عقدہ کھلا کہ برطانیہ نے عربوں سے سارے جزیرہ نما عرب کے متعلق جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس انکشاف سے عربوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی لیکن اب غم و غصہ بے موقع تھا۔

پیرس میں صلح کانفرنس شروع ہو چکی تھی۔ شریف حسین کے لڑکے فیصل نے اس کانفرنس میں عرب ممالک کی نمائندگی کی لیکن اس کانفرنس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

بہرکیف، ہٹلر کو تاریخ میں ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت دی جاتی ہے۔

اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ظالم اور جابر حکمران تھا۔ ہٹلر نے جنگیں بھی مسلط کیں اور عشق و گداز کے مراحل سے بھی گزرا۔ جنگِ عظیم کے اس کالے طوفان کو بپا کرنے والا ہٹلر جس میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع اور ملک ملک شہر شہر سیاہ راکھ کا ڈھیر بنے۔ کتنے ہی لوگ بے گھر ہوئے، کتنے ہی ماؤں کے لال، بیویوں کے شوہر، بہنوں کے بھائی بچھڑے، گھر بار چھوٹے، برسوں کی پناہ گاہیں تاراج ہوئیں۔ یہ سب رہتی دنیا تک نہیں بھلایا جا سکتا۔

ہٹلر 1935ء میں برسرِ اقتدار آیا۔

اس کے بعد یورپ کی فضا بڑی تیزی سے تیرہ و تار ہوتی چلی گئی۔ اب تک جرمنی خفیہ تیاریوں میں مصروف تھا۔ اب اس کی فیکٹریاں کھلے عام سامانِ جنگ بنانے لگیں۔ جرمن فضائیہ اور بری افواج کو از سرِ نو وسیع بنیادوں پر منظم کیا گیا۔ ہر صحت مند شہری کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دے دی گئی۔ ہٹلر کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ آسٹریلیا پر ہٹلر کی نظریں پڑنے لگی تھیں۔ 24 مارچ کو سر جان سائمن، لارڈ پریوی سیل، مسٹر ایڈن کے ہمراہ ہٹلر کی دعوت پر برلن گیا۔

فرانسیسی حکومت کے نزدیک سر جان سائمن نے دورے کا انتہائی غلط وقت منتخب کیا تھا۔ فرانس ایک نئی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ وہ جنگی تیاریوں اور فوجوں میں توسیع کا سخت مخالف تھا۔ اس کے سیاست دان رائے عامہ کو اس نہج پر تیار کرتے رہے تھے لیکن اب وہ اپنی فوجیں بڑھانے اور انہیں جدید ترین اسلحے سے لیس کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ فرانسیسی کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان اقدامات کے سخت مخالف تھے اور رائے عامہ کو بھڑکانے میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں ایک نیا خطرہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹلی کا مسولینی جنوب مشرقی یورپ کے

معاملے میں برطانیہ اور فرانس کا ہمنوا تھا لیکن افریقہ میں وہ ابی سینیا (حبشہ) کو ہڑپ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

یورپ کی صورت حال پر غور کرنے کے لیے اسٹریسا میں کانفرنس منعقد ہوئی اور اتفاق رائے سے طے پایا کہ معاہدوں کی خلاف ورزی برداشت نہیں کی جائے گی۔ تاہم خلاف ورزیوں کو روکنے کے لیے برطانیہ عملاً کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح کانفرنس "الشعیر و گفتند و برخاستند" سے آگے نہ بڑھی۔

2 مئی کو فرانس اور روس کے درمیان پنج سالہ معاہدہ طے پایا جس کے تحت دونوں حکومتوں نے عہد کیا کہ جارحانہ حملے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ معاہدے کے بعد فرانسیسی کمیونسٹ اور ان کے ہم سفر دفاعی تیاریوں کے سخت مخالف تھے۔ کمیونسٹ لیڈر تھوروز نے تو صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ نام نہاد جمہوریت کو فاشزم سے بچانے کے نام پر محنت کش طبقوں کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کی کوئی کوشش ہم برداشت نہیں کریں گے۔ لاول چاہتا تھا کہ انہیں قومی دفاع کے پروگرام کی حمایت پر آمادہ کرے اور وہ اس مقصد میں کامیاب رہا۔

15 مئی کو ایک اعلامیہ جاری ہوا جس میں اسٹالن نے فرانسیسی حکومت کے وضع کردہ قومی دفاعی پروگرام کی حمایت کی تھی۔ اعلامیہ شائع ہونا تھا کہ فرانسیسی کمیونسٹ اپنے موقف سے الٹے پاؤں پھر گئے اور "محنت کش طبقوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دینے والے" پروگرام کی پُرجوش حمایت کرنے لگے۔

اکتوبر 1936ء میں اٹلی نے ابی سینیا پر حملہ کر دیا۔ اٹلی دراصل ایک مدت سے اس دور کی پالیسی پر گامزن تھا جب سفید چمڑی والے، زرد، کالے، بھورے یا سرخ آدمیوں کو فتح کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس سال پہلے بھی اس نے ابی سینیا پر حملہ کیا تھا مگر اڈووا کے مقام پر شرمناک شکست اٹھائی تھی۔ اس وقت سے وہ بے تاب تھا کہ اس کا انتقام لینے کی فکر میں تھا۔ مسولینی اٹلی میں برسرِ اقتدار آیا تو اس نے ماضی کے اس چپے داغ کو دھونے اور ابی سینیا کو اپنی نوخیز سلطنت میں شامل کرکے اٹلی کا وقار یورپ کی نظر میں بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مجلس اقوام کے رکن نے دوسرے رکن پر حملہ کر دیا تھا اور یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ جس ادارے سے دنیا کے تمام اچھے لوگوں نے خوش آئند امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں، وہ اپنے ایک طاقتور رکن کی دست بُرد سے دوسرے کمزور ملک کو بچاتا ہے کہ نہیں۔ میرے نزدیک کوئی بھی ایسا اقدام مصلحت اور دانشمندی کے خلاف تھا جس سے اٹلی مخالف کیمپ میں چلا جائے۔ 10 اکتوبر کو مجلس اقوام کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ایک کے مقابلے میں پچاس ووٹوں سے اٹلی کے خلاف اجتماعی اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور مسئلے کا صحیح امن حل تلاش کرنے کے لیے اٹھارہ ارکان کی ایک کمیٹی بنا دی گئی۔

مسولینی نے جواب میں اعلان کیا کہ اٹلی مجلس اقوام کے فیصلے کا مقابلہ نظم و ضبط، کفایت شعاری اور قربانی و ایثار سے کرے گا۔ تاہم وہ اپنے مقصد (فتح ابی سینیا) کی راہ میں حائل ہونے والی کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائے گا اور اس کے خلاف جنگ کرے گا مگر رکاوٹ پیدا ہی کب ہوئی تھی کہ اٹلی کو مجلس اقوام کے خلاف محاذ آرائی کی ضرورت پڑتی۔ مجلس اقوام نے اقدامات کرتے وقت بڑی احتیاط برتی تھی۔ اس نے بہت سی اشیا اٹلی بھیجنے سے روک دی تھیں۔ ان میں بعض جنگ میں کام بھی آتی تھیں لیکن تیل جس کے بغیر اٹلی ایک دن بھی جنگ نہ لڑ سکتا تھا، برابر بھیجا جاتا رہا۔ مجلس اقوام نے المونیم پر بھی پابندی لگا دی لیکن یہ دھات خود اٹلی میں ضرورت سے زیادہ بنتی تھی۔ یہی کیفیت لوہے کی تھی۔ یعنی خود لوہا اٹلی کے لیے بیکار تھا۔ اس پر پابندی لگا دی گئی اور جس لوہے کی اسے ضرورت تھی، وہ بدستور ملتا رہا۔

ابی سینیا بڑی بہادری سے لڑا۔ اٹلی نے زہریلی گیس تک استعمال کی، تب کہیں وہ "ابی سینیا" پر قبضہ کر سکا۔ اس جنگ کے بڑے دور رس نتائج نکلے۔ اسٹریسا کانفرنس کا معاہدہ ختم ہو گیا۔ اٹلی، جرمنی سے جا ملا۔ جرمنی کا ردعمل یہ تھا کہ برطانیہ کمزور ہو چکا ہے اور اس میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی طاقت نہیں جس سے جنگ کی آگ بھڑک اٹھے۔

اس ردعمل نے ہٹلر کے حوصلے اور بلند کر دیے۔ ابی سینیا پر اٹلی کی جارحیت سے پہلے میکڈانلڈ برطانیہ کے وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بالڈون نے لے لی تھی۔ فرانس کے وزیراعظم لاول نے تجویز پیش کی کہ ابی سینیا کو اٹلی اور شہنشاہ حبش میں تقسیم کر دیا جائے۔ بالڈون وزارت نے یہ تجویز منظور کر لی۔ برطانوی رائے عامہ کو اس سے زبردست صدمہ پہنچا۔ بالڈون نے شرمناک فیصلہ واپس لے لیا مگر اس بحران سے اس کی سیاسی زندگی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ وہ ایک رات کے اندر اندر قومی قیادت کی بلندیوں سے گر کر نفرت اور تضحیک کا سامان بن گیا۔

ہٹلر کی قوت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ یکے بعد دیگرے اقدامات کرکے معاہدہ ورسائی کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ جنگی تیاریوں کے ساتھ ساتھ ہٹلر کی کوشش یہ تھی کہ مغربی طاقتیں روس کے ساتھ تعلقات استوار نہ کریں۔ فرانس نے سوویت روس کے ساتھ ایک معاہدے پر مئی کے مہینے میں دستخط کیے تھے لیکن ابھی تک اس کی توثیق نہ ہوئی تھی۔ لاول کو برلن نے

سمجھ گیا کہ اگر اس نے معاہدے کی توثیق کی تو جرمنی اور فرانس کے درمیان مفاہمت کی آخری کرن بھی دم توڑ دے گی۔

☆☆☆

سارٹرس نے کہا کہ ان حالات میں موجودہ جائے پناہ ان کے لیے ناکافی ہے اس لیے انہیں آج ہی ایتھنز چلے جانا چاہیے جہاں اس نے ایک دوسری جگہ ان سب کا انتظام کر دیا ہے۔ یہ دونوں بھائی بہت وفادار اور بہادر تھے مگر انہوں نے حماقت یہ کی تھی کہ گرد و پیش کی پروا کیے بغیر بازاروں اور کیفوں میں دوسرے لوگوں سے ان کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ فیرن کا خیال تھا کہ اس بے احتیاطی کی وجہ سے ہی جرمن افسروں کو ان پر شک ہوا اور وہ ان کے پیچھے پڑ گئے۔

الیاس کو ناقابل بیان اذیتیں پہنچائی گئیں۔ گستاپو نے اپنا ہر حربہ اس پر آزمایا تھا مگر یہ جوان مرد ثابت ہوا اور اس نے اپنی زبان کھولنے سے انکار کر دیا اور وہ یہی کہتا رہا کہ اسے برطانوی فوجیوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ آخرکار جرمنوں کو اسے رہا کرنا پڑا اور یہ ایک مثال صرف الیاس ہی کی نہیں تھی۔ ان کے علم میں بھی ایسے کئی واقعات آئے تھے جہاں یونانی باشندوں نے ہر قسم کے ظلم و ستم کا سامنا کیا تھا مگر کبھی کسی اتحادی فوجی کے بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات فراہم نہ کیں۔ بیچاری ایک عورت کے ناخنوں میں ماچس کی تیلیاں داخل کی گئیں اور اپنے مقصد میں ناکام ہونے پر اسے چھوڑ دیا گیا۔

یہ عورت ان سے ملنے ایتھنز آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی حالت دیکھ کر فیرن اور اس کے ساتھیوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فیرن کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ یونان کے لوگ اتحادیوں کی خاطر جو قربانیاں دے رہے تھے، ان کا چرچا خاطر خواہ طور پر برطانوی اخبارات میں کیوں نہ کیا گیا تھا؟ کیوں ہمارے ہم وطنوں کو نہیں بتایا گیا کہ دنیا میں ان کے کیسے کیسے بہادر دوست موجود ہیں؟

جب ان کی روانگی کا فیصلہ ہو گیا تو شام کے وقت ایک لڑکی جس کا نام "ڈولی" تھا، ان کی راہبری کے لیے بھیجی گئی۔ اس کے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ وہ انہیں بحفاظت ایتھنز میں ان کی نئی پناہ گاہ تک پہنچا دے۔ دیکھنے میں وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن انہیں بتایا گیا کہ اس کی بہادری کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہو چکی تھیں۔ اس کے بارے میں ایک بات مشہور تھی۔ وہ اپنا خالی وقت ربن کے ٹکڑوں میں وی "V" بنانے میں صرف کرتی ہے اور پھر کاٹی ہوئی "وی" پر کوئی لیس دار مادہ لگا کر جرمن افسروں کی کاروں کی سیٹ پر اس طرح رکھ دیتی کہ جرمن افسر ان سیٹوں پر بیٹھتے تو یہ "وی" ان کی پشت پر چسپاں ہو جاتی تھی۔

ان کے لیے دو راہنما بھیجے گئے تھے۔ ایک شخص ایک آدمی کے ساتھ روانہ ہوا اور فیرن، ڈولی کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل آیا۔ بھرے بازاروں اور سیکڑوں جرمن اہلکاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ بس اسٹاپ کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بس آئی اور وہ اس بس میں چڑھ گئے۔ ڈولی نے اپنے اور فیرن کے لیے ٹکٹ خریدے۔ اس وقت تک کوئی خاص بات پیش نہیں آئی تھی لیکن جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے تو فیرن نے دیکھا کہ دور ایک شخص سلیٹی کوٹ پہنے اپنی نیلی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا اور کچھ ایسے انداز سے کہ فیرن کو شک ہونے لگا کہ یہ ضرور گستاپو کا کوئی جاسوس ہے۔ ڈولی نے یہ منظر دیکھا تو کہنی مار کر سرگوشی میں بولی کہ وہ اس کی طرف بلاوجہ نہ دیکھے۔ یوں فیرن کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

پیروس کے اسٹاپ پر وہ بس سے اتر گئے اور اس کا شک تقریباً یقین میں بدلنے لگا جب اس نے دیکھا کہ وہ آدمی بھی ان کے ساتھ ہی بس سے اترا اور ان کے تعاقب میں چلنے لگا۔ وہ دونوں بائیں جانب کی ایک گلی میں مڑے، وہ بھی ان کے ساتھ ہی مڑ گیا۔ درمیان میں تقریباً پچاس گز کا فاصلہ دے کر وہ بدستور ان کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ فیرن نے ڈولی کو اس طرف متوجہ کیا تو اس نے کہا کہ وہ اسی طرح سیدھا آگے بڑھتا چلا جائے اور خود ایک قریبی دکان میں گھس گئی۔

کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ اس سے آن ملی اور بتایا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ فیرن کو اس سے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ اس نے اس آدمی کے ساتھ کیا سلوک کیا کیونکہ فیرن کو معلوم تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس آدمی کے سینے میں بڑی صفائی سے چاقو اتارنے کی بھی جرأت رکھتی تھی۔

یہ لوگ مسٹر کیزرسس جوہری کے مکان پر پہنچے تو فیرن کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ رابن بلاشبہ وہیں تھا۔ ان کی ملاقات ایک ماہ کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے فیرن سے معافی مانگی کہ وہ اس قدر اچانک اور ان کے لیے کوئی پیغام چھوڑے بغیر کیمپ سے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے کیزرسس سے فیرن کا تعارف کرایا۔

کیزرسس ساٹھ برس کی عمر کا ایک بہت ہی نستعلیق قسم کا آدمی تھا۔ اس کی صورت کے ساتھ ہی اس کا لباس بھی بالکل بے عیب نظر آتا تھا۔ جوتے اس قدر چمکتے رہتے تھے کہ کوئی چاہے تو ان میں اپنا عکس دیکھ لے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا تھا کہ وہ کسی انگریز سے بھی زیادہ انگریز ہے کیونکہ وہ جو انگریزی بولتا ہے وہ ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی انگریزی ادبی کتابوں میں نظر آتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں ان کی (اتحادی) فوجوں کے ساتھ ایک مترجم کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور اس پر اسے بڑا ناز تھا۔

برابن کو اس بات سے قطعی اتفاق تھا کہ اب کوکینا کا قصبہ ان کے لیے لمحہ بہ لمحہ خطرناک بنتا جا رہا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ ایتھنز کے لیے روانہ ہونے سے پہلے جس کا پروگرام اگلے دن طے تھا، یہ رات انہوں نے سن کلیئر کے ساتھ گزاری۔ اس نے بتایا کہ وہ خود ابھی کچھ دنوں کے لیے پیروس میں رہے گا تاکہ جب تک ممکن ہو سکے اپنے دوستوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتا رہے۔

فیرن کو بتایا گیا کہ ایتھنز میں ایک سوسائٹی ہے جو سارٹرس اور اس کے ساتھیوں کو ان کا محافظ نہیں دیکھنا چاہتی، انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر وہ لوگ انہیں سارٹرس اور اس کے ساتھیوں کے پاس سے ہٹا کر خود اپنے پاس کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ گروہ بھی ایک ہی تنظیم سے تعلق رکھتا تھا۔ گویا وہ سوسائٹی اور سارٹرس ایک ہی تنظیم کے افراد تھے۔ چنانچہ جب اس گروہ کی لیڈر مادام کاربانی نے اپنی بیٹی الیکٹرا کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ اس مقام سے کہیں اور منتقل ہو جائیں تو فطری طور پر رابن کو شکوک وشبہات نے آن گھیرا۔

فیرن کو اب اس گفتگو کی صراحت تو یاد نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ان تمام باتوں کا تعلق کسی نہ کسی انداز میں یونانی فضائیہ کے ایک آفیسر سے تھا جس کا نام انجلو تھا اور جو اس دوسری سوسائٹی کا ایک نمایاں ''کارپرداز'' تھا۔ اسے بعد میں گستاپو نے گرفتار کر لیا تھا۔

بہرکیف...... ان حالات میں باہمی گفتگو کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ وہ اپنے مددگاروں کو اپنی مرضی پر مجبور نہیں کر سکتے ہیں اور انہیں حالات کے پیش نظر وہی کرنا پڑے گا جو ان کے ہمدرد چاہتے ہیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ یہ لوگ اب ڈولی کے ساتھ ایتھنز روانہ ہو جائیں تو بہتر ہے۔

جس مکان میں سن کلیئر پناہ گزیں تھا وہ کافی دور واقع تھا۔ یہ لوگ پیدل جا رہے تھے۔ نتیجتاً اتنی دور چلنے کا یہ نکلا کہ وہ جب اس مکان تک پہنچے تو فیرن کی ران کے زخم سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مکان تھا اور ساحل سمندر کے قریب واقع تھا۔ اس کے آہنی گیٹ پر رک کر انہوں نے ڈور بیل بجائی۔ جواب میں ایک مضحکہ خیز بوڑھے آدمی جس نے ایشیائی لباس پہن رکھا تھا، گیٹ کھولا۔ معلوم ہوا کہ اس شخص کا نام کانسٹن ٹائن تھا۔ وہ البانیہ کا باشندہ تھا اور کوئلے کی تجارت کرتا تھا۔ یہی شخص ان کا نیا محافظ تھا۔ وہ انہیں گھر کے اندر لے گیا جہاں ان کی ملاقات سن کلیئر سے ہوئی۔

اس نے اپنے بال سرخ رنگ سے رنگ لیے تھے۔ اس نے نیلی قمیص اور سفید پتلون پہن رکھی تھی اور کسی ہالی ووڈ کا اداکار نظر آتا تھا۔ یہاں بھی ایک ''رومانوی مسئلہ'' درپیش تھا۔ کانسٹن ٹائن کی ایک جوان رعنا بیٹی تھی...... ایلی۔ وہ سن کلیئر سے محبت کرنے لگی تھی اور سن کلیئر کو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ایلی ایک دولت مند باپ کی لاڈلی اور بگڑی ہوئی بیٹی تھی۔ ایک طرح سے خوبصورت بھی تھی لیکن اس کا جسم بے ڈول تھا۔

بہرکیف، خون بہہ جانے کی وجہ سے اور راستے کی تھکان سے فیرن بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے اس بہترین کھانے سے بھی لطف اندوز نہ ہو سکا جو کچھ دیر پہلے ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ بوڑھا کانسٹن ٹائن انہیں اپنی بیٹی ایلی کے پاس چھوڑ کر آرام کرنے چلا گیا۔ انہوں نے اپنے طور فرار ہونے سے پہلے ہی آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح کی جذباتی ''آوارگی'' سے گریزاں ہی رہیں گے کیونکہ اس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور خطرہ پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے لیکن اب تجربات سے ثابت ہو رہا تھا کہ یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنا کہ انہوں نے سوچا تھا۔

دوسرے دن ایلی اور اس کی دوست لڑکیوں کے ساتھ گھر میں گزرا۔ ان لڑکیوں میں ایک کیٹلینی بھی تھی جو واقعی بہت حسین تھی۔ وہ بڑی ہوشیاری، ذہانت کے ساتھ بہت ہی محتاط طرز عمل اختیار کرتے ہوئے ان پیچیدگیوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہے جو ان کے فرار کے لیے ان کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھیں۔

سہ پہر کو سارٹرس بھی آ گیا۔ اس کے طرز عمل سے یہ بات صاف ظاہر تھی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ انہیں اس رات ہی وہاں سے آگے روانہ ہو جانا تھا ورنہ ان کا قیام کچھ طویل ہوتا تو لازمی طور پر جھگڑا ہو کر رہتا۔

رات ہوتے ہی ڈولی دو لڑکیوں کے ساتھ آ گئی۔ وہ انہیں کسی نئی پناہ گاہ تک لے جانے آئی تھی۔ یہ لوگ تین جوڑوں کی صورت میں روانہ ہوئے۔ فیرن اور ایک لڑکا آگے چل رہے تھے، ان سے پچاس گز پیچھے دوسرے لوگ تھے۔ باہمی رابطے کے لیے یعنی ایک دوسرے کی موجودگی اور خیریت سے آگاہ رہنے کے لیے وہ یونان کا ایک قومی گیت سیٹی کی دھن پر گا رہے تھے۔ ڈولی بڑی مہارت سے سیٹی بجا رہی تھی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کا ایک سامنے کا دانت ٹوٹا ہوا تھا۔

ساحل سمندر پر یہ لوگ بہت سے ملاحوں کے درمیان سے گزرے۔ ان میں سے دو نے انہیں روک کر وقت پوچھا۔

میں ان کے کیمپ منتقل کیا گیا تو اس نے وہاں بھی بہت سے افراد کو بھاگنے کا موقع دیا۔ آگے چل کر وہ ان کی پارٹی کا ایک بہت ہی قابل اعتماد اور وفادار ساتھی ثابت ہوا۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس نے بہت جلد یونانی زبان سیکھ لی تھی اور بڑی روانی سے بول لیتا تھا۔ دونوں آسٹریلین، سالونیکا کے کیمپ سے دریا میں تیرتے ہوئے فرار ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا راستہ روکنے والے ایک جرمن سپاہی کو ختم بھی کر دیا تھا۔

اس بنگلے میں ان لوگوں سے اتنے لوگ ملنے آنا شروع ہو گئے اور وہ اپنے ہمراہ اتنے تحائف اور کھانا لائے کہ انہیں خطرہ ہو چلا کہ ان کا یہ ٹھکانا سابقہ پناہ گاہوں سے بھی کم محفوظ ثابت نہ ہو۔ مادام کاربانی بہت ہی شریف عورت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ سب کچھ کر کے وہ بھی مطمئن نہیں اور یہی سوچتی ہے کہ انہیں کچھ اور کرنا چاہیے۔ جنگ کے آخری دور میں جب ان کے فوجی پیرا شوٹ کے ذریعے میگارا کے ہوائی اڈے پر اترے تو گسٹاپو نے مادام کو گرفتار کر کے گولی مار دی۔

اس کی موت کے بعد لوگوں کے اذہان میں کچھ شبہات پیدا ہوئے۔ یہ سوال کیا جانے لگا کہ مادام کاربانی واقعی کوئی بہادر عورت تھی۔ فیرن کسی بحث میں تو نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ مادام نے انہی کی خاطر بے شمار خطرات کا سامنا کیا تھا۔

☆☆☆

ادھر فرانس معاہدے کی توثیق کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر جرمنی کی طرف سے اس کا رد عمل یہ ہو کہ وہ معاہدہ لوکارنو کی خلاف ورزی پر تل جائے تو فرانس اور برطانیہ کس حد تک جانے کو تیار ہوں گے۔ آخر طے پایا کہ جرمنی نے معاہدہ لوکارنو کی خلاف ورزی کی تو فرانس اپنی مسلح افواج مجلس اقوام کے سپرد کر دے گا اور برطانیہ معاہدے کے مطابق فرانس کی مدد کرنے کا پابند ہوگا۔

فرانسیسی پارلیمنٹ نے 27 فروری کو سوویت، فرانس معاہدے کی توثیق کر دی۔ اگلے ہی دن فرانسیسی سفیر نے جرمن حکومت سے رابطہ قائم کر کے پوچھا۔

”فرانس اور جرمنی کے درمیان مفاہمت کن بنیادوں پر ہو سکتی ہے؟“

ہٹلر نے جواب میں غور و خوض کرنے کے لیے چند روز کی مہلت مانگی۔ 7 مارچ کو جرمن وزیر خارجہ بیرن فان نیورتھ نے برطانیہ، فرانس، بیلجیم اور اٹلی کے سفیروں کو وزارت خارجہ کے دفتر میں بلایا اور اعلان کیا کہ جرمنی 25 برس کے لیے معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔

انہیں جواب دے دیا گیا۔ ساحل سے گزرتے ہوئے فیرن نے بڑی توجہ سے وہاں لنگر انداز جنگی کشتیوں کا شمار کیا۔ صرف اس خیال سے کہ شاید آگے چل کر انہیں ان کی ضرورت پڑے۔

انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن پر لڑکے نے ان کے لیے ٹکٹ خریدے اور فیرن کو یونانی اخبار پکڑا دیا۔ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے یہ لوگ پلیٹ فارم پر گھومتے رہے پھر جب یہ ٹرین پر سوار ہوئے تو اگرچہ یہ سب ایک ہی ڈبے میں تھے مگر انہوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے سے گریز کیا۔ فیرن اپنا اخبار کھول کر سامنے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اچانک ایک یونانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے ہوئے کوئی سوال کیا۔ ظاہر ہے فیرن اس کا سوال ہی سمجھنے سے قاصر تھا، جواب کیا دیتا مگر اس موقع پر بھی لڑکے نے اس کی مدد کی اور فیرن کے کچھ بولنے سے پہلے جواب دے دیا۔

ٹرین کے آخری اسٹاپ پر یہ اتر گئے۔ راستے میں بہت سے جرمن سپاہیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ ایمولوف اسکوائر پہنچ گئے جہاں ٹرام کا اسٹاپ تھا۔ ٹرام میں یہ لوگ اس طرح بیٹھے جہاں ٹرام کے اندر جلنے والی روشنی بہت ہلکی تھی۔ فیرن کے مقابل بیٹھا ہوا ایک یونانی اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور فیرن اس امکان کا جائزہ لینے لگا کہ اگر اسے ٹرام سے نیچے کودنا پڑا تو دروازہ بہتر رہے گا یا کھڑکی؟

یونانی خود فیرن کو گھورے جا رہا تھا لیکن یہ تکلیف دہ نظر بازی اس وقت ختم ہو گئی جب وہ ایک اسٹاپ پر اترا تو اترتے وقت اس نے عجیب حرکت کی۔ فیرن کی طرف دیکھ کر اس نے آنکھ ماری اور انگوٹھے کو کھڑا کر کے ایک اشارہ سا کرتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ فیرن کو شبہ تھا کہ وہ اس کے بدلے ہوئے بھیس کے باوجود اسے پہچان چکا ہے۔

ٹرام سے اتر کر یہ پھر کچھ دیر تک پیدل چلتے ہوئے ایک بنگلے میں پہنچے جہاں انہیں اگلے دس دن گزارنا تھے۔ اس میں چھ مفرور قیدی پہلے ہی موجود تھے جن میں ایک تو وہی شہرت یافتہ پائپ پھر بانے تھا۔ دو آسٹریلین تھے، ایک پولینڈ کا یہودی تھا جس کا نام جارج فلیر تھا، دو فلسطینی تھے اور دونوں کا نام کرش تھا۔

ان تمام قیدیوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت ڈولی اور اس کی ماں کے سپرد کی گئی تھی۔ وہ مادام کاربانی کی ہدایت کے مطابق انجام دیتی تھیں۔ ان کی رہائی فراہم ہونے کی عجیب عجیب کہانیاں سننے کو ملیں۔ جارج فلیر ایک فلسطینی دستے میں سارجنٹ تھا اور یہودی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو اور خود کو جنگی قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہونے میں مدد دے چکا تھا پھر جب اسے کریٹا

اسی روز سہ پہر کے وقت اس اعلان کے صرف دو گھنٹے بعد ہٹلر نے ایشتاغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ رائن لینڈ پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت جرمن فوجیں رائن لینڈ میں داخل ہو رہی تھیں اور جرمن عوام ہر جگہ جوش و خروش سے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ ہٹلر نے اعلان کیا کہ یہ محض ایک علامتی قبضہ ہے۔ جرمن سفیر متعینہ لندن نے مسٹر ایڈن کو پچیس سالہ معاہدے کی دوبارہ پیشکش کی جسے اس نے بڑے سخت الفاظ میں ٹھکرا دیا۔ فرانس بری طرح تلملا رہا تھا لیکن برطانیہ کے غیر سرکاری حلقوں کا ردعمل بالکل مختلف تھا۔ برطانوی پریس کی رائے یہ تھی کہ آخر جرمن اپنے ہی ملک میں تو جا رہے ہیں۔ ہمیں اگر دس پندرہ سال کے لیے یارک شائر سے بے دخل کر دیا جاتا تو ہمارے احساسات کیا ہوتے؟

لائڈ جارج نے کہا۔ "میری رائے میں ہٹلر نے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے کوئی جرم نہیں کیا کیونکہ اشتعال انگیزی کا سلسلہ جاری تھا۔ ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہیے۔"

ادھر فرانس میں زبردست اختلاف رائے تھا۔ بحیثیت مجموعی سیاست داں جبری بھرتی اور ہٹلر کو الٹی میٹم دینے کے حق میں تھے لیکن جرنیل، جرمن جرنیلوں کی طرح صبر و سکون اور توقف کی حمایت کر رہے تھے۔ ان دنوں ہٹلر اور جرمن جرنیلوں میں شدید اختلاف رائے موجود تھا۔ اگر حکومت فرانس جرأت رندانہ سے کام لے کر ایک سو ڈویژن بری فوج اور فضائیہ میدان میں لے آتی تو جرمن ہائی کمان ہٹلر کو رائن لینڈ سے چلے جانے پر مجبور کر دیتی اور خود اتحادیوں کے لیے بھی اس کی مدد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا مگر وہ اتحادیوں خصوصاً برطانیہ پر بھروسہ کیے بیٹھا رہا اور برطانیہ مذاکرات اور سوچ بچار سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ برطانیہ اور فرانس کے طرز عمل سے صاف عیاں تھا کہ وہ نہ صرف کمزور ہیں بلکہ یکجہتی سے بھی محروم ہیں۔ 28 مئی 1937ء کو بالڈون ریٹائر ہو گیا اور اس کی جگہ نیول چیمبرلین وزیر اعظم بنا۔

یوں ہٹلر نے 1936ء کے وسط تک جتنے اقدامات کیے، وہ سب اس جواری کے سے تھے جو محض ایک موہوم امید میں اپنی ساری متاع داؤ پر لگا دیتا ہے۔ فرانس اور برطانیہ میں اتفاق رائے نہ تھا، امریکا الگ تھلگ رہنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ ہٹلر کو اچھی طرح خبر تھی کہ اتحادی اس کے چیلنج کا جواب نہیں دے سکتے لیکن 1938ء تک وہ محض جواری نہ رہا۔ اب وہ مکمل کانٹے سے لیس ہو چکا تھا۔ یورپ بھر میں کسی ملک کی بحری، بری اور فضائی طاقت اس کے برابر نہ تھی۔ فروری 1938ء میں اس کی فوجیں آسٹریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ آسٹریا کا حصول ہٹلر کی سب سے بڑی آرزو تھی۔

"مین کیمف" (میری جدوجہد) کے پہلے ہی صفحے پر یہ فقرہ لکھا ہوا تھا۔ "جرمن آسٹروی نازیوں نے زیر زمین سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ ہٹلر کا مطالبہ تھا کہ آسٹروی حکومت میں نازی پارٹی کے ارکان بھی شامل کیے جائیں۔ یورپ یا میں آسٹروی ایجنٹس کو باقاعدہ تربیت دی جا رہی تھی۔ ریل گاڑیوں اور سیر و سیاحت کے مراکز میں بم پھٹنے کے واقعات عام ہو چکے تھے۔ جرمن طیارے، آسٹریا کے شہروں پر پمفلٹ اور دستی اشتہار پھینک رہے تھے۔ جولائی 34ء میں ہٹلر نے آسٹریا میں بغاوت کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اطالیہ اپنی فوجیں اس لیے داخل نہ کیں کہ بلجیئم اور فرانس کی سرحدوں پر ابھی وہ پوری طرح تیار نہ تھا، پھر سولینی بھی مزاحمت کر رہا تھا۔ 36ء کے آغاز تک اس نے رائن لینڈ میں قلعہ بندیاں مکمل کر لیں۔ تاہم بظاہر اس کی زبان پر امن و صلح کی باتیں تھیں۔ 21 مئی 1936ء کو اس نے ایشتاغ میں اعلان کیا کہ جرمنی نہ تو آسٹریا کے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑانے کا ارادہ رکھتا ہے اور نہ اسے اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔

11 جولائی 1936ء کو اس نے حکومت آسٹریا کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس میں اقرار کیا کہ وہ نہ تو آسٹریا کے اندرونی معاملات پر کسی صورت اثر انداز ہوگا اور نہ نیشنل سوشلسٹ پارٹی (نازی پارٹی) کی کوئی مدد کرے گا۔

معاہدہ ہوئے پانچ دن ہی گزرے تھے کہ آسٹریا کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو خفیہ ہدایات جاری کر دی گئیں کہ وہ اپنی سرگرمیاں زیادہ تیز اور وسیع کر دے۔ ساتھ ہی جرمن جنرل اسٹاف نے آسٹریا پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔

1937ء کے اواخر تک یورپ کے نقشے میں فیصلہ کن تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ فرانس کے مقابلے میں سیگفرڈ لائن کھڑی کر دی گئی جسے فرانس ان گنت قربانیوں کے بعد ہی توڑ سکتا تھا۔ سولینی ابی سینیا کے مسئلے پر خفا ہو کر جرمنی سے جا ملا تھا۔ ہٹلر کے اقدامات پر مغربی طاقتیں خاموش تھیں۔

جرمنی کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک براہ راست ان پر حملہ نہ ہوگا، وہ بڑے سے بڑا اقدام برداشت کرتی چلی جائیں گی۔ ہٹلر نے آسٹریا کے چانسلر ہرفان شوشنگ کو جرمنی آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے وزیر خارجہ کے ساتھ آیا۔ ہٹلر نے دھمکی دی کہ آسٹریا صرف آدھ گھنٹے کی مار ہے۔

"سرحدوں پر تم نے جو "وفاعی باڑ" رچا رکھا ہے، سب دھرا رہ جائے گا۔ جرمن فوجیں کالے طوفان کی طرح چھا جائیں گی اور پھر ان کے ہاتھوں جو کچھ ہوگا تم اس کا بخوبی

اندازہ کر سکتے ہو۔ انہیں اپنی آتشِ انتقام بجھانے سے کوئی روک نہ سکے گا، خود میں بھی......!"

فان شوشنگ کا جواب تھا۔ "چانسلر! ہم دنیا میں تنہا نہیں۔ دنیا پر حملے کا مطلب ہو گا جنگ......!"

"یہ غلط فہمی دماغ سے نکال دو۔ آسٹریا کی خاطر کوئی بھی ملک انگلی تک نہیں ہلائے گا۔" ہٹلر نے کہا۔

پچھلے پہر تین مطالبات پر مشتمل الٹی میٹم شوشنگ کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔

1۔ آسٹریا کے نازی لیڈر ڈاکٹر سیس انکوارٹ کو کابینہ میں لیا جائے اور وزارتِ تحفظ مملکت اس کے حوالے کی جائے۔

2۔ آسٹریا کی نازی پارٹی کو حکومت کی سرپرستی میں بننے والے وطن محاذ میں شامل کیا جائے۔

3۔ سارے نازی قیدیوں کو فی الفور رہا کیا جائے۔

خیریت چاہتے ہو تو یہ مطالبات بلا جھجک قبول کر لو اور شوشنگ نے تین روز کے اندر اندر سر تسلیم خم کر دیا۔

مگر ابھی ڈراما ختم نہیں ہوا تھا۔

مسولینی نے اندر ہی اندر شوشنگ کے موقف کی حمایت کی۔ شوشنگ نے 13 مارچ کو ملک میں استصواب رائے کرانے کا اعلان کر دیا۔ 11 مارچ کو دوپہر کے وقت ڈاکٹر انکوارٹ، گورنگ کا پیغام لے کر پہنچا۔

"استصواب رائے کا اعلان ایک گھنٹے کے اندر اندر منسوخ کرو ورنہ جرمن فوجیں حرکت میں آ جائیں گی۔"

شوشنگ نے یہ مطالبہ مان لیا۔ ہٹلر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

"اب یوں کام نہیں چلے گا۔ شوشنگ فوراً مستعفی ہو جائے اور انکوارٹ کو دو گھنٹے کے اندر اندر چانسلر نامزد کر دیا جائے۔ بصورت دیگر جرمن فوجیں ہلا بول دیں گی۔"

شوشنگ نے صدر مکلاس سے ملاقات کی اور اپنا استعفا پیش کر دیا۔ وہیں قصر صدارت میں ایک خفیہ پیغام پہنچا کہ وہ کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہے۔ پورا ماحول [illegible] کر گیا۔

"گویا فیصلہ کن گھڑی میں مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔"

اس نے نازی لیڈر کو چانسلر نامزد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جرمن فوجیں حرکت میں آ گئیں۔ آسٹروی فوجوں نے کوئی خاص مزاحمت نہ کی۔ ہٹلر 13 مارچ کو فاتح اور ہیرو کی شان سے ویانا میں داخل ہوا۔ جمہوریہ آسٹریا نے دم توڑ دیا اور آسٹریا جرمنی میں مدغم کر دیا گیا۔

آسٹریا پر جرمنی کے قبضے سے پورا یورپ دہل گیا۔ روس کا ردعمل بڑا شدید تھا۔ 18 مارچ کو اس نے کانفرنس بلانے کا مطالبہ کیا تا کہ خطرے کی صورت میں سوویت فرانس معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کے طور طریقوں پر سوچ بچار کی جا سکے لیکن پیرس اور لندن نے کچھ زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔

فرانسیسی حکومت داخلی مسائل سے دوچار تھی۔ چیمبرلین دل شکستہ بھی تھا اور متذبذب بھی۔ اس نے 24 مارچ 1938ء کو دارالعلوم میں روس کی پیش کردہ تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس قسم کے مجوزہ اقدام سے صورت حال اور بگڑ جائے گی۔"

آسٹریا کے بعد چیکوسلواکیہ کی باری تھی۔ جرمن ہائی کمان ہٹلر کی ہدایت پر جون 1937ء ہی سے اس ملک پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانے میں مصروف تھی۔ 29 فروری 1938ء کو ہٹلر نے پہلی بار چیکوسلواکیہ کا ذکر جرمن پارلیمنٹ میں کیا اور کہا۔

"ایک کروڑ سے زیادہ جرمن ہماری سرحدوں سے متصل دو ملکوں میں رہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حفاظت کریں، انہیں شخصی، سیاسی اور نظریاتی طور پر آزاد ہونے میں مدد دیں۔"

ہٹلر کا مقصد صرف چیکوسلواکیہ کے جرمنوں کا تحفظ ہی نہ تھا بلکہ وہ روسی فضائیہ کو نہایت اہم جنگی اڈے سے محروم اور جرمنی کو عقب سے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ 14 مارچ کو فرانسیسی وزیر اعظم مسٹر بلوم نے چیک سفیر سے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ فرانس نے چیکوسلواکیہ کے ساتھ جو معاہدہ کر رکھا ہے، وہ اس کا بلا تعویق و تامل پورا پورا احترام کرے گا لیکن یہ ساری یقین دہانیاں ڈپلومیسی پر مبنی تھیں۔

16 اپریل 1938ء کو اٹلی اور برطانیہ میں ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ درحقیقت اٹلی کی فتح کے مترادف تھا۔ برطانیہ نے تسلیم کر لیا کہ اٹلی، ابی سینیا اور اسپین میں من مانی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں اٹلی نے وسطی یورپ کے معاملے میں خیر سگالی کا طرز عمل اختیار کرنے کا وعدہ کیا۔

اب چیمبرلین سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ ایسا ہی ایک معاہدہ جرمنی سے کر کے اختلاف کی خلیج پاٹ لی جائے۔ 24 اپریل کو سوڈیٹن لینڈ کی نازی پارٹی کے لیڈر ہنلن نے مطالبہ کر دیا کہ جرمن سرحد سے متصل چیکوسلوواکیہ کے علاقوں کو خود مختاری دی جائے۔ برطانوی اور فرانسیسی مدبر پہلے ہی تلقین کر رہے تھے کہ اس کی حکومت یورپ میں امن قائم رکھنے کی خاطر اعتدال سے کام لے۔ اب پراگ میں دونوں ملکوں کے سفیروں نے چیک وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور امید ظاہر کی کہ اس کی حکومت کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے گریز کرے گی۔

urdunovels.com

مئی 38ء میں چیکوسلواکیہ میں رہنے والے جرمنوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ ابھی دنوں وہاں بلدیاتی انتخابات ہونے والے تھے۔ ہٹلر نے ان پر اثر انداز ہونے کے لیے اعصابی جنگ چھیڑ دی۔

مسلسل افواہیں پھیلنے لگیں کہ جرمن افواج تیزی سے پیش قدمی کر رہی ہیں۔ چیک حکومت نے بھی اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔

28 مئی کو ہٹلر نے اپنے خصوصی مشیروں کا اجلاس طلب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ کسی وقت بھی حملہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ جرمن جرنیل، ہٹلر کی رائے سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں چند سال اور انتظار کرنا چاہیے تاکہ جرمن فوج یورپ کی سب سے طاقتور اور عظیم فوج بن جائے۔

☆☆☆

کرسٹو انہیں بہت پریشان کرتا تھا۔ وہ رات کے وقت گھر سے باہر جانے کی ضد کرتا تھا۔ اگرچہ ان سب نے فیصلہ کیا تھا کہ انہیں غیر ضروری خطرات سے بچنا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں، وہ گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے سے بھی باز نہیں آتا تھا، خواہ کتنا ہی منع کیا جائے۔

تقریباً دس دن کے بعد ایک اجنبی شخص نے انہیں ایک آبدوز کے آنے کی اطلاع دی اور وعدہ کیا کہ وہ رات کے وقت ٹیکسی میں انہیں آبدوز دکھانے لے جائے گا۔ انہیں اس پر شبہ سا رہا حالانکہ وہ ان کا کوئی ہمدرد بھی ہو سکتا تھا۔ دن کے وقت ایک یونانی انٹیلی جنس آفیسر جس کا نام جیکسن تھا، آیا۔ اس نے انہیں کچھ مفید باتیں بتائیں اور ان سے کہا کہ وہ انہیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھیں۔ شاید آگے چل کر انہیں ان کی ضرورت پڑے۔

یوں اب جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ان کے اعصاب اس شدید انتظار سے شکستہ ہوتے جا رہے تھے۔ دوسری جانب پکڑے جانے کا خوف الگ دامن گیر تھا۔ ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سے کھٹکے پر بھاگنے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ ایک دن توقع کے برخلاف غیر متوقع طور پر کوئی کار بنگلے کے آگے آکر رکی اور اس سے دو افراد عقبی کھڑکی سے باغ میں کود گئے، حالانکہ اس کا بنگلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کار کچھ دیر کے بعد آگے بڑھ گئی۔ یہ انتہائی گھبراہٹ پر کھسیا کر رہ گئے۔ یہ تو حال تھا ان کا۔

رابن نے ساحل سے ایک ایسی بوٹ چرانے کا منصوبہ بنا یا مگر فیرن کو اس منصوبے سے قطعی اتفاق نہ تھا۔ اسی طرح جب بھی اس کے ذہن میں کوئی بات آتی تو دوسرا اسے رد کر دیتا۔ بالآخر یہ دیکھ کر کہ وہ کسی ایک پلان پر متفق نہیں ہو رہے ہیں اور دوسری طرف وہ آبدوز بھی کسی طرح نہیں آ رہی ہے جس کی اطلاع انہیں ملی تھی۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جائیں۔ فیرن نے مادام کارہالی سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے اور سن گیفیر کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتظام کر دے جبکہ رابن اور میکسول کسی اور دوست کے گھر چلے گئے مگر ان کے درمیان یہودی جارج فلیر کے ذریعے تھوڑا بہت رابطہ برقرار تھا۔

فیرن اور سن گیفیر کو ایک دوسرے گھر میں بھیج دیا گیا جس کے مالک کا نام آرسنڈ تھا۔ اس کی دو بہنیں ہیلس اور صحیا تھیں۔ اس کی ماں بھی اسی گھر میں رہتی تھی۔ اس کا بھائی الیاس (یاد رہے کہ سارنوس کے بھائی کا نام بھی الیاس تھا) ایک تجارتی جہاز کا کپتان تھا مگر اس کا جہاز ایک سفر کے دوران بمباری کی زد میں آکر غرقاب ہو چکا تھا اور وہ آج کل خالی بیٹھا تھا۔ الیاس کبھی کبھی ان سے ملنے آ جایا کرتا تھا۔ یہ بہت اچھا گھر تھا اور وہ یہاں کافی خوش تھے۔

ہر روز صبح آرسنڈ کی ماں انہیں بیدار کرتی تھی اور چائے کی جگہ دودھ کا گلاس پیش کرتی تھی۔ اس وقت مادام نے انہیں دو جعلی شناختی کارڈ بھی فراہم کر دیے تھے۔ فیرن کے حصے میں جو کارڈ آیا تھا، اس پر کولائیڈ کا نام تحریر تھا۔ پیشے کے کالم میں بینک کلرک تحریر تھا۔ کئی روز تک ایسا ہوتا رہا کہ ہیلس فیرن کو شناختی کارڈ کے مندرجات زبانی طور پر یاد کراتی رہی۔ مثلاً تمہارا نام کیا ہے، تمہارے باپ کا نام کیا ہے، تمہاری ماں کا نام کیا تھا، تم کہاں رہتے ہو، کیا کرتے ہو......؟ وغیرہ۔ یہ سارے سوال وجواب یونانی زبان میں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی یہ یونانی زبان سیکھ رہے تھے اور کچھ ہی دنوں میں اس قابل ہو گئے کہ روزمرہ کی سیدھی سادی بات چیت چھوٹے چھوٹے فقروں میں کر سکیں۔

یہ دن بھر تاش کھیلتے تھے اور رات کے اوقات میں کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے۔ ایک مرتبہ سینما دیکھنے بھی گئے۔ اتفاق سے فیرن کو وہاں جو سیٹ ملی وہ بالکل جرمن آفیسر کے قریب تھی۔ فلم بالکل واہیات تھی اور انہیں قطعی پسند نہ آئی تھی۔ بہرحال، جو دن بھی اس مکان میں گزرے، بہت ہنسی خوشی گزرے اور فیرن اب بھی اکثر انہیں یاد کرتا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی انہیں رومان سے مفر نہ تھا۔ ہیلس، فیرن کی ذات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ زیادہ جذباتی نہیں تھی اور فیرن اس کی طرف سے کچھ زیادہ پریشان بھی نہ تھا۔

ایک رات ان کی رائل ائرفورس نے تاتوئی کے ہوائی اڈے پر بڑا زبردست حملہ کیا اور اسے بمباری کر کے شدید نقصان پہنچایا۔ اپنے گھر کی چھت سے انہوں نے اس حملے کا نظارہ کیا اور ہوائی اڈے کی تباہی پر بہت خوش ہوئے۔ اگرچہ

ان کے یونانی دوست دوسرے دن بہت اداس نظر آئے کیونکہ انہیں خبر ملی تھی کہ اس بمباری میں بہت سے یونانی شہری بھی مارے گئے تھے لیکن ان کی جذباتی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ جرمنوں کو پہنچنے والے نقصانات کو اجتماعی سانحے کے ساتھ بیان کر کے بہت خوش بھی ہو رہے تھے۔ عجیب بات تھی کہ اگرچہ وہ دور جرمن افواج کی کامیابی کا دور تھا مگر یونانیوں کا یہ یقین بھی متزلزل نہ ہوا کہ آخرکار فتح برطانیہ اور اتحادیوں کی ہی ہوگی۔

ستمبر کا وسط تھا کہ کیپٹن الیاس نے پہلی مرتبہ ان سے فرار کے امکانات پر گفتگو کی۔ اس نے بتایا کہ بہت سے یونانی مصر جانا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس ایک موٹر بوٹ خریدنے کے لیے رقم نہیں ہے۔ وہ لوگ انہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ ہیں بشرطیکہ وہ انہیں کچھ فنڈز فراہم کر سکیں۔ جارج فلیر اس دوران اتنی اچھی یونانی زبان بولنے لگا تھا کہ اکثر دن کے وقت بھی بغیر کسی خوف کے بازاروں اور گلیوں میں نکل جاتا تھا۔ دراصل وہ بیرونی دنیا اور ان کے درمیان ایک رابطہ تھا۔

فیرن نے اسے تاکید کی کہ وہ ان تمام یونانی اداروں کے سربراہوں سے رابطہ قائم کرے جو ان کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں اور ان سے فنڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ فیرن نے اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو ان لوگوں سے یہ وعدہ بھی کر سکتا ہے کہ بروقت ہم انہیں فنڈ کی رسید دے دیں اور بعد میں جب ہم اتحادی فوجوں میں واپس پہنچ جائیں تو ان رسیدوں کی رقوم کی ادائیگی کا انتظام کر دیں گے۔

جارج فلیر کی یہ کوشش کامیاب رہی اور بہت سے لوگوں نے مدد کی۔ خاص طور سے یونانی بحریہ کے ایک سابق افسر نے انہیں الگ الگ دو سو پاؤنڈز کے برابر یونانی کرنسی نوٹ بھجوا دیے۔ کچھ لوگ ان سے ملنے بھی آئے اور حتی الامکان اپنے تعاون کا وعدہ بھی کیا۔ ایک مرتبہ فیرن بھیس بدل کر رابن سے ملاقات کرنے بھی گیا جو ایک شاندار فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ اس فلیٹ کی مالکہ نے بھی انہیں کچھ رقم عطا کی۔ فیرن نے رابن اور میکسول سے اپنے پلان کا ذکر کیا مگر وہ دونوں ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ یہ (فیرن اور سن کلیئر) بھی کوئی موٹر بوٹ خرید سکیں گے۔

بہرکیف — انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا لیکن خود نہ جانے کے باوجود رابن نے ان کے منصوبے میں اس حد تک دلچسپی لی کہ دوسرے لوگوں سے بھی رقوم لے کر انہیں بھجواتا رہا اور جس روز وہ اپنے سفر پر روانہ ہوئے، اس نے خاص طور سے مسز گیمز بسس کو یہ دیکھنے اور اطمینان کرنے کے لیے بھیجا کہ جن لوگوں کے ساتھ فیرن وغیرہ جا رہے ہیں، وہ انہیں کسی طرح دھوکا نہ دے سکیں۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو وہ ایک مچھیرے کی جھونپڑی میں منتقل ہو گئے جو پیریوس کے قریب واقع تھی۔ یہاں ان کی ملاقات لیفٹرس نامی ایک شخص سے ہوئی۔ یہ ایک میرین انجینئر تھا اور اسے ان کی موٹر بوٹ کے انجن کی نگہداشت سپرد کی گئی تھی کہ وہ انہیں بحیرۂ روم سے بہ عافیت گزار کر مصر تک پہنچا دے۔ وہ ایک خوبصورت اور باہمت انسان تھا۔ وہ کافی پیتے ہوئے کئی گھنٹے تک اپنے سفر کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ ان کا پرانا دوست الیاس (سارٹرس کا بھائی) موٹر بوٹ کا کیپٹن بنایا گیا تھا۔ کچھ دن بعد یہ اس جھونپڑی نما سے ایک اور مکان میں چلے گئے۔ اس کے مالک کا نام پینٹوریلی تھا اور وہ لیفٹرس کا دوست تھا۔ اس کے مالی حالات ٹھیک نہ تھے۔ وہ اپنی ماں اور ایک نوعمر بھائی کے ساتھ بڑی عسرت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بھائی کا نام اسپاتنگ تھا۔

اس دوران انہیں اپنی بوٹ کے لیے دو اور مسافر مل گئے تھے۔ ان میں ایک آسٹریلین تھا اور فوج میں اس کا عہدہ سارجنٹ کا تھا جبکہ دوسرا شخص بھی سارجنٹ ہی تھا مگر وہ برطانوی تھا اور اس کا نام چارلس تھا۔ آسٹریلین سارجنٹ بہت سخت مزاج اور جفاکش آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسپاتنگ ان سب لوگوں سے بہت مانوس ہو گیا۔ خاص طور سے آسٹریلین سارجنٹ سے جو اسے طرح طرح کے گانے سنایا کرتا تھا۔

تیاریاں آخری مراحل میں تھیں کہ ایک بار پھر ناامیدی کی دھند چھانے لگی۔ جو موٹر بوٹ یہ خرید رہے تھے، اس کے مالک کا نام یانی تھا۔ بالکل آخری لمحات میں اس نے مطالبہ کیا کہ جب تک یہ اسے مزید دو سو پاؤنڈز نہیں دیں گے، وہ کشتی فروخت نہیں کرے گا۔ وہ فیرن سے ملنے آیا اور فیرن نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے سابقہ وعدے سے نہ پھرے اور وہ ان سے مزید رقم کا مطالبہ نہ کرے مگر وہ مصر رہا اور فیرن کا خیال تھا کہ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ وہ شکل ہی سے سنگدل اور دولت کا حریص معلوم ہوتا تھا۔ فیرن کو خطرہ ہوا کہ وہ نہ صرف ان سے ان کا تمام سرمایہ چھین لے گا بلکہ اس کے بعد جرمن افسران یا گسٹاپو کو اطلاع دے کر ان کی گرفتاری کے لیے مقرر کردہ انعام بھی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات کتب: ایچ بی او انگلش سیریل "کومیٹ"، ڈائریکٹر رائٹر ہیرلڈ میسی۔ گریٹ ایسکیپس، ریڈرز ڈائجسٹ (اولڈ ایشوز)۔ بک آف وار ایڈونچرز، جارج بورڈن۔

ترتیب

مسیرت بخاری

حسد کی آگ میں جلنے والے لوگ چاہتے ہیں کہ اس آگ سے دوسروں کو بھی بھسم کردیں... اس کے لیے انہیں چاہے جو بھی کرنا پڑے... کر گزرتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں مبتلا اپنے ساتھی سے نالاں تھا... اپنے تئیں اسے پھنسا بھی دیا تھا... مگر پھر کچھ ایسا ہوا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ایک ذہین نوجوان کا سازشی شخص کو پکڑنے کا قصہ

"وہ بریسلیٹ میرے لیے بہت اہم ہے۔" مسٹر اسٹیفن نے لفظوں پر خوب زور دیتے ہوئے کہا۔

"یس سر! مجھے اس بات کا علم ہے۔" روشن نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

پچیس سالہ روشن اسی گھر میں پلا بڑھا تھا کیونکہ اس کا باپ مسٹر اسٹیفن کے ہاں ملازم تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد روشن نے یہ ملازمت لے لی۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ اسٹیفن اور اسٹیفن کی فیملی کو اچھے طریقے سے جان چکا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس گھر کا سب سے پرانا ملازم تھا۔

"اچھی بات ہے کہ تمہیں علم ہے۔ ان لوگوں کو بھی بتا دو اور بریسلیٹ ڈھونڈو۔" مسٹر اسٹیفن نے خشک لہجے میں کہا۔

"سر! آپ کو یقین ہے کہ وہ گھر ہی میں گم ہوا ہے؟" کک پرشل نے سوال کیا۔

"پکا یقین ہے... اس لیے کہ جس دن وہ گم ہوا ہے،

میں اسے پہن کر کہیں نہیں گیا تھا۔ میں اسے اس کی اصل جگہ پر رکھنا بھول گیا تھا اور یہی میری غلطی تھی۔" مسٹر اسٹیفن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"سر! ہم ہر جگہ تلاش کر چکے ہیں۔ کمرے کا کونا کونا چھان لیا ہے لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔" ہنری نے کہا تو مسٹر اسٹیفن اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کمرے کے وسط میں کھڑے افراد کے قریب آ گئے۔

"بات کمرے کی حد تک نہیں رہی۔ وہ بریسلیٹ کمرے میں تھا اور اب کمرے سے باہر کہیں اور موجود ہے۔" مسٹر اسٹیفن نے "تھا" اور "موجود ہے" پر خاص زور دیا تھا۔ اس بات پر ملازمین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا ایک دوسرے کو بتا رہے ہوں کہ مسٹر اسٹیفن کا شک انہی لوگوں پر ہے۔

"وہ میری مرحومہ ماں نے مجھے دیا تھا، میں نے کبھی بھی اسے اپنے سے دور کرنے یا نظر انداز کرنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ میں اپنی ماں کی نشانی کو سنبھال کر رکھتا آیا ہوں۔ میں سولہ برس کا تھا جب ممی نے مجھے یہ بریسلیٹ بطور گفٹ دیا اور کہا تھا کہ یہ گفٹ ہی نہیں بلکہ میرا پیار بھی ہے، اسے ساتھ رکھنا۔ کیا تمہیں یہ سن کر حیرانی نہیں ہو رہی کہ اپنی عمر کے سولہویں برس سے لے کر اب تک میں نے ممی کے اس تحفے کو سنبھال رکھا تھا۔ میری شادی ہوئی، بچے ہوئے، بچے جوان ہو گئے لیکن میرا اور بریسلیٹ کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ میں اسے پہنتا کم تھا لیکن سیف میں ہمیشہ اس طرح رکھا کہ یہ محفوظ رہے۔ میں وقتاً فوقتاً اسے دیکھتا اور ممی کے پیار کو یاد کرتا رہا ہوں۔ اتنی پرانی اور اہم چیز اب مجھ سے جدا کر دی گئی ہے۔ سنو! مجھے یہ سب برداشت نہیں ہے۔ ہر حال میں یہ بریسلیٹ مجھے واپس چاہیے۔" مسٹر اسٹیفن کی آواز میں برہمی اور دکھ تھا۔ ان کے چہرے پر بے قراری کے اثرات تھے۔ ماں کے تحفے سے دوری ان سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"سر! میرا خیال ہے سب مل کر آپ کے کمرے سمیت پورے گھر میں بریسلیٹ کو ڈھونڈتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے آپ کے ہاتھ سے وہ کہیں گرا ہے، کمرے میں، لان میں یا کسی اور جگہ گرا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اسے کسی ملازم کو چند لمحوں کے لیے پکڑایا ہو اور وہ اسے کہیں ادھر ادھر رکھ کر بھول گیا ہو۔" مورے نے کہا۔ وہ اس طرح بات کر رہا تھا کہ کسی کو چور کہے بغیر بات بھی ہو جائے اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو۔

"مسٹر مورے! وہ کوئی عام چیز نہیں ہے کہ میں یوں گرا دوں یا کسی کو پکڑا کر بھول جاؤں یا ملازم کو بھولنے کی اجازت دوں۔" اسٹیفن نے اسے باقاعدہ گھورا۔ ڈرائیور مورے چپ ہو گیا۔

"اس گھر میں بہت سے افراد رہتے ہیں۔ سرونٹ کوارٹر میں مورے اور اس کی فیملی، ہرشل اور اس کی فیملی، روشن اور ہنری رہتے ہیں۔ میں کسی پر بھی شک کرنے کا حق رکھتا ہوں کیونکہ میری اہم ترین چیز میرے کمرے میں موجود نہیں ہے۔" اسٹیفن نے انتہائی صاف صاف الفاظ میں کہا تو کمرے میں موجود سبھی افراد کے چہروں کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔

"سر! یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... میں یا کوئی بھی چور کیسے ہو سکتا ہے؟" ہنری نے گھبراہٹ زدہ آواز میں کہا۔ وہ اس جگہ نیا تھا، اسے آئے ہوئے ابھی صرف پانچ ماہ ہوئے تھے۔ قصبے سے آیا ہوا وہ انتہائی معصوم، سیدھا سادا انیس سالہ لڑکا تھا۔

"میں نے کسی کو ابھی تک چور نہیں کہا لیکن برائے مہربانی مجھے مجبور مت کرو کہ میں ایسا کہہ دوں۔" اسٹیفن نے صاف گوئی سے کہا۔

"سر! آپ کسی پر شک کریں یا نہ کریں، یہ آپ پر ہے۔ میرا آپ کو مشورہ ہے اگر آپ اس پر عمل کرنا چاہیں تو بتا دوں؟" روشن نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"جلدی بولو، تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔" اسٹیفن باقاعدہ غصے سے بولا۔

"سر! وہ...... آپ سب کے کمروں کی تلاشی لے لیں۔ میرا مطلب ہے کسی ایک پر یا دو پر شک کیا گیا تو شاید یہ مناسب نہ لگے۔ اس لیے سب کے ہی کمروں، الماریوں کی تلاشی لے لی جائے۔ ہو سکتا ہے کسی نے یا کسی کے بچے نے غلطی سے وہاں رکھ دیا ہو۔ مجھے یقین ہے اس طرح آپ کا بریسلیٹ مل جائے گا۔"

روشن نے تجویز دی تو اسٹیفن چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے...... اور یہ کام ابھی شروع کرنا ہوگا۔ شیلے بھی گھر میں ہی ہے۔ ہم دونوں کے سامنے یہ کام ہوگا۔" اسٹیفن نے روشن کی تجویز پر فوراً عمل کرنے کی ٹھانی اور اپنے بیٹے شیلے کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

"سر! سب سے پہلے میرے روم کو دیکھ لیا جائے۔" روشن نے فراخدلانہ پیشکش کی۔ روشن، ہنری، ہرشل، مورے، اسٹیفن اور شیلے اکٹھے سرونٹ کوارٹرز کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

اسٹیفن کا شمار شہر کے امیر افراد اور شرفاء میں ہوتا تھا۔

اپنے اکلوتے بیٹے شیلے اور ملازمین کے ساتھ اس کی زندگی گزر رہی تھی۔ اسٹیفن ایماندار آدمی تھا اور اپنے گرد بھی اسے ایسے ہی لوگ چاہیے تھے، اسی لیے ملازمین رکھتے ہوئے وہ بڑی جانچ پڑتال کرتا۔ کئی سوالات پوچھتا اور پھر انہیں اپنے آفس یا گھر میں جاب پر رکھتا۔ آفس میں تو ادھر ادھر کے لوگ رکھ لیے گئے تھے لیکن گھر میں اس کے انتہائی قریبی اور بھروسا مند افراد ہی تھے۔ روشن سابقہ ملازم کا بیٹا، ڈرائیور مورے اس کے قریبی دوست کے قابل اعتماد ڈرائیور کا بھائی اور کک ہرشل، اسٹیفن کے آبائی قصبے میں رہنے والے اس کے باپ کے دوست کا بیٹا تھا۔ ایک غریب کے بیٹے کو اسٹیفن کے گھر میں فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ صرف ہنری تھا جو نہ صرف نیا ملازم تھا بلکہ اس کے بارے میں اسٹیفن کو کم ہی معلومات تھیں۔ اسے ڈرائیور مورے کی سفارش پر گھر کے کام کاج میں ہرشل کا ہاتھ بٹانے کے لیے ہیلپر کی جاب دی گئی تھی۔

ہنری انیس، بیس سال کا معصوم سا لڑکا تھا۔ اسٹیفن کے گھر میں جاب ملتے ہی اس نے ایمانداری سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نیا ہونے کے باوجود دنوں میں اسٹیفن کا اعتماد جیت چکا تھا۔ ہنری نہ صرف ہرشل کے ساتھ کچن میں مدد کرواتا، بلکہ ساتھ ہی وہ اسٹیفن کے چھوٹے موٹے کام بھی سرانجام دیتا۔ اس کے جاب پر آنے کے چند دن بعد ہی اس کی روشن سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں میں عمروں کا فرق بھی کم تھا اور دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ ایک جیسے گیم میں دلچسپی بھی انہیں قریب لے آئی۔

اسٹیفن اور شیلے کے روم میں فائلز سنبھالنے سے لے کر دیگر کام بھی روشن اور ہنری کو ہی سرانجام دینے پڑتے۔ ہر وقت ساتھ رہنے سے ان کی دوستی بڑھنے لگی۔ مورے سے تو ہنری کا پہلے ہی تعلق تھا، رہا ہرشل...... وہ ہنری کی معصومیت اور کام میں جتے رہنے کو نظر انداز کر کے اس سے خار کھاتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک وجہ تھی، وہ یہ کہ ہرشل کے ہاتھ کا بنا ہوا سوپ اسٹیفن کو بہت پسند تھا اور وہ بارہا مہمانوں تک کے سامنے اس کے بنائے ہوئے سوپ کی تعریف کر چکا تھا۔

ہوا یوں کہ ایک دن ہرشل کو بخار ہو گیا اور اس دن اسٹیفن کا فیورٹ سوپ ہنری نے بنا دیا۔ اسٹیفن نے سوپ پیا تو حیران و خوش ہو گیا کیونکہ اس کا ذائقہ ہرشل کے ہاتھ کے ذائقے سے کہیں بڑھ کر تھا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ تم یہ کام اتنا اچھا کر سکتے ہو۔" سوپ پینے کے دوران اسٹیفن نے کہا۔

"سر! یہ میری ماں کی ریسپی ہے، میں نے انہی سے سیکھا ہے۔" ہنری نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

"اچھا بنا ہے...... بہت اچھا۔ مجھے تو اندیشہ تھا کہ نیا لڑکا کام بگاڑ دے گا۔" اسٹیفن نے کہا۔

"سر! ڈر تو مجھے بھی تھا کہ کہیں آپ کی فیورٹ چیز خراب نہ بن جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے یہ کام اچھے انداز میں سرانجام دے لیا۔" ہنری بولا۔

"کیا تم کچن میں ہرشل کی صرف مدد کرتے ہو یا ککنگ بھی کرتے ہو؟" اسٹیفن نے سوال کیا۔

"میں کچن میں، اور آپ کے اور شیلے کے روم میں ہرشل اور روشن کی مدد کرتا ہوں۔ میرا مطلب ہے ککنگ آج پہلی بار کی ہے۔" ہنری نے جواب دیا۔

"تم اچھا پکا سکتے ہو، یہ کام بھی کر لیا کرو۔" اسٹیفن نے سوپ کا چمچ منہ میں ڈالا۔

"اوکے سر...... ضرور کروں گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ سوپ بھی کبھی کبھار میں بنا دیا کروں؟" ہنری نے اجازت طلب کی۔ وہ انتہائی خوش نظر آ رہا تھا۔

"میں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اب میرا سوپ بنانا تمہاری ڈیوٹی ہے۔" پیالے میں مزید سوپ انڈیلتے ہوئے اسٹیفن نے اسے حکم دیا۔ ہنری خوشی خوشی کچن میں آیا اور برتن دھوتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب یقیناً اس کی جاب مستقل ہو جائے گی۔

چند دن بعد کی بات ہے۔ روشن اور ہنری گپ شپ کر رہے تھے۔ رات کا وقت تھا، دونوں سونے سے پہلے خوب باتیں کرنے کے عادی تھے۔

"ہنری! ایک بات بتاؤں؟" اچانک روشن نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں، بتاؤ۔ یہ تم یکدم آہستہ کیوں بولنے لگے؟" ہنری نے حیرانی سے پوچھا۔

"آہستہ اس لیے کہ کوئی اور نہ سن لے۔ خصوصاً وہ جس کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں۔" روشن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اب بول بھی دو، کس کے بارے میں بات بتانی ہے، کون نہ سن لے؟" ہنری نے ذرا قریب ہو کر کہا۔ وہ متجسس دکھائی دے رہا تھا۔

"ہرشل تم سے خار کھانے لگا ہے۔" روشن نے اطلاع دی۔

"وہ کیوں، تم نے کیسے اندازہ لگایا؟" ہنری حیران رہ گیا کہ ایسا کیوں۔

"ایک دن ہرشل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے اپنے ساتھ کام پر رکھا اور اس نے مجھ سے میرا کام چھین لیا۔ میں نے پوچھا کس نے تمہارا کام چھینا تو کافی غصے سے بولا کہ بیری ریسپی چرا کر اسٹیفن سر کا دل جیت کر ہنری ان کے قریب ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میری تعریف ہوتی تھی، اب یہ ہنری وہ تعریف سمیٹتا ہے۔ کل کا آیا لڑکا میری جگہ لے رہا ہے۔ ہرشل کافی خفا دکھائی دے رہا تھا۔" روشن نے بتایا تو ہنری چپ سا ہو گیا۔

"وہ ریسپی میں نے نہیں چرائی، وہ میری ہی کی ہے۔" ہنری نے صفائی دی۔

"دراصل اسے غصہ اس بات پر ہے کہ تم شاید اس کی جگہ لے کر گھر کے مالک کے قریب ہو رہے ہو۔" روشن بولا۔

"میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ وہ تو سر نے خود مجھے یہ کام سونپا ہے۔ اگر ہرشل اس بات سے ناراض ہے تو میں اس سے معذرت کر لوں گا۔" ہنری نے معصومیت سے کہا۔

"رہنے دو، اسے پتا چل جائے گا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے پھر وہ مجھ پر بگڑے گا۔ تم اپنے کام پر دھیان دو، وہ جو سمجھتا ہے سمجھنے دو۔" روشن نے منع کرتے ہوئے سمجھایا۔

اس کے بعد ہنری نے واضح نوٹ کیا کہ ہرشل اسے بات بے بات کچھ نہ کچھ کہہ کر غصہ نکالتا رہتا ہے۔ وہ چپ چاپ سہنے لگا کیونکہ یہ چاپ کرنا اس کی مجبوری تھی۔ بڑی مشکل سے ملی نوکری کو وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے ہرشل کی برہمی، کینہ بھری نظروں کو برداشت کرنے لگا۔ اسٹیفن سر اس سے خوش تھے۔ روشن سے اس کی گہری دوستی تھی۔ اسے رہائش اور کھانا مل رہا تھا، ہر ماہ وہ اپنی ماں کو رقم بھجوا رہا تھا۔ یہ باتیں اس کے لیے کافی تھیں۔ اس کے نزدیک ہرشل کا رویہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

پرانے ڈرائیور مورے، خاندانی کک ہرشل، قابلِ اعتماد روشن کے ساتھ ساتھ نیا ہنری کم وقت میں ہی اسٹیفن کا اعتماد اور توجہ حاصل کر چکا تھا۔ اسے آئے ہوئے سات ماہ ہوئے تھے کہ اسٹیفن کا قیمتی خاندانی بریسلیٹ گم ہو گیا اور اب کمروں کی تلاشی یعنی سرونٹ روم کی تلاشی کا کام شروع ہونے والا تھا۔ سرونٹ روم کی جانب بڑھتے ہی ہرشل نے ہنری کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"لگتا ہے یہ اس نئے لڑکے کا کام ہے۔" اس نے روشن سے دھیمی آواز میں کہا۔ ہنری کو بات تو نہیں سنائی دی لیکن ہرشل کا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنا، اس نے واضح محسوس کیا۔

"ہنری ایسا نہیں ہے۔" روشن نے صفائی دی لیکن ہنری کو یہ جملہ صاف سنائی دیا تھا۔ اسے فوراً معلوم ہو گیا کہ ہرشل نے کیا کہا گیا ہوگا۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔

"ڈیڈی! ذرا یہ کام جلدی کروا لیں، مجھے لگتا ہے" شیلے نے روشن کے کمرے کے آگے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ سب سے پہلے روشن کا کمرا چیک کیا جانا تھا۔ شیلے کام سے کام رکھنے والا نوجوان تھا۔ گھریلو ملازمین سے بات چیت بس رسمی کرتا، دوسرے لفظوں میں وہ گھر اور گھر کے معاملات سے لیے دیے رہتا تھا۔ اسے اب چند منٹ کھڑا ہونا بھی دشوار لگ رہا تھا۔

"مورے! تم اور ہنری اس کمرے کی تلاشی لو۔" اسٹیفن نے روشن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے حکم دیا۔ چند ہی منٹوں میں روشن کا کمرا اتھل پتھل ہو گیا۔ پورا کمرا چھان لیا گیا لیکن اسٹیفن کا بریسلیٹ نہیں تھا۔

اس روم کے ساتھ ہرشل اور اس کی فیملی رہائش پذیر تھے، اب وہاں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ سوائے ہرشل کے باقی ملازمین یہ کام کر رہے تھے۔ اسٹیفن نے خود بھی الماری کو چھاننے کا کام کیا۔ وہ غصے میں اور بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

"شاید تم لوگوں کو یہ برا لگ رہا ہو لیکن میں کیا کروں میری مجبوری ہے ہرشل! میں تمہیں اچھا انسان سمجھتا ہوں اور تمہارے ساتھ ہماری فیملی کے پرانے تعلقات ہیں۔ تمہاری چیکنگ کرنا انتہائی نامناسب لگ رہا ہے لیکن اگر یہ نہ کرتے تو دوسروں کے ساتھ ناانصافی ہوتی۔" اسٹیفن کو اچانک کوئی احساس ہوا تو اس نے ہرشل کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ بریسلیٹ کے گم ہونے کے بعد یہ پہلی بات تھی جو اس نے سخت اور خشک انداز میں نہیں کی۔

"کوئی بات نہیں اسٹیفن سر! کوئی بات نہیں، میں بھی سمجھتا ہوں۔" ہرشل نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہہ تو دیا لیکن برا اسے بھی لگ رہا تھا کہ اتنے پرانے اور قریبی ملازم کو بھی نہیں بخشا گیا۔

یہاں پر کچھ دیر لگی لیکن نتیجہ وہی...... بریسلیٹ اب بھی نہیں ملا تھا۔ اسٹیفن کا پارا چڑھنے لگا تھا اور ادھر شیلے بیزار دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

"بریسلیٹ اتنی بڑی چیز نہیں ہے، کسی بھی چھوٹی سی جگہ پر چھپایا جا سکتا ہے اور ہر جگہ کھنگالنے میں بہت وقت لگے گا اور پھر بھی خدشہ ہے کہ ناکامی ملے، تو پھر ہم وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟" شیلے نے باپ کی جانب مڑتے ہوئے کافی اہم بات کی۔

UrduNovels.com

’’نہیں سر! زیادہ ٹائم نہیں لگے گا، سب مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ ایسا مت کہیں کہ ناکامی ہوگی، اسٹیفن سر اس کے لیے بہت جذباتی ہیں۔‘‘ روشن نے جلدی سے کہا۔ اسٹیفن نے شکوہ بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو کہ تم سے زیادہ تو میری پروا میرا ملازم کر رہا ہے۔

’’میرا مطلب ہے کہ اگر......‘‘ شیلے نے بولنا چاہا۔

’’میرا خیال ہے پہلے ہنری کا روم چیک کرلیا جائے۔ وہاں مختصر سامان ہے، اس کے بعد ڈرائیور مورے کے ہاں تلاشی کا کام کریں گے۔ مجھے لگتا ہے اگلے دو گھنٹوں میں ہم فارغ ہو جائیں گے۔‘‘ روشن نے جلدی سے کہا۔

’’اور بریسلیٹ بھی برآمد کرلیں گے۔‘‘ ہرشل نے گویا بات مکمل کی۔ اسے یقین تھا کہ جس طرح وہ بے قصور ہے، اسی طرح کوئی نہ کوئی قصوروار بھی نکل آئے گا۔

’’میں چاہتا ہوں کہ بریسلیٹ مل جائے لیکن یہ میرا یقین ہے کہ ہم سب میں سے کوئی چور نہیں ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے کوارٹرز کے بجائے کہیں اور سے ملے۔‘‘ روشن نے بہت یقین سے کہا۔

’’وقت ضائع کرنے کے بجائے ہنری کے کمرے میں چلو۔‘‘ اسٹیفن نے برہمی سے کہا۔ سب ہنری کے کمرے کی جانب بڑھے۔ اسی دوران شیلے کا سیل فون بجنے لگا۔ شیلے باہر ہی رک کر کال سننے لگا۔

ہرشل، مورے اور روشن تینوں ہنری کے مختصر سے سامان کی تلاشی لینے کے لیے آگے بڑھے۔ اس سے پہلے کہ اس کے کمرے میں موجود دو بیگ کھولے جاتے جس میں ہنری کا سامان تھا، روشن نے دو خانوں پر مشتمل چھوٹی سی الماری کھولی۔ اس میں چند کتابیں، کچھ کپڑے اور چھوٹی موٹی اشیا پڑی تھیں۔ الماری کھولتے ہی روشن نے ٹھٹک کر پہلے الماری میں اور پھر کمرے میں موجود افراد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ انکشاف کر رہے تھے۔ ہرشل نے سب سے پہلے یہ بات نوٹ کی۔

’’کیا ہے روشن! تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟‘‘ کہہ کر ہرشل جلدی سے روشن کے قریب جا کر الماری کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسٹیفن، مورے اور ہنری نے چونک کر اُدھر دیکھا۔

’’وہ...... وہ...... بریسلیٹ......!‘‘ روشن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ ہنری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’’کیا...... کیا، بولو روشن!‘‘ اسٹیفن نے بیتابی سے کہا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ روشن کیا کہنے والا ہے۔

’’وہ...... بریسلیٹ یہاں...... موجود ہے۔‘‘ روشن نے بڑی مشکل سے رک رک کر کہتے ہوئے الماری کی جانب اشارہ کیا۔ بولتے ہوئے وہ بار بار ہنری کی طرف شرمندہ سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

’’کیا کہا......؟‘‘ کہتے ہوئے اسٹیفن آگے بڑھا۔ سامنے ہی دو تین کتابوں کے درمیان اس کا قیمتی اور جذباتی لگاؤ والا بریسلیٹ پڑا تھا۔ اس کا ایک سرا کتابوں سے باہر نکلا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ روشن کو نظر آ گیا تھا۔ اسٹیفن نے ہاتھ بڑھا کر بریسلیٹ کو باہر نکالا، چند سیکنڈ اسے غور سے دیکھتے ہوئے وہ چپ سا ہو گیا اور پھر یکدم ہنری کی جانب مڑا۔ ہنری باقاعدہ کپکپا رہا تھا۔ ہرشل اور مورے کا منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ہنری کی طرف کڑی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

’’تو یہ تم تھے ہنری......! یہ تم تھے جس نے میرے ہی گھر میں میری ناک کے نیچے میری وہ چیز چوری کی جس سے میری جذباتی وابستگی تھی۔ تم نے مجھے پریشان کیا، اپنی معصوم شکل سے سب کو بے وقوف بنایا۔ تم کڑی سزا کے مستحق ہو، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔‘‘ مسٹر اسٹیفن چلّا اٹھے۔

’’نہیں...... نہیں، میں چور نہیں ہوں...... میں نے چوری نہیں کی۔‘‘ ہنری نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

’’تو کیا بریسلیٹ خود چل کر تمہاری الماری میں آ گیا؟‘‘ ہرشل نے کڑے انداز میں کہا۔

’’مجھے نہیں معلوم...... کیسے آ گیا...... لیکن میں نے نہیں اٹھایا۔‘‘ ہنری نے بیچارگی سے کہا۔

’’ہنری! تم نے مجھے شرمندہ کر دیا، میں نے تمہیں جاب دلوائی اور تم نے کام کرنے کے بجائے چوری کرنا شروع کر دی۔ افسوس ہے تمہاری ذہنیت پر۔ تمہارے معصوم چہرے سے ہم سب دھوکا کھا گئے۔‘‘ ڈرائیور مورے غصیلے لہجے میں ہنری کو ڈانٹ رہا تھا۔ روشن چپ چاپ دکھی نظروں سے ہنری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ باقی لوگوں کے برعکس کچھ نہیں بولا۔

’’میں بے گناہ ہوں...... میں نے بریسلیٹ چوری نہیں کیا۔ اسٹیفن سر! میرا یقین کریں۔‘‘ ہنری گھٹی گھٹی لہجے میں بول رہا تھا۔

’’تم اپنا منہ بند رکھو، ہمیں پولیس کو کال کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے یہ عادی چور ہو اور کئی دوسری جگہوں پر پولیس کو مطلوب ہو۔‘‘ ہرشل نے فوری فیصلہ سنایا تو ہنری لرز اٹھا۔ ابھی وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اسٹیفن کا بیٹا شیلے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں آتے ہی اسے سب کے چہروں کے تاثرات اور ہنری کی ہوائیاں اڑاتی شکل دیکھ کر بدلی صورت

حال کا اندازہ ہونے لگا۔
"بریسلیٹ مل گیا ہے شیلے!" مسٹر اسٹیفن نے بیٹے کو خود اطلاع دی۔
"کہاں سے؟" شیلے نے سوال کیا۔
"ہاں...... ہنری کی الماری سے برآمد ہوا ہے۔" ڈرائیور مورے بتاتے ہوئے شرمندہ سا نظر آ رہا تھا۔
"شیلے سر! میں چور نہیں ہوں میں، آپ کے کمرے میں صفائی، ڈسٹنگ کرتا ہوں...... الماریاں، دراز سیٹ کرتا ہوں...... کبھی کچھ چوری ہوا؟ نہیں نا؟ یہ پتا نہیں کیسے ہو گیا۔" ہنری اب شیلے کی طرف مڑ چکا تھا۔ اس کا دوست روشن خاموش تھا۔ ہرشل، مورے اور اسٹیفن اسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اس صورت حال میں اسے جانے کیوں لگ رہا تھا کہ شیلے اس کا یقین کرے گا۔
"جو چیز چوری ہوئی تھی وہ تمہاری الماری سے ملی ہے۔ تم کتنے ڈھیٹ ہو، سب کے سامنے حقیقت آ جانے کے بعد بھی بے گناہی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو۔" اسٹیفن نے شدید غصے سے کہا۔ ہرشل اور مورے نے اسے مزید ڈانٹنا شروع کر دیا۔
شیلے چپ چاپ سب کی سن رہا تھا۔
"اب تم سامان سمیٹو اور دفع ہو جاؤ۔ میں پولیس کو بلا کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہاری عمر کی وجہ سے تم کو نہیں کہہ رہا ہوں...... نکل جاؤ فوراً۔" اسٹیفن نے شدید برہمی کے عالم میں حکم دیا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔
"بریسلیٹ کیسے ملا؟ میرا مطلب ہے کہاں رکھا ہوا تھا اور کتنی دیر میں ملا؟" شیلے نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سا سوال کیا۔
"اس ہنری نے اسے الماری میں رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں آتے ہی الماری کھولی تو کتابوں کے درمیان پڑا نظر آ گیا...... دو تین منٹ لگے تھے اور یہ مل گیا۔" اسٹیفن نے جواب دیا۔ اسے بیٹے کے سوال پر حیرت بھی ہوئی تھی۔
"دو تین منٹ...... واقعی اتنا ہی وقت لگا؟" کم عمر شیلے نے بڑے تجسس انداز میں پوچھا۔ ہنری اپنی مصیبت بھول کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔
"ہاں، بس اتنی ہی دیر لگی۔" ہرشل نے جلدی سے جواب دیا۔
"اس کا باقی سامان چیک کیا......؟ کہیں کچھ اور نہ اٹھا کر رکھا ہو۔" شیلے نے پورے کمرے کا اندر جائزہ لیتے ہوئے اگلا سوال کیا۔
"شیلے! چھوڑو ان سوالوں کو، میری قیمتی چیز مجھے مل گئی ہے، بس اتنا کافی ہے۔ اسے دفعان ہونے دو۔" اسٹیفن نے شیلے کو منع کرتے ہوئے خونخوار نظروں سے ہنری کو ایک بار پھر سے گھورا۔
"ڈیڈی! پلیز، مجھے پوچھنے دیں۔ میں کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں۔" شیلے نے کمرے میں پڑے بیگز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اسٹیفن نے حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔
"میں بتاتا ہوں سر! باقی سامان چیک کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اگر آپ کہیں تو باقی کمرا بھی چھان لیتے ہیں، ہو سکتا ہے اس نے کچھ اور نہ اٹھا رکھا ہو۔" مورے نے کہا۔ اس کے لہجے میں برہمی تھی۔ ہنری بیچارگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔
"بریسلیٹ کسے ملا؟" شیلے کا یہ سوال سن کر اسٹیفن جھنجلا اٹھا۔
"بس کرو شیلے! یہ سوال جواب......"
"بتاؤ مجھے، بریسلیٹ سب سے پہلے کس کو نظر آیا؟" شیلے نے دوبارہ سوال کیا۔ بات کاٹے جانے پر اسٹیفن نے اسے بڑی سخت نظروں سے دیکھا۔
"سر! مجھے ملا تھا۔" روشن نے آہستگی سے جواب دیا۔ وہ اپنے دوست ہنری سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا دوست اپنے جرم سمیت سب کی نظروں میں آیا تھا۔
"ہوں......!" شیلے نے لمبا سانس لیتے ہوئے محض چند سیکنڈز کمرے کو دیکھا اور بولا۔ "ہنری چور نہیں ہے۔"
"کیا کہا؟" اسٹیفن نے حیرت و غصے سے پوچھا۔
"میں نے کہا، ہنری واقعی چور نہیں ہے...... اور ہم سب کو چاہیے کہ اسے ڈانٹنے، گھر سے نکالنے کے بجائے اصل چور کا پتا لگائیں اور اسے یہاں سے نکالیں۔" شیلے نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ہنری کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا، اس کے دعوے کی تصدیق ہو رہی تھی۔
"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" اسٹیفن نے پوچھا۔ ہرشل، مورے اور روشن بڑی حیرانی سے باپ بیٹا کو دیکھ رہے تھے۔
"ڈیڈی! بعض اوقات جو نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ حقیقت نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی حقیقت کچھ اور ہے۔ میں اپنے کہے کی بنیاد پھر بتاؤں گا، پہلے اصل مجرم تو ڈھونڈ لوں...... اور پوچھ گچھ اسی کمرے میں ہوگی۔" شیلے نے کہا تو اس کے پراعتماد انداز اور "اسی کمرے میں پوچھ گچھ" نے اسٹیفن کو خاموش کر دیا۔
"یہ ہنری کو پھنسانے کی سازش تھی جو مورے تو ہرگز نہیں کر سکتا۔" شیلے نے تفتیش کا آغاز کر دیا تھا۔
"مسٹر ہرشل اسے اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔" روشن تیزی

UUNOVELS.COM

دیکھنے پر مجبور کرنے لگا۔

"ہاں..... لیکن اصل دشمنی تم نے دکھائی۔" شیلے نے اس کے قریب پہنچ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو کمرے میں موجود سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہنری اپنے دوست کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں نے..... شیلے سر! میں نے تو صرف......" روشن کی بات درمیان میں رہ گئی اور شیلے کا زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔

"آرام سے جرم کا اعتراف کرو گے یا پولیس کو بلایا جائے؟" شیلے نے غرا کر کہا۔ اسٹیفن نے حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

روشن نے تھوڑی سی مزاحمت دکھائی لیکن چند منٹ کی "خاطر تواضع" کے بعد مان گیا کہ مسز اسٹیفن کا بریسلیٹ اسی نے اٹھا کر ہنری کے کمرے میں رکھا تھا تاکہ ہنری کو ذلیل کروا کر نکلوا سکے۔

"میں نے اور میری فیملی نے برسوں یہاں خدمت کی لیکن یہ کل کا آیا ہنری، نہ صرف گگ ہرشل سے آگے بڑھ رہا تھا بلکہ اس نے میری جگہ بھی لینا شروع کردی تھی۔ اسٹیفن سر اور شیلے سر بار بار اسے "گڈ" کہنے لگے۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہر کام کے لیے اسے بلایا جاتا ہے، اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، یہ دل جیتتا جارہا ہے۔ مجھے بہت حسد محسوس ہونے لگا، اس لیے میں نے اسے سب کی نظروں میں بری طرح گرانے کے لیے یہ سب کیا۔"

روشن سر جھکائے اعترافِ جرم کررہا تھا اور ہنری بڑے تاسف سے اپنے اس دوست کو دیکھ رہا تھا جس نے اسے بہت بڑا دھوکا دیا تھا۔ ہنری کے بجائے روشن کو ملازمت اور گھر والوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ہنری بڑے دکھ سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

"تم نے اصل مجرم کو تو پکڑ لیا، اب بتاؤ تمہیں کیسے شک ہوا کہ ہنری چور نہیں، کوئی اور ہے؟" اسٹیفن نے روشن کے باہر نکل جانے کے بعد سوال کیا۔ مورے اور ہرشل ابھی تک وہیں موجود تھے۔

"اس کمرے کی ترتیب سے۔" شیلے مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" اسٹیفن نے پوچھا۔

"ڈیڈی! اس سے پہلے جہاں جہاں تلاشی لی گئی، وہاں سامان ادھر سے اُدھر ہوا، کپڑے بکھر گئے، ڈبے، دراز یں کھولی گئیں، یعنی تلاشی والا ہر کمرا بے ترتیب ہوا، لیکن ہنری کا کمرا بڑی ترتیب سے نظر آیا۔ اس کا سارا سامان اپنی اپنی جگہ پڑا تھا جس سے مجھے فوری پتا چل گیا کہ محض دو تین منٹ میں گمشدہ چیز کی برآمدگی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ جس کسی نے بریسلیٹ اٹھا کر ہنری کے کمرے کی الماری میں رکھا تھا، اس نے آکر وہیں سے بڑے اطمینان سے نکال لیا۔ آپ سب یہ دیکھ کر ہنری کو لعن طعن کرنے لگے لیکن...... روشن نے یہ غلطی کردی کہ بغیر تلاشی لیے، بغیر کوئی سامان کھنگالے فوراً بریسلیٹ نکال دیا۔ وہیں سے جہاں اس نے رکھا تھا۔ اسی لیے آکر اس نے فوراً الماری کھول دی۔ اس کی اسی غلطی نے مجھے مشکوک کیا اور میں نے پورے کمرے پر غور کرکے مجرم ڈھونڈ لیا۔ اگر روشن یہ غلطی نہ کرتا تو ہنری واقعی بری طرح پھنستا لیکن ایک سچے انسان کی قدرت نے مدد کی اور روشن نے اپنے پکڑے جانے کا خود ہی سراغ چھوڑ دیا۔"

اسٹیفن، ہرشل اور مورے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات سن رہے تھے۔

"ڈیڈی! دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کمرے کی ترتیب نے ہنری کی زندگی کو بے ترتیب ہونے سے بچالیا۔" شیلے نے دلچسپ اور اہم بات کی تو کمرے میں موجود تمام افراد مسکرا دیے۔

اسٹیفن نے بڑی خوشی سے اپنے اس بیٹے کی طرف دیکھا جو بظاہر کم گو اور گھریلو معاملات سے لاتعلق رہتا تھا لیکن اس کی نظر اور ذہن نے خوب کام کیا تھا۔

☆☆☆

ہنری کچن میں ہرشل کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اس نے بڑی معصومیت سے ہرشل کو بتایا کہ اس نے پورا یقین کرلیا تھا کہ اس معاملے میں ہرشل کا ہاتھ ہے۔ ہرشل یہ سن کر مسکرا دیا۔

"اختلافات یا غصہ اپنی جگہ لیکن میں انسانیت سے کبھی نہیں گر سکتا۔" ہرشل نے کہا۔

"اور ہاں، مسز اسٹیفن کے لیے سوپ بنا کر جلدی لے جاؤ، ایسا نہ ہو باتوں میں دیر ہوجائے اور وہ اپنے پسندیدہ سوپ کو پینے سے محروم ہوجائیں۔" اس نے مزید کہا تو ہنری خوشی خوشی کام میں لگ گیا۔

سوپ بنا کر اور مسز اسٹیفن کو دے کر آنے کے بعد وہ کچن کے برتن دھیان سے شیلف میں رکھنے لگا۔ وہ دھیان رکھ رہا تھا کہ ترتیب خراب نہ ہو۔ ترتیب ہر معاملے میں ہر انسان کے لیے اچھی ہوتی ہے لیکن ہنری کے لیے تو آج کے دن کی وجہ سے خاص اہمیت اختیار کرگئی تھی۔

✖✖✖

Urdunovels.com

رمزشناس

نازیہ کامران کاشف

آخری قسط

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کرسکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمزشناس کی ایسی کوشش تھی جس نے ان سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگادیا تھا، جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی ناقابل فراموش داستان رقم کردی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر انہیں عبرت کا نشان بنادیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیاد ابیب، انگلستان کے ارتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کے درمیان اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے

ایک رمزشناس کی سنسنی خیز داستان

Year 1773

ایڈنبرا

صبح ہونے کے قریب تھی۔ تھامس کو ان کاغذات میں کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ ان کاغذات میں بس یہی لکھا تھا کہ ایک مخصوص رات بدی کی طاقتوں کی طرف سے ہمیں تعلیم کو جگایا جائے گا اور قربانی کی رسم ادا کی جائے گی۔ تھامس نے حساب لگایا تو ایسی ہی ایک تاریخ آنے والی رات کو بھی تھی۔

مگر الیگزینڈر تو ایسی کسی رسم کو پورا کرنے کے بجائے یا وہاں رکنے کے بجائے واپس جا چکا تھا۔ نہ ہی اس نے ایلینا کو کوئی نقصان پہنچایا تھا۔ انہوں نے ایک نظر کمرے میں سوئے ہوئے آرتھر اور ڈیوڈ پر ڈالی۔

”اراہان! میں پھنس گیا ہوں، مشکل میں ہوں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے انہیں پکارا۔

کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تھامس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اراہان اس کے سامنے کھڑے تھے۔ تھامس اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم نہ بھی پکارتے تو میں آنے ہی والا تھا۔ جنگ شروع ہونے والی ہے تھامس! آج کا دن وہ اپنی تیاریاں مکمل کرنے میں گزاریں گے اور رات ہوتے ہی وہ اس رسم کو ادا کریں گے۔ انہوں نے اپنی تیاری مکمل کر لی ہے لہٰذا تم بھی اپنی تیاری مکمل رکھو۔ تمہاری مدد کے لیے یہاں وفد کی قوتیں بھی ساتھ لڑیں گی۔“ اراہان بولے تو تھامس کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔

”مگر اراہان! ہماری جنگ ہے کس سے؟ الیگزینڈر تو یہاں سے واپس جا چکا ہے۔ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں اور کہاں سے شروع کروں؟“ وہ حقیقتاً پریشان تھا۔ اب تک اندھیرے میں جو کھڑا تھا۔

”وہ کہیں نہیں گیا، وہ واپس یہیں آئے گا۔ تم پہلے سے قلعے میں چلے جاؤ اور وہاں صرف اور صرف آرتھر کو ساتھ لے کر جاؤ۔ الیگزینڈر وہیں آئے گا۔ دن کے وقت وہاں بدی کی طاقتیں نہیں پھٹکتیں۔ تمہاری موجودگی کی خبر انہیں نہیں ہو سکے گی۔ وفد کے لوگ وہاں پہلے سے پہرا دے رہے ہیں۔ وہ تمہاری اور آرتھر کی مہک کو ان سے روپوش رکھیں گے اور خود بھی روپوش رہیں گے۔

”وہ جنگ شروع ہونے تک سامنے نہیں آئیں گے لہٰذا الیگزینڈر کو لگے گا کہ وہ اور اس کے ساتھ موجود شیطانی طاقتیں جیتنے والی ہیں۔ تم نے اس کا ناجائز قربانی کی رسم مکمل ہونے سے پہلے کرنا ہے اور خاتمہ آرتھر کے ہاتھوں ہی ہوگا۔ وفد کے لوگ بھی تمہاری مدد کریں گے اور شیطانی قوتوں سے نمٹ لیں گے مگر اسے آسان لڑائی مت سمجھنا۔ یہ اعصابی اور جسمانی طور پر ایک بہت مشکل مقابلہ ہوگا۔ تمہیں اپنا دماغ حاضر رکھنا ہوگا اور آرتھر کو بھی راہنمائی فراہم کرنا ہوگی۔ اب تم بے فکر ہو کر قلعے کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ ڈیوڈ اور رچرڈ کے گھر والوں سے تم نے اس بات کا ذکر نہیں کرنا کہ تم قلعے میں جا رہے ہو۔ وفد کے لوگ قلعے میں پہنچنا شروع ہو چکے ہیں۔ تم چاروں طرف سے ہمارے حصار میں ہو گے مگر اصل جنگ تمہیں اور آرتھر کو ہی لڑنا ہے۔“ اراہان یہ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

تھامس گہری سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ برسوں سے وہ اس عہدے پر متعین تھا اور اس سے پہلے بھی کئی لوگ آتے جاتے رہے تھے مگر یہ جنگ اس کے حصے میں لکھی جا چکی تھی۔ اسے خدا کے سامنے سرخرو ہونا تھا۔ اس جنگ کے بعد آرتھر کی زندگی بھی بدلنے والی تھی۔ اسے اپنی مخفی صلاحیتوں کا احساس ہونے والا تھا۔ اسے اندازہ ہو جانا تھا کہ اسے کیوں چنا گیا ہے۔

تھامس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور آرتھر کو جگانے لگا۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ اس وقت بدی کی قوتیں کمزور پڑنے لگی تھیں۔ اسے رچرڈ اور ڈیوڈ سے اجازت لے کر فوراً نکلنا تھا تاکہ وہ شیطانی طاقتوں کی نظروں میں آئے بغیر ان سے پہلے قلعے میں پہنچ جائے۔

انہیں وہ یہی بتانے والا تھا کہ وہ اسکاٹ لینڈ واپس جا رہا ہے۔

☆☆☆

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

سنگھیا نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور بگھیاں تیز آندھی کی زد میں آ کر ہوا میں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور پھر ایک جھٹکے سے زمین پر آ گریں۔ وہ سب بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ زخموں سے چور، کراہتے ہوئے وہ سب بگھیوں سے باہر نکل رہے تھے۔

راج پریوار کے انت کا سمے آ چکا تھا۔

سنگھیا نے ان کی طرف حقارت سے دیکھا اور زمین پر تھوک دیا۔

رتناوتی جو اپنے بازو پر لگے زخموں کو سہلا رہی تھی، سنگھیا کی اس حرکت پر اس کا خون کھول اٹھا۔

"اب تم سب ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتارے جاؤ گے اور یہ تمہاری پرجا...... میرے سیوکوں کی طرف دیکھو، دراصل تو اب یہ میرے سیوک بن چکے ہیں۔" سنگھیا نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

مان سنگھ نے دیکھا کہ قلعے میں موجود تمام لوگ اس طرف قطار در قطار ایک طرف جمع ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی حرکتیں عجیب و غریب تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی سحر میں جکڑے ہوں۔ گو کہ ان میں سے کافی لوگ پتھروں کے برسنے کی وجہ سے زخمی بھی تھے مگر وہ بغیر پلکیں جھپکائے ٹکٹکی باندھے کھڑے تھے۔ ان کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سنگھیا نے ان سب پر جادو کر دیا تھا۔

"یہ تمام لوگ اپنی مرضی سے اپنی بلی دیں گے مگر تم سب کو اتنی آسان موت نہیں دوں گا۔ تمہارے شریر کا ایک ایک حصہ موت کے اس بھیانک درد کو محسوس کرے گا مگر اس سے پہلے تمہارا خاندان شیطان دیوتا کے لیے ایک عظیم بلی دے گا اور وہ ہے ایک عورت اور نوعمر بچے کی بلی۔ تم وہ بلی دیکھنے کے لیے جیوت رہو گے کیونکہ میں نے اس شبھ کاریے کے لیے تمہارے ہی پریوار سے ان مہان مہیلاؤں کا چناؤ کیا ہے جو یہ بلی دے کر امر ہو جائیں گی اور شیطان دیوتا کو خوش کر دیں گی اور وہ مہان مہیلائیں ہیں رتناوتی اور راگنی...... اگر میں نے امرتا کی تپسیا نہ کی ہوتی تو میں رتناوتی کے بجائے اسے چنتا مگر اب یہ دیوی میرے من سے اتر چکی ہے۔" سنگھیا، رتناوتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کی یہ بات سن کر شکنتلا چلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی مگر سنگھیا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ہوا میں بلند کیا اور پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا۔ ان کے ماتھے سے خون کی لکیر نکل کر مٹی میں جذب ہونے لگی۔

رویندر اور مان سنگھ تیزی سے شکنتلا کی طرف بڑھے۔ نہ جانے وہ بے ہوش تھی یا ختم ہو چکی تھی۔ رویندر نے اٹھ کر سنگھیا پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر مان سنگھ نے اسے روک لیا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ سنگھیا سے اس طرح مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔

"تو شیطان کا پجاری نکلا اور ہم تجھے ایشور کا روپ سمجھتے رہے۔ اگر مجھے پہلے پتا ہوتا تو رتناوتی کے بجائے تجھے دو ٹکڑے میں کروا دیتا۔ سیوکو...... اس شیطان پر حملہ کرو۔" مان سنگھ غصے سے چلائے مگر سینک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

انہوں نے پلٹ کر چاروں طرف دیکھا۔ قلعے کے پہرے دار اور سینک بھی اسی حالت میں کھڑے تھے جس حالت میں ان کی پرجا کھڑی تھی۔ سنگھیا نے ان کی حالت دیکھ کر قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

"یہ مت بھول، شیطان کہ ایشور نے ہمیشہ برائی کو شکست دی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا خاتمہ لکھا جا چکا ہو۔" رتناوتی چلائی۔

سنگھیا کے قہقہے مزید بلند ہو گئے۔

"شام ہونے میں بہت کم سمے رہ گیا ہے کنیا! تو ہمارے لیے اتنی بڑی بلی دینے جا رہی ہے اس لیے میں تیری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گا۔ تیری اس کسن بلی دان کو چپ کروا۔" سنگھیا، راگنی کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرایا جو مسلسل رو رہی تھی۔

پاروتی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ راگنی کے رونے میں مزید شدت آ گئی تھی۔ وہ ماں کے سینے میں چھپ گئی۔

رویندر پہلے ہی زخمی تھا، مزید چوٹوں نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھا انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

سینکوں کے علاوہ راج کے وزیر و مشیر کا بھی وہی حال تھا جو باقی سب کا تھا۔ صرف شاہی پریوار ہی تھا جو اپنے ہوش و حواس میں تھا۔

"بلی کی تیاری شروع ہو جانی چاہیے، سورج ڈوب رہا ہے۔ میں اپنے سیوکوں کو حاضر کرنے لگا ہوں۔ قلعے کے دروازے بند کر دو۔" سنگھیا زور سے چلایا۔ اس کے حکم پر مان سنگھ کے پہرے داروں نے قلعے کے دروازے بند کر دیے۔ وہ بھی اس کے جادو کے زیر اثر تھے۔

سنگھیا نے آنکھیں بند کر کے منتر پڑھنا شروع کیے۔ چاروں طرف سے تیز ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ جنگل خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔

شاہی پریوار ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہو گئے اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اچانک جنگل سے ایک بہت بڑا بگولا نمودار ہوا۔ اس بگولے میں گھومتی وہ خوفناک شکلیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ یہ جنگل شیطان کا مسکن ہے۔ وہ بڑی تعداد میں تھے اور بگولے سے ایک ایک کر کے نکلتے جا رہے تھے اور قلعے کے اندر اتر رہے تھے۔

راگنی اور پاروتی نے چلانا شروع کر دیا۔ رتناوتی کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات تھے۔ مان سنگھ اور رویندر بھی ان بھیانک چہروں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ موت ان

کے سروں پر پہنچ چکی تھی۔

★★★

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

یونس اپنا سامان لے کر نیچے اترا تو محل میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اس نے ناشتے سے پہلے ہی روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ الیرا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ رات اس نے جیسے کانٹوں پر کاٹی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا۔ شاید آج کے بعد وہ الیرا کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاتا۔

"السلام علیکم!" اس نے صبورہ کو سامنے سے آتا دیکھ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، یونس......!" وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھیں اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہی رونا شروع ہو گئیں۔

"کیا ہوا، خیریت تو ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ ان کی حالت دیکھ کر فکرمند ہوا۔

"ہاں...... ہاں...... ہم...... میں ٹھیک ہوں...... ہم...... مگر الیرا نہیں مل رہی۔" وہ جملہ مکمل کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

یونس نے ہاتھ میں پکڑا سامان نیچے رکھ دیا۔

"کیا مطلب، الیرا نہیں مل رہی؟ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟" وہ فکرمندی سے بولا۔

"وہ...... وہ میں...... صبح اسے جگانے گئی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے سارا محل دیکھ لیا...... مگر وہ کہیں بھی نہیں ہے...... زبیر بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ کہاں گئی ہو گی وہ؟" وہ زاروقطار رو رہی تھیں۔

یونس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ عین اسی لمحے زبیر بن دمام بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

"میں نے آس پاس کا تمام علاقہ چھان مارا ہے۔ پہرے دار گلیوں میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ کہاں چلی گئی میری بچی؟" ان کے چہرے پر بے انتہا پریشانی اور دکھ کے تاثرات تھے۔ وہ شکست خوردہ انسان کی طرح صوفے پر ڈھے گئے۔

"آپ حوصلہ رکھیں...... وہ یہیں کہیں ہو گی...... ابھی مل جائے گی۔" یونس نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ کہیں نہیں جاتی یونس...... میری اجازت کے بغیر وہ کبھی باہر نہیں نکلی۔ کسی پہرے دار کو بھی علم نہیں کہ وہ کب اور کہاں گئی ہے...... میں تو بدنامی کے ڈر سے منادی بھی نہیں کروا سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری بیٹی پر انگلی اٹھائے اس لیے خود ہی خاموشی سے اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم...... تم اسے غلط مت سمجھنا...... اس رشتے کو ختم نہ کرنا...... ہم...... ہم اسے ڈھونڈ لیں گے...... الیرا واپس آ جاؤ میری بچی!" وہ بھی رونا شروع ہو گئے۔

یونس کو اندازہ ہوا تھا کہ انہیں الیرا کتنی عزیز ہے۔

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں الیرا کے بارے میں کبھی غلط نہیں سوچ سکتا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دیکھنے جاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مکتب چلی گئی ہو۔" وہ بولا۔

"مگر میں نے تو اسے کل ہی مکتب جانے سے منع کر دیا تھا...... میری اجازت کے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتی اور اکیلے تو بالکل بھی نہیں جا سکتی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے مکتب جانے سے منع مت کیجیے گا۔ آپ فکر نہ کریں، میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں اور ان شاء اللہ اسے ساتھ لے کر ہی واپس لوٹوں گا۔ بس آپ نے اس پر ناراض نہیں ہونا۔" وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"یونس......! تم الیرا کے اس طرح گھر سے جانے پر اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی اپنے دل میں نہ پالنا۔ میری بچی بہت معصوم ہے۔ اس نے کبھی میرا سر نیچے نہیں ہونے دیا ہے۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔

"ایسا مت سوچیں۔ آپ کو یہ کہنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں الیرا کو جانتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں...... میں مکتب سے ہو کر آتا ہوں، وہ وہیں ہو گی۔" وہ یہ کہہ کر محل سے باہر نکل آیا۔

محل کی بگھی تیار کھڑی تھی۔ وہ بگھی میں سوار ہو کر مکتب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ الیرا مکتب ہی گئی ہو گی مگر جب وہ مکتب پہنچا تو مکتب بند پڑا تھا۔ اسے حقیقتاً پریشانی نے گھیر لیا۔

نہ الیرا گھر پر تھی اور نہ ہی عیاد نے مکتب کھولا تھا۔ اس بات کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ کہیں الیرا نے جذبات میں آ کر کوئی انتہائی قدم تو نہیں اٹھا لیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو یہ بہت ہی غلط ہوا تھا۔

یونس نے فوراً ہی عیاد سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ وہ ان دونوں کو سمجھا سکے اور الیرا کو واپس گھر لا سکے۔ اگر واقعی ان کا نصیب ایک ساتھ لکھ دیا گیا تھا تو ان معاملات کا باعزت طریقے سے نمٹ جانا ہی سب کے لیے بہتر تھا۔ وہ آس پاس کی دکانوں سے عیاد کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔

urdunovels.com

"عیاد، عبداللہ کے مکان میں رہتا ہے۔ وہ سرائے ادریس ہے نا...... اس سے جا کر معلوم کر لو۔ وہ عبداللہ کے گھر کا پتا جانتا ہے۔" تندور والے نے اسے ادریس کی سرائے کا پتا سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ادریس کے سامنے کھڑا تھا۔

"السلام علیکم! میرا نام یونس ہے۔ میں عیاد کا دوست ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ آج عیاد نے کتب نہیں کھولا تو کسی نے مجھے بتایا کہ آپ کو اس کے گھر کا پتا معلوم ہے۔" وہ ادریس سے مخاطب ہوا۔

"وعلیکم السلام! جی...... عیاد، عبداللہ کے گھر مقیم ہے۔ کیا یوسف بھی نہیں آیا؟" وہ حیرت سے یونس سے سوال کرنے لگا۔

"جی نہیں...... اگر کتب کھلا ہوتا تو میں یوسف سے پتا معلوم کر لیتا مگر کتب کو تالا لگا ہوا ہے۔" یونس بولا۔

"چلیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کو عبداللہ کے گھر پہنچا کر میں واپس سرائے آجاؤں گا۔" ادریس بولا تو یونس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

وہ دونوں محل کی بگھی میں سوار ہو کر عبداللہ کے گھر پہنچے۔

"یہ عبداللہ کے گھر کا دروازہ ہے اور یہ اس کمرے کا دروازہ ہے جہاں عیاد مقیم ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔ یہ روزی کا وقت ہے۔ اس وقت کافی رش ہوتا ہے سرائے میں۔ میرے مددگار اسے اکیلے سنبھال نہیں سکتے، پھر ملاقات ہوگی۔" ادریس اس سے اجازت لے کر روانہ ہو گیا۔

یونس نے اس کے جانے کے بعد عیاد کے گھر کا دروازہ بجایا۔

"کون ہے؟" عیاد کی آواز ابھری۔

"میں یونس! دروازہ کھولیں۔" یونس بولا۔

عیاد نے دروازہ کھول دیا۔ وہ حیرت سے یونس کو دیکھنے لگا۔

"تم تو محل کے پہرے دار ہو نا؟ کیا ہوا، سب خیریت تو ہے؟" عیاد اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا۔

نبیل بھی اس کے ساتھ کمرے میں ہی موجود تھا۔ وہ الیرا کے منگیتر کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور اسے عیاد کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" یونس نے اجازت مانگی۔

"آجاؤ۔" عیاد چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ اس سے پہلے جن لوگوں کو وہ اندر آنے کی اجازت دے چکا تھا، ان کی وجہ سے اسے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو عیاد نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

"کہو...... کیا بات ہے؟" عیاد اس سے سوال کرنے لگا۔

"میں یہاں الیرا کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔ کیا وہ آپ کے ساتھ ہے؟ اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں۔ دیکھیں آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو معاملات کو باعزت طریقے سے نمٹانے کی کوشش کیجیے۔ الیرا سے کہیں کہ گھر واپس آجائے۔" یونس سنجیدگی سے بولا تو عیاد کے ساتھ ساتھ نبیل بھی اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

الیرا کا منگیتر، عیاد اور الیرا کے رشتے سے واقف تھا اور عیاد کے گھر الیرا کو تلاش کر رہا تھا۔ یہ کیا معاملہ تھا!

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تمہاری بات کچھ نہیں آ رہی۔ الیرا میرے گھر کیوں آئے گی؟ میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ وہ محل چھوڑ کر میرے گھر چلی آئے۔" عیاد نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے یونس کی بات کا جواب دیا۔ واقعی اس کے اور الیرا کے درمیان ایسا کوئی وعدہ نہیں ہوا تھا جو اسے محل چھوڑ کر عیاد کے گھر آنے پر مجبور کر دیتا۔

عیاد کی بات سن کر یونس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔

"مجھے حلیمہ نے اور خود الیرا نے بتایا تھا کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کا الیرا سے ایسا کوئی رشتہ نہیں؟ اگر یہاں نہیں ہے تو کہاں جا سکتی ہیں وہ؟ ان کے گھر والے انہیں تلاش کر رہے ہیں اور بہت پریشان ہیں۔ وہ تو کبھی اکیلے محل سے باہر نہیں نکلیں۔" وہ ناراضگی سے بولا۔

اب پریشان ہونے کی باری عیاد کی تھی۔

تو حلیمہ نے اس دن پہرے دار کو الیرا اور عیاد کے رشتے کے بارے میں مطلع کیا تھا اور اس کے بعد ہی وہ الفرافرہ روانہ ہوئی تھی اور اب الیرا بھی غائب تھی۔

"کیا تم نے الیرا کو کتب میں تلاش کیا ہے؟" عیاد کو الیرا کی فکر شروع ہو گئی۔ آخر وہ کہاں جا سکتی تھی؟ وہ ایک پہرے دار کے سامنے جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ محل سے سیدھا اس کے گھر آ کر الیرا کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے لیے تو یہ بات ہی بہت پریشان کن تھی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ الیرا کے والدین کو پتا چل چکا تھا کہ الیرا اور عیاد ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ بات تو خود الیرا کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی۔

"جی، آپ کا کتب بند پڑا ہے، میں پہلے وہیں گیا

تھا۔" یونس بولا تو عیاد اس کی بات سن کر بری طرح چونکا۔
"لیکن میں نے تو رات کو یوسف کو کہا تھا کہ صبح وہ وقت پر کتب کھولے۔" عیاد پریشانی سے بولا۔
"یوسف کا گھر کہاں ہے؟ ہوسکتا ہے اس نے کتب کھولا ہو اور اسے المیرا کے بارے میں کچھ معلوم ہو؟" یونس بولا۔
"یوسف کا گھر گلی کے کونے پر ہی ہے۔ چلو، ہم ساتھ چل کر یوسف سے معلوم کر لیتے ہیں۔" عیاد بولا۔
نبیل بھی ان کے ساتھ ہی گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ یوسف کے گھر پہنچ کر اس کے گھر کا دروازہ بجانے لگے۔
دروازہ اس کی والدہ نے کھولا۔
"السلام علیکم! یوسف کو بھیجیں۔" عیاد انہیں سلام کرنے کے بعد بولا۔
"وعلیکم السلام! جی......؟ میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔" وہ حیرت سے عیاد کو دیکھنے لگیں۔
"یوسف سے کہیں، عیاد آیا ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔" عیاد بولا۔
"مگر وہ تو رات کو آپ کے ساتھ ہی گیا تھا۔" وہ پریشانی سے بولیں تو عیاد کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔
"میرے ساتھ گیا تھا تو کیا اس وقت سے وہ واپس نہیں لوٹا؟" عیاد فکرمندی سے بولا۔
"نہیں، گھر تو نہیں آیا...... مجھے لگا وہ آپ کے ساتھ ہی ہے...... کہاں چلا گیا یوسف؟" وہ بھی پریشان ہو گئیں۔
"آپ فکر نہیں کریں۔ ہوسکتا ہے وہ کتب گیا ہو۔ میں وہاں دیکھ لیتا ہوں۔ پریشان نہ ہوں، وہ بہت سمجھدار لڑکا ہے۔ آجائے گا۔" عیاد انہیں یہ کہہ کر یونس کے ہمراہ واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔
"آپ کے کتب میں کام کرنے والا وہ لڑکا بھی گھر سے غائب ہے اور المیرا ابھی گھر پر نہیں ہے۔ ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟" یونس کی فکر بڑھ گئی۔
اچانک عبداللہ سامنے سے آتا نظر آیا۔
"السلام علیکم، عیاد بھائی!" عبداللہ نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔
"وعلیکم السلام!" عیاد اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ حلیمہ کی گمشدگی کی خبر بھی اس پہرے دار کے سامنے اگل دیتا اور اتفاق سے تینوں کا تعلق عیاد سے ہی تھا۔
"میں بس ابھی حلیمہ بہن کو ہی تلاش کرنے نکلا ہوا تھا۔ ان کے کچھ عزیز رشتے داروں کے گھر گیا تھا۔ کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔" وہ پریشانی سے بولا تو یونس اس کی بات سن کر چونک پڑا۔
کیا قاہرہ کی آدھی آبادی غائب ہو چکی تھی جو ہر گھر میں کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی کو تلاش ہی کر رہا تھا۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ مل جائیں گی حلیمہ بہن۔" عیاد اسے یہ کہہ کر فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔
"کیا یہ وہی حلیمہ ہے؟ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟" یونس بے چینی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"یونس! تم بے فکر ہو کر محل واپس جاؤ۔ المیرا کل صبح سے پہلے واپس آجائے گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تم ان کے والدین کو تسلی دو اور ان کے ساتھ رہو۔ بس مزید سوال جواب مت کرنا۔ میں خود المیرا کو محل لے کر آؤں گا اور سارے سوالات کے جواب دوں گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔" عیاد اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔
"مگر......" یونس بولنے ہی لگا تھا کہ عیاد نے اس کی بات کاٹ دی۔
"میں نے کہا نا، میں فی الحال کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا مگر تم خود دیکھ رہے ہو کہ اس وقت قاہرہ سے کافی لوگ غائب ہیں۔ یہ کوئی عام معاملہ نہیں ہے۔ تمہیں صبح تک کا انتظار کرنا ہوگا اور اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ المیرا کی گمشدگی کی خبر محل سے باہر عام نہ ہو۔" عیاد اسے سمجھانے لگا۔
"میں بھی تمہارے ساتھ المیرا کو تلاش کروں گا۔" وہ بضد تھا۔
"میں تم سے کہہ رہا ہوں نا کہ تم واپس جاؤ۔ تم المیرا کے والدین کو تسلی دو، میں اسے باحفاظت محل پہنچا دوں گا۔" وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔
یونس چند لمحے وہیں کھڑا اس دروازے کو گھورتا رہا اور پھر واپس بگھی کی طرف چل پڑا۔
عیاد ویسا نہیں تھا جیسا وہ اس کے بارے میں سوچ کر آیا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی کشش تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی بات مان کر محل واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اب اسے زبیر اور صبورہ کو حوصلہ دینا تھا اور المیرا کی خیریت سے واپس لوٹنے کی دعا کرنا تھی۔ اس نے واپس استنبول جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

☆☆☆

عیاد اپنے کمرے میں داخل ہوا اور فوراً ہی مراقبے میں بیٹھ گیا۔ نبیل خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

urdunovels.com

عیاد نے یوسف کا تصور کیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے ایک منظر واضح ہوا۔ یوسف اسے چھوڑنے کے بعد اس گلی سے نکلا تھا مگر اپنے گھر کی گلی میں مڑنے سے پہلے اسے ایک گلی میں حلیمہ کھڑی نظر آئی تھی۔ وہ حلیمہ کے ساتھ کتب کی طرف چل پڑا تھا۔ اگلا منظر دیکھ کر عیاد مراقبے کی حالت میں چونکا۔ کتب کے سامنے الیرا بھی کھڑی ہوئی تھی۔

وہ تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور پھر اچانک ہی گلی کو کالے سایوں نے گھیر لیا تھا اور پھر وہ تینوں اس گلی سے غائب ہو گئے تھے۔ عیاد نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھولیں۔

"کیا ہوا عیاد! کہاں ہیں الیرا اور یوسف؟" نبیل نے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر سوال کیا۔

"وہ حلیمہ کے ساتھ تھے اور پھر غائب ہو گئے۔ حلیمہ...... حلیمہ نہیں تھی...... اس کی آنکھیں......" عیاد اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

قربانی کی رسم، بچہ اور عورت! حلیمہ اور شیطان...... سارے سرے ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔

"چلو، ہم القرافرہ روانہ ہو رہے ہیں۔ وقت آچکا ہے اور میں تیار ہوں نبیل! اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد کرے۔ میں اس کتاب کو واپس حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ الیرا اور یوسف کو بھی صحیح سلامت واپس لے کر آؤں گا، ان شاء اللہ!" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"جانے سے پہلے میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں جو میں نے تم سے قصداً چھپائی تھی مگر اب مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اس بات کی خبر ہونی چاہیے۔" نبیل بولا۔

"جلدی کہو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" عیاد بولا۔

"یونس، الیرا کا منگیتر ہے اور کچھ ماہ بعد ان کا نکاح ہے مگر الیرا کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبات نہیں۔ وہ اسے صرف اپنا دوست سمجھتی ہے۔ بس اسی وجہ سے میں نے تم سے یہ بات چھپائی۔" نبیل شرمندگی سے نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

عیاد کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔

"ٹھیک ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ کیا اماں نے ہمیں اشارہ دے دیا ہے؟" وہ ناراض ہوئے بغیر ضبط سے بولا۔

"اماں ہمیں وہیں ملیں گے۔ ہماری تیاری مکمل ہے۔ مجھے ابھی ابھی ان کی طرف سے القرافرہ پہنچنے کا اشارہ ملا ہے...... چلتے ہیں۔" نبیل اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

عیاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں اس کمرے سے غائب ہو چکے تھے۔

☆☆☆

Year 1773

ایڈنبرا

ایلیز بتھ رکی بگھی ایملینا کے گھر کے سامنے رکی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ اس نے بے ہوش جیتھر پر ایک نظر ڈالی اور بگھی سے نیچے اتر آیا۔ بگھی والا بھی پیسوں کے لالچ میں اس کے ساتھ جوڑ کر چکا تھا لہٰذا اسے اس کی طرف سے اطمینان تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ لمحوں میں اس کی گردن مروڑ سکتا تھا۔

یہاں سے اس کی اصل جنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس نے رچرڈ کے گھر کا دروازہ بجانا شروع کیا۔ دروازہ رچرڈ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3,500 روپے
بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس
0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

نے کھولا۔

''تم یہاں...... مگر کل تو تم واپس چلے گئے تھے؟''

رچرڈ اسے دوبارہ سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ رچرڈ کو جواب دیے بغیر تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوا۔

''ارے...... ارے، اندر کہاں گھسے چلے جا رہے ہو؟'' رچرڈ غصے سے اس کے پیچھے دوڑا۔ الیگزینڈر نے اپنا ہاتھ گھمایا تو رچرڈ اڑ کر دور جا گرا۔

وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ناشتے کی میز پر ڈیوڈ، ایلینا اور رچرڈ کی بیوی بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ ڈیوڈ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم...... تمہاری ہمت کیسے ہوئی دوبارہ یہاں آنے کی؟'' ڈیوڈ غصے سے بولا۔ الیگزینڈر کا ہاتھ دوبارہ گھوما اور ڈیوڈ ایک طرف الٹ گیا۔

الیگزینڈر فوراً ہی ایلینا کی طرف بڑھا جو اسے دیکھ کر سفید پڑ چکی تھی۔ اس نے ایلینا کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف لے جانے لگا۔

ایلینا تکلیف سے چلانے لگی اور مزاحمت کرنے لگی مگر الیگزینڈر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ایلینا کی ماں چیختے ہوئے اس کے پیچھے آئی۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو تم؟ چھوڑو ایلینا کو...... کہاں لے کر جا رہے ہو میری بیٹی کو؟'' وہ چلانے لگی۔

ایلینا کی ماں کا بھی وہی حال ہوا جو ڈیوڈ اور رچرڈ کا ہوا تھا۔ رچرڈ تو گرنے کے بعد اٹھ نہیں سکا مگر ڈیوڈ نے اٹھ کر دوبارہ سے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس بار الیگزینڈر نے اس کی ناک پر ایک مکا جڑ دیا۔ وہ چکرا کر پیچھے کو ہٹا۔ اس نے اپنی ناک سے نکلتے خون کو حیرت سے دیکھا۔ ڈیوڈ ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ وہ الیگزینڈر جیسے دبلے پتلے لڑکے کے ہاتھوں سے کیسے مار کھا رہا تھا۔

الیگزینڈر ایک بار پھر سے ایلینا کو بالوں سے کھینچتے ہوئے باہر لے جانے لگا۔ اچانک کمرے سے ایلینا کا بھائی نکلا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے بیلچے سے الیگزینڈر کے سر پر وار کر دیا۔ الیگزینڈر کے منہ سے ہلکی سی ''سی'' کی آواز نکلی۔ وہ لمحے بھر کو رکا اور پھر ایلینا کے بال چھوڑ کر اس شخص کی طرف پلٹا۔ اس نے غصے سے اپنی نظریں اس شخص پر جما دیں۔ اس شخص کے جسم میں بری طرح سے توڑ پھوڑ شروع ہوئی۔ وہ تکلیف سے چلانے لگا۔ ڈیوڈ جو دوبارہ سے الیگزینڈر کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھ رہا تھا، اس شخص کی حالت دیکھ کر وہیں رک گیا۔

''اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارا حشر اس جیسا ہو تو شام سے پہلے قلعے میں چلے آنا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اتنے لوگوں کو سنبھالتا ہوا قلعے تک جاؤں۔ ایلینا کی خیریت چاہتے ہو تو خود ہی آ جاؤ...... اور ہاں، اکیلے آنا۔ اگر تم نے دیر کی تو ایلینا کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

ڈیوڈ کو ایسا لگا جیسے اس کے قدم جم گئے ہوں۔

الیگزینڈر نے زمین پر پڑی ایلینا کو ایک بار پھر بالوں سے جکڑ کر اٹھایا اور اپنی جیب میں رکھا رومال نکال کر ایلینا کی ناک پر رکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ رچرڈ بے ہوش پڑا تھا اور قصبے کے لوگ تو ویسے ہی ان کے گھر سے دور دور ہی رہتے تھے۔ اسے کوئی نہیں روک سکا تھا۔

اس نے اطمینان سے بے ہوش ایلینا کو بگھی میں ڈالا اور قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔

آج اسے کامیاب ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ قلعے کو چاروں طرف سے ان خوفناک شیطانوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ راج پریوار کے علاوہ سب ہی سنگھیا کے سحر کی قید میں تھے۔ وہ شیطان، راگنی اور رتناوتی کو جکڑے کھڑے تھے۔ راگنی مسلسل چلا رہی تھی مگر رتناوتی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ڈر کا شائبہ تک نہ تھا۔ پاروتی سکتے کے عالم میں اپنی دونوں بیٹیوں کو تک رہی تھیں اور رویندر اسی زخمی حالت میں مان سنگھ کو دلاسا دے رہا تھا۔ اتنا تو وہ سب ہی جانتے تھے کہ رتناوتی اور راگنی کے بعد ان سب کی باری بھی آنی تھی۔

سنگھیا نے قلعے کے بیچوں بیچ الاؤ روشن کر دیا اور اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اب وہ سرخ شیطان کو پکار رہا تھا۔ چاند ظاہر ہونے والا تھا اور چاند کے ظاہر ہوتے ہی سنگھیا کو وہ منتر پڑھنے تھے اور اس کے بعد قربانی کی رسم کو پورا کرنا تھا۔

اچانک قلعے میں لال دھواں بھرنے لگا اور چاروں طرف شدید بدبو پھیل گئی۔ جب وہ دھواں چھٹا تو سنگھیا کے سامنے سرخ شیطان بیٹھا ہوا تھا۔

''میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اب مجھے ان

urdunovels.com

منتروں کی ضرورت پڑے گی۔ کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہو؟" سنگھیا بولا۔

"بہت بہاد شالی (متاثر کن)۔" اس سرخ شیطان نے سنگھیا کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ ہر زبان اور ہر لہجے میں بات کرنا جانتے تھے۔

"مگر یہ مت بھولو کہ ابھی تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا ہے۔ تمہارا وعدہ تب پورا ہوگا جب تم وہ منتر پڑھنے کے بعد بلی کی اس رسم کو پورا کرو گے۔" سرخ شیطان نے سنگھیا کو یاد دلایا۔

"میں جانتا ہوں۔ کیا تم منتر لے کر آئے ہو؟" سنگھیا سنجیدگی سے بولا۔

اس شیطان نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ سنگھیا کی طرف بڑھایا۔

"ہم نے وہ کتاب حاصل کر لی ہے۔ یہ اس منتر کی پرچھی (نقل) ہے۔ طریقہ تمہیں معلوم ہے، اب میں چلتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔

سنگھیا نے کاغذ کھول کر ان منتروں کو دیکھا اور پھر آسمان پر نظر ڈالی۔ ابھی چاند نکلنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اسے بے صبری سے اس قربانی کے پورا ہونے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد اسے سب کچھ ملنے والا تھا۔ وہ ہندوستان کی سرزمین پر راج کرنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

ایڈنبرا

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ڈیوڈ قلعے جانے کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔

الیگزینڈر کے جانے کے بعد اس نے رچرڈ اور اس کے گھر والوں کو ہوش دلایا اور ان کی مرہم پٹی میں لگ گیا تھا۔ وہ سب صدمے کی حالت میں تھے۔ خود ڈیوڈ بھی بہت پریشان تھا۔ فادر بھی واپس جا چکے تھے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں بچا تھا کہ وہ اسکاٹ لینڈ روانہ ہوتا اور فادر کو ساتھ لے کر آتا۔ الیگزینڈر، ایلینا کو لے کر قلعے میں داخل ہو چکا تھا۔ نہ جانے وہ یہاں کس مقصد سے آیا تھا۔

ڈیوڈ مقامی چرچ گیا تھا مگر اس چرچ کے فادر بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ اب اسے اکیلے ہی قلعے کی طرف جانا تھا لہٰذا اس نے اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ الیگزینڈر سے مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں۔ یقیناً اس کے پاس خفیہ شیطانی طاقتیں تھیں جن کی مدد سے وہ آسانی سے ان سب پر قابو پا چکا تھا۔

ڈیوڈ کو خود بھی مرہم پٹی کی ضرورت پڑی تھی۔ رچرڈ نے اس کے ساتھ جانے پر اصرار کرنا شروع کر دیا مگر وہ جانتا تھا کہ رچرڈ کی جان کو خطرہ ہے اور الیگزینڈر اسے اکیلے آنے کا کہہ کر گیا تھا لہٰذا وہ رچرڈ کو اپنے ساتھ لے جا کر ایلینا کے لیے مزید خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے لباس کے مختلف حصوں میں چاقو، پستول اور چھوٹے موٹے ہتھیار چھپا لیے۔ اس کی بگھی تیار کھڑی تھی۔ وہ ان سب سے اجازت لے کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک رچرڈ کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سب چونک پڑے۔ آج کل ان کے گھر پر ہونے والی دستکیں اچھی نوید ساتھ لے کر نہیں آتی تھیں۔

"میں دیکھتا ہوں۔" ڈیوڈ، رچرڈ کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"جی کون؟" ڈیوڈ نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک لڑکی کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ لڑکی دیکھنے میں مقامی نہیں لگتی تھی۔

"مجھے ڈیوڈ صاحب سے ملنا ہے۔" وہ لڑکی پریشان لگ رہی تھی۔

"جی کہیے۔ میں ہی ڈیوڈ ہوں۔" ڈیوڈ بولا۔

"جی میرا نام ازابیلا ہے۔ میں اسکاٹ لینڈ سے یہاں آئی ہوں۔ آرتھر اور فادر تھامس سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں چرچ گئی تھی مگر وہاں موجود مددگار نے مجھے بتایا کہ وہ آپ کے گھر پر ہیں کیونکہ کل اس نے انہیں آپ کی بگھی سے یہاں اترتے ہوئے دیکھا تھا۔" اس نے ایک ہی سانس میں اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"مگر وہ تو آج صبح ہی یہاں سے اسکاٹ لینڈ روانہ ہو چکے ہیں اور اب تک تو شاید وہاں پہنچ بھی چکے ہوں گے۔" ڈیوڈ نے کندھے اچکائے۔

"اوہ...... نہیں...... اب میں کیا کروں گی؟" لڑکی کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔

"آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ مسئلہ کیا ہے؟ ہو سکتا ہے میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔" ڈیوڈ بولا۔

"میں اپنے ایک دوست الیگزینڈر کو تلاش کر رہی ہوں۔ فادر تھامس ہی اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے تھے مگر وہ یہاں بھی نہیں ہیں۔" وہ اپنا تعارف کرتے ہوئے بولی اور اس کے منہ سے الیگزینڈر کا نام سن کر ڈیوڈ چونک پڑا۔

UrduNovels.com

''الیگزینڈر کو......؟ کیا، کیا ہے اس نے آپ کے ساتھ؟'' ڈیوڈ بولا۔

''آپ...... آپ جانتے ہیں الیگزینڈر کو؟ مجھے بتا ئیں وہ کہاں پر ہے؟ وہ میرے گھر سے میری چھوٹی بہن کو لے کر نکلا ہے۔ میری بہن تو اسے صحیح طرح جانتی بھی نہیں ہے۔ ہم نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا...... نہ جانے میری بہن کس حال میں ہو گی؟'' وہ لڑکی رونا شروع ہو گئی۔

ڈیوڈ نے ایک گہری سانس لی۔ الیگزینڈر نے بہت سارے لوگوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ وہ دو لڑکیوں کو لے کر اس آسیب زدہ قلعے میں جا چکا تھا۔ نہ جانے اس کی اس حرکت کے پیچھے کیا گھناؤنے مقاصد تھے۔

''جی، ہم بھی اسی کے ستائے ہوئے ہیں۔ وہ میری بچی ایلینا کو ہمارے گھر سے اغوا کر کے ایڈنبرا کے قلعے کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور اس نے مجھے وہاں اکیلے آنے کو کہا ہے۔ میں الیگزینڈر کے پیچھے ہی جا رہا ہوں۔'' ڈیوڈ بولا۔

''میں بھی چلوں گی۔ مجھے بھی اپنی بہن کی تلاش ہے۔ یقیناً وہ بھی وہیں ہو گی۔'' ازابیلا اس کی بات سن کر بے چینی سے بولی۔

''الیگزینڈر کوئی عام انسان نہیں ہے...... وہ انسان کے روپ میں شیطان ہے۔ آپ کا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو یہیں رک کر میرا انتظار کر سکتی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایلینا کے ساتھ ساتھ میں آپ کی بہن کو بھی اس کے چنگل سے چھڑا کر لے آؤں گا۔'' ڈیوڈ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''نہیں، میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی...... مجھے لے چلیں...... میں آپ کی منت کرتی ہوں۔'' اس لڑکی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''دیکھیں...... وہ قلعہ ویسے ہی آسیب زدہ مشہور ہے۔ الیگزینڈر کے جارحانہ انداز سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ وہ خفیہ شیطانی طاقتوں کا مالک ہے۔ آپ کا وہاں جانا بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' ڈیوڈ بولا۔

''میں آکلٹ سائنسز انسٹی ٹیوٹ میں ایگزارسزم کی طالب ہوں۔ اس نے وہ خفیہ شیطانی طاقتیں اسی انسٹی ٹیوٹ سے حاصل کی ہیں۔ ہم ایک ساتھ لیکچرز لیتے رہے ہیں لہٰذا مجھے اس سے بالکل ڈر محسوس نہیں ہو رہا۔ اگر آپ مجھے ساتھ لے جائیں گے تو میں آپ کی حفاظت کر سکوں گی۔'' ازابیلا بولی تو ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا۔

''مگر الیگزینڈر نے مجھے اکیلے آنے کا کہا تھا۔'' وہ شش و پنج میں تھا۔

''آپ اکیلے ہی جائیں گے، اسے یہی ظاہر کریں گے کہ آپ اکیلے آئے ہیں۔ میں آپ سے فاصلہ رکھ کر خاموشی سے اس قلعے میں داخل ہوں گی۔ اسے پتا نہیں چلے گا۔'' ازابیلا بولی۔

ڈیوڈ کچھ دیر سوچنے کے بعد بالآخر راضی ہو ہی گیا۔

وہ ازابیلا کو گھر کے اندر لے آیا اور آگے کا لائحہ عمل طے کرنے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ طے یہ پایا تھا کہ پہلے ڈیوڈ قلعے میں داخل ہو گا اور کچھ وقفے کے بعد ازابیلا اس کے پیچھے داخل ہو گی۔

آگے کیا ہونا تھا، وہ الیگزینڈر کا سامنا کرنے کے بعد ہی پتا چلتا۔ فی الحال قلعے تک پہنچنا ضروری تھا۔ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر قلعے کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

قادر تھامس اور آرتھر صبح سے ہی قلعے میں داخل ہو چکے تھے۔ ارامان کے مطابق وفد کے لوگ ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ تب ہی انہوں نے الیگزینڈر سے چھپنے کے لیے احتیاطاً اسی مقام کا انتخاب کیا جہاں وہ چابی موجود تھی۔ یہ نفلیم جب قلعے میں اترا تھا تو اسے اسی جگہ سلا دیا گیا تھا مگر باقی نفلیم کی طرح اس کا جسم روپوش ہونے کے بجائے ظاہر تھا کیونکہ یہ قلعے کے درمیان میں اترا تھا نہ کہ اس کے اطراف میں موجود زمین پر۔ اسی لیے اسے تہ خانے نما قبر میں سلا کر اس پر تالا ڈال دیا گیا تھا۔

اس کا جسم کھلا ہونے کی وجہ سے اس کی بو میں شدت تھی۔ یہی بو سونگھ کر اکثر عفریت قلعے تک آتے تھے مگر وہ خاص حفاظت کی وجہ سے اس مقام تک نہیں پہنچ پاتے تھے اور اس کی یہی بو آج قادر تھامس کے لیے ڈھال بن گئی تھی کیونکہ اس کی بو کی شدت کی وجہ سے کوئی تھامس اور آرتھر کی وہاں موجودگی محسوس نہیں کر پاتا اور ارامان کے مطابق بھی ان کی حفاظت کرنے والا وفد ان کی مہک کسی تک نہ پہنچنے دیتا۔ لہٰذا یہ تہ خانہ ہی چھپنے کے لیے سب سے بہترین جگہ تھی۔

اب انہیں بے صبری سے الیگزینڈر کی آمد کا انتظار تھا۔ تھامس کو وہاں نیکی کے پہرے داروں کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی مگر انہوں نے آرتھر کے سامنے اس بات کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے آرتھر کو اس چابی کا مقام اور وہاں سوئے نفلیم کے بارے میں آگاہی دے دی تھی۔ ارامان کے مطابق یہ جنگ آرتھر نے ہی لڑنا تھی۔ تھامس

اب تک یہی سوچ کر پریشان تھا کہ آرتھر کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اسے کیا ذمے داری سونپی گئی ہے۔ اسے نہ تو اتنا وقت ملا تھا اور نہ ہی اس مقصد کے بارے میں معلومات تھیں۔ وہ بھلا کیسے بدی کے اس پہرے دار کا مقابلہ کر پاتا جسے برسوں سے تیار کیا جا رہا تھا؟ مگر وہ ارامان کے اس فیصلے کے آگے خاموش تھے۔ ارامان ان سے بہتر جانتے تھے۔

یقیناً آرتھر، الیگزینڈر کا مقابلہ کر سکتا تھا جبھی تو اسے اس ذمے داری کے لیے چنا گیا تھا۔ تھامس کو بس اپنے فرائض پورے کرنا تھے۔

انہیں یہاں پہنچے چند گھنٹے گزر چکے تھے۔ اچانک انہیں قلعے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لڑکیوں کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً الیگزینڈر قلعے میں آ چکا تھا مگر چونکہ وہ چابی کے مقام سے ناواقف تھا لہٰذا ان لڑکیوں کے ساتھ قلعے کے اوپری حصے میں موجود تھا۔ لڑکیاں مسلسل چیخ چلا رہی تھیں۔

”فادر! کیا ہمیں باہر نکل کر ان لڑکیوں کو بچانا چاہیے؟“ آرتھر نے چیخیں سن کر سرگوشی کی۔

”نہیں، ہم خود سے کچھ نہیں کریں گے اور نہ ہی الیگزینڈر وقت سے پہلے انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ یقیناً ان کی قربانی کے لیے انہیں یہاں لے کر آیا ہے مگر وہ بھی صحیح وقت کے انتظار میں ہے۔ جب تک وہ اس مقام کے قریب نہیں پہنچتا جہاں تقلیم سو رہا ہے، ہم بھی خاموشی سے بیٹھے رہیں گے۔“ فادر تھامس بولے تو آرتھر نے سر ہلا دیا۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد ان لڑکیوں کی چیخیں بند ہو گئیں۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکی تھیں یا بے ہوش کر دی گئی تھیں۔ تھامس نے ایک گہری سانس لی۔ اب انہیں ارامان کی طرف سے اشارہ ملنے کا انتظار تھا۔ اس کے بعد ہی وہ کوئی قدم اٹھا سکتے تھے۔

☆☆☆

الیگزینڈر قلعے کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ایلینا اور جینیفر کو ہوش آ چکا تھا اور ان کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ انہیں گھسیٹتا ہوا قلعے کے اندر لے آیا۔

”چپ کرو ورنہ جان سے مار دوں گا۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔“ وہ غرایا۔ اس کا دماغ ان کی چیخوں سے گھوم رہا تھا۔

وہ دونوں سہم کر اس کے ساتھ چلنے لگیں۔ قلعے کے در و دیوار انہیں خوف میں مبتلا کر رہے تھے اور ایلینا کو وہ وقت یاد آ رہا تھا جب وہ انتھونی کے کہنے پر یہاں اکیلی چلی آئی تھی۔ الیگزینڈر نے ان کے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور انہیں دھکے دے کر آگے بڑھا رہا تھا۔ قلعے کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ یہاں سے آگے کا راستہ اسے معلوم نہیں تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر تقلیم کی بو اتنی بڑھ جاتی تھی کہ سارے قلعے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور صحیح مقام کا تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا اور ڈیوڈ اسے اس مقام تک با آسانی لے جا سکتا تھا۔ طلسمان تو اسے اس مقام کے قریب بیٹھ کر ہی پڑھنے تھے جہاں تقلیم سو رہا تھا۔ اس لیے صحیح سمت کا اندازہ کرنا ضروری تھا۔

اب اسے ڈیوڈ کا انتظار تھا۔ تب تک اس نے اپنی تیاریاں مکمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ ایلینا اور جینیفر کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ دونوں تو ویسے ہی چیخ چلا کر تھک چکی تھیں اور وہ جواب دینے کے بجائے انہیں مسلسل دھمکا رہا تھا لہٰذا وہ کہتیں بھی تو کیا کہتیں؟

الیگزینڈر کے آنکھیں بند کرتے ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ ان کے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے مگر پیر کھلے ہوئے تھے۔ وہ آسانی سے یہاں سے فرار ہو سکتی تھیں۔

الیگزینڈر آنکھیں بند کیے جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ کھسکنے لگیں مگر اچانک ہی قلعے میں دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ وہ دونوں گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ قلعے کے در و دیوار سرگوشیوں سے گونجنے لگے۔ اچانک ہی وہ خوفناک عفریت بہت بڑی تعداد میں قلعے کے وسط میں اترنا شروع ہوئے۔

ایلینا اور جینیفر کی چیخیں دوبارہ شروع ہو چکی تھیں۔ وہ عفریتوں کی ایک فوج تھی جو شاید الیگزینڈر کے حکم پڑھنے سے قلعے میں اتر آئی تھی۔ الیگزینڈر نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”انہیں خاموش کرواؤ۔“ اس نے ایک عفریت کو اشارہ کیا۔

وہ الیگزینڈر کا حکم سن کر ایلینا اور جینیفر کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ دونوں غش کھا کر گر چکی تھیں۔ الیگزینڈر نے ان دونوں پر ایک نظر ڈالی اور آسمان کو تکنے لگا۔

”اندھیرا پھیلنے میں کچھ دیر باقی ہے۔ اس مقام کی نشاندہی کرنے والا اندھیرا پھیلنے سے پہلے یہاں آئے گا۔

چابی کا مقام معلوم ہوتے ہی ہم قربانی کی رسم پوری کریں گے۔ ریڈ ڈیول نے کتاب حاصل کر لی ہے کیا؟" وہ ایک عفریت سے مخاطب ہوا۔

"ہاں، کتاب ریڈ ڈیول کے پاس ہے۔ وہ سمیا سے ملنے کے بعد یہیں آئے گا۔" عفریت نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم سب پہرے پر مامور ہو جاؤ۔" ایگزینڈر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے یقین تھا کہ ڈیوڈ ضرور آئے گا اور پھر ملیحا کو معمولی سی تکلیف پہنچا کر ڈیوڈ سے چابی کے مقام کی نشاندہی کروانا بہت ہی آسان تھا۔ حالات اس کے قابو میں تھے۔ وہ عفریتوں کو بھی مدد کے لیے بلا چکا تھا۔ قربانی کی رسم پوری ہوتے ہی یہ عفریت ایڈنبرا کے قصبے پر حملہ کر کے اپنی بھوک مٹانے والے تھے۔ آج کی رات کامیابی اور جشن کی رات تھی۔ وہ اپنے مقصد کے پورا ہو جانے سے بس چند قدم کی دوری پر تھا۔

☆☆☆

Year 1773

الفرافرہ۔ مصر

نیل، عیاد کو لے کر الفرافرہ سے کچھ دور اترا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں ارامان نے اسے پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

"کہاں تلاش کریں الیرا اور یوسف کو؟" عیاد اس عجیب و غریب صحرا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ تا حد نگاہ سنہری ریت اور گولائی میں گھومتی وہ عجیب و غریب چٹانیں۔

"وہ دونوں یہاں نہیں ہیں۔ وہ اس مقام کے قریب ہیں جہاں تعظیم سو رہا ہے۔ ہم ارامان کے ساتھ ہی وہاں تک جائیں گے۔ ان کی دی ہوئی ہر ہدایت پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔" نیل بولا۔

"لیکن تب تک ان دونوں کو کوئی نقصان پہنچا تو؟" عیاد پریشانی سے بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ قربانی کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس سے پہلے وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ ارامان کی بات پر بھروسا کرو۔" نیل نے اسے سمجھایا۔

"کیا انہیں خبر نہیں ہوگی کہ ہم آچکے ہیں؟" عیاد چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں، ہم پر فراعنہ قبیلے کا پہرا ہے۔ جیسے ہم ان کے بہت قریب ہو کر بھی ان کی بو نہیں سونگھ سکتے، اسی طرح وہ بھی ہماری موجودگی کو محسوس نہیں کر سکیں گے۔ یہ سب عہدوں پر منحصر کرتا ہے۔ اگر بدی کی کسی طاقت کا عہدہ اس کے قبیلے میں اونچا ہوگا تو اس کی بو پانا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ اسی طرح نیکی کی طاقتوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ایسی صورت میں یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر ہی مقابلہ کر سکتے ہیں۔" نیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو عیاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب اسے سمجھ آیا تھا کہ وہ حلیمہ کی موجودگی کیوں محسوس نہیں کر پایا تھا۔ یقیناً اس پر کسی طاقتور شیطان کا سایہ تھا۔ جبھی تو وہ ان کے قریب ہوتے ہوئے بھی یوسف اور الیرا کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

نیل چاروں طرف چکر لگا رہا تھا۔ وہ بھی اطراف کا جائزہ لینے کے ارادے سے پلٹا اور اچانک ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کہیں اور کھڑا ہے۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ دیوار گیر الماریوں میں کئی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"نیل...... نیل! کہاں ہو تم؟" وہ نیل کو آوازیں دینے لگا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک درمیانی عمر کا شخص کمرے میں داخل ہوا۔

عیاد چونک کر اسے دیکھنے لگا مگر وہ شخص تو ایسے چل پھر رہا تھا جیسے عیاد کی وہاں موجودگی سے بے خبر ہو۔ وہ شخص اس کی آوازوں کی پروا کیے بغیر کچھ کاغذ سنبھال کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کا قلم تیزی سے ان صفحات پر چل رہا تھا۔

عیاد اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا مگر وہ شخص اپنے کام میں مصروف رہا۔ عیاد کی نظر اس کے سامنے بکھرے کاغذات پر پڑی۔

"شمس المعارف!" عیاد نے چونک کر ایک کاغذ اٹھایا۔ اسے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا۔ وہ شمس المعارف کے اوراق ہی تھے اور وہ شخص یقیناً ابو عباس البونی تھے۔

اسے یہاں کیوں لایا گیا تھا اور اس وقت ہی کیوں؟ یقیناً اسے کوئی اہم اشارہ ملنے والا تھا۔ اس نے تیزی سے وہ اوراق اٹھائے اور ایک ایک کر کے ان پر نظر ڈالنے لگا۔

ابو عباس اب بھی کام میں مصروف تھے۔

اچانک اس کی نظریں چند سطروں پر ٹھہر گئیں۔

"تعظیم!" اس نے صفحے پر تحریر اس لفظ کو دہرایا اور پھر اس کا ذہن اس تحریر کو محفوظ کرنے لگا۔

اچانک ابو عباس نے اس کی طرف ایک کاغذ بڑھایا۔ عیاد کے ہاتھ کانپنا شروع ہو گئے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس کاغذ کو تھاما۔ اس پر بھی ہو بہو وہی تحریر لکھی تھی مگر آخری سطور میں فرق تھا۔

عیاد نے ابو عباس کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر مشفق مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے والے انداز سے آگے بڑھے اور اچانک ہی ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

عیاد نے اس منظے کو دیکھا۔ آخری سطور جیسے اس کے دماغ پر نقش ہو رہی تھیں۔

"عیاد!" اچانک اسے جھٹکا لگا۔ نیل اسے پکار رہا تھا۔ وہ جیسے لمحوں میں اس کمرے سے الفرافرہ میں منتقل ہو گیا۔

"عیاد! ارامان آ رہے ہیں۔" نیل نے اسے مطلع کیا۔

عیاد نے دیکھا، ریگستان میں آندھی چل پڑی تھی۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی۔ عیاد کے لیے آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنے قدم جمائے کھڑا تھا۔

آندھی رکی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صحرا تاحدِ نگاہ سفید لباس میں ملبوس نفوس کی قطاروں سے بھر چکا تھا اور سب سے آگے ارامان کھڑے تھے۔

"خوش آمدید عیاد! فرات سے ملو۔" ارامان نے اپنے پیچھے کھڑی اس فوج کی طرف اشارہ کیا۔

یہ یقیناً ان کا قبیلہ تھا جو اس جنگ میں شامل ہونے پہنچا تھا اور ان کی طاقت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری تیاری سے آئے ہیں۔

"جاؤ زمراج! حالات کا جائزہ لے کر آؤ۔" ارامان اپنے ساتھ کھڑے ایک مضبوط جسامت کے شخص سے مخاطب ہوئے تو وہ ان کی بات سن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"یہ زمراج تھا۔ یہ اس جنگ کی ابتدا سے ہمارے ساتھ ہے۔ پہلے بھی یہ ان کی خبریں نکال لایا تھا اور اب بھی ہمیں وہاں کے حالات سے آگاہ کرے گا۔ شیاطین اس کی موجودگی محسوس نہیں کر پاتے ہیں۔" ارامان نے عیاد کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

عیاد نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ ایک ہی رات میں اس پر بہت کچھ واضح ہوا تھا۔ اسے ان عطاؤں کا مقصد سمجھ آنا شروع ہو چکا تھا۔

چند لمحوں بعد زمراج دوبارہ سے ارامان کے سامنے ظاہر ہوا۔

"وہاں تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ان کی فوج بھی صحرا میں جمع ہے۔ انہیں اس سرخ شیطان کا انتظار ہے۔ وہ الیگزینڈر کے پاس سے ہوتا ہوا سیدھا وہیں پہنچے گا اور اس کے بعد چاند نکلتے ہی وہ قربانی کی رسم کا آغاز کر دیں گے۔"

زمراج بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تو ہم چاند نکلنے سے کچھ دیر پہلے آگے بڑھیں گے۔" انہوں نے پیچھے مڑ کر اپنے قبیلے کو مخاطب کیا۔

"تم تیار ہو عیاد؟" وہ عیاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "تمہارا مقابلہ اس انسان سے ہوگا جس نے اپنی روح اپنی مرضی سے شیطان کے حوالے کر دی۔ اس نے اپنے جسم میں اس شیطانی طاقت کو حلول کرنے کی اجازت دی۔ لہٰذا اس لڑائی کو آسان مت سمجھنا۔ اس کا خاتمہ صرف اور صرف تمہارے ہاتھوں ہی ممکن ہے۔ باقی سب سے ہم خود نمٹیں گے۔

"تم نے اس کا خاتمہ قربانی کی رسم پوری ہونے سے پہلے کرنا ہے ورنہ دوسری صورت میں ظلم جاگ جائے گا اور ہم چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔ بس یہی کر سکیں گے کہ آخری سانس تک لڑتے ہوئے خود کو اس مقصد کے لیے قربان کر دیں۔" ارامان گمبھیر لہجے میں بولے۔

"زمراج کے سفر کی رفتار کیا ہے؟" عیاد ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے یہ عجیب و غریب سوال کر رہا تھا۔

"اس کی رفتار بہت تیز ہے۔ یہ طویل فاصلوں کو لمحوں میں طے کر لیتا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ عیاد کو غور سے دیکھنے لگے۔

"کیونکہ اسے فوراً سفر پر نکلنا ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کیا ہمیں تنہائی مل سکتی ہے؟" عیاد بولا۔

ارامان نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے ان سب کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد دوبارہ ظاہر ہوئے۔

"زمراج! تمہیں فوراً روانہ ہونا ہوگا۔" ارامان ظاہر ہوتے ہی زمراج سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے زمراج کے کان میں کچھ کہا تو وہ ان کی بات سن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

عیاد، ارامان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

ارامان نے شفقت سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور ڈھلتے سورج پر نظریں لگا دیں جو نیکی اور بدی کی سب سے بڑی جنگ کی شروعات کا اعلان کر رہا تھا۔ چاند تو اپنے ساتھ ان میں سے کسی ایک کی جیت کا فیصلہ ساتھ لے کر آنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

انڈیا

الیگزینڈر کو خبر ملی تھی کہ ایک بگھی تیزی سے قلعے کی طرف آ رہی ہے۔ الیگزینڈر سمجھ گیا کہ ڈیوڈ پہنچنے والا ہے اور

urdunovels.com

ایسا ہی ہوا۔

وہ بگھی قلعے کے قریب آ کر رک گئی۔ ڈیوڈ اکیلا اس بگھی سے اترا اور قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ ازابیلا اس کے ساتھ ہی تھی مگر وہ بگھی میں چھپ کر بیٹھی رہی۔

ڈیوڈ پہلے بھی فادر تھامس کے ساتھ قلعے میں آ چکا تھا اور جانتا تھا کہ الیگزینڈر کہاں موجود ہو گا۔ وہ اسی فوارے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں اس تہہ خانے کا روپوش دروازہ تھا۔ اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ الیگزینڈر وہیں موجود تھا۔ ایک طرف ایلینا اور ایک چھوٹی لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ شاید وہی ازابیلا کی بہن جینیفر تھی۔

"آؤ ڈیوڈ! مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ کافی عقلمند ہو تم۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے نہ آنے سے ایلینا کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔" الیگزینڈر بولا تو ڈیوڈ اپنے دانت پیس کر رہ گیا۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟ ایلینا کو کوئی نقصان مت پہنچانا۔" ڈیوڈ سخت لہجے میں بولا۔ الیگزینڈر اس کی بات سن کر ہنسنے لگا۔

"اگر میں نے نقصان پہنچا بھی دیا تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب تک تو تمہیں سمجھ آ ہی گیا ہو گا کہ میں کوئی عام انسان نہیں ہوں۔" الیگزینڈر ہنستے ہوئے بولا۔

"میں سمجھ چکا ہوں کہ تم انسان ہی نہیں ہو۔ تم شیطان ہو۔" ڈیوڈ غصے سے بولا۔

"بالکل صحیح پہچانا تم نے۔ چلو، اب جلدی سے مجھے اس چابی کا مقام دکھاؤ اور اس کے بعد یہاں سے چلتے بنو۔" الیگزینڈر سخت لہجے میں بولا۔

"کون سی چابی؟ میں کسی چابی کا مقام نہیں جانتا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" ڈیوڈ تیز لہجے میں بولا۔

الیگزینڈر نے اس کی بات سن کر اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا تو اچانک ہی وہ تمام عفریت جو ڈیوڈ کے آنے پر وہاں سے غائب ہو گئے تھے، دوبارہ سے ظاہر ہو گئے۔ ڈیوڈ گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔ قلعے میں چاروں طرف خون آشام بلائیں کھڑی اپنے دانت کوس رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ سب دکھانے کے بعد اب تمہیں زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں ایلینا کے ساتھ تمہارا بھی خاتمہ کر دوں۔ اگر تم مجھے اس چابی کا مقام بتا دیتے ہو تو ایلینا کو ساتھ لے جا سکو گے ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" الیگزینڈر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ڈیوڈ کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ الیگزینڈر اس قدر خطرناک انسان ہے۔

"یہ دیکھو، اسے جانتے ہو؟ یہ اسی عفریت کے قبیلے سے ہے جس نے ایلینا کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا...... کیا تم چاہتے ہو کہ وہ دوبارہ اسی تکلیف سے گزرے؟" الیگزینڈر اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ ڈیوڈ کو ہر قسم کا دباؤ ڈال کر مجبور کر دینا چاہتا تھا۔

ڈیوڈ نے دیکھا، وہ انتہائی خوفناک اور طاقتور قسم کا عفریت تھا۔ بات اگر ڈیوڈ کی زندگی کی ہوتی تو شاید وہ مر کر بھی اسے چابی کا مقام نہ بتاتا مگر ایلینا کی وجہ سے وہ خود کو مجبور محسوس کر رہا تھا۔

اچانک ڈیوڈ کے پیچھے آہٹ ہوئی۔ الیگزینڈر نے دیکھا ایک عفریت بے ہوش لڑکی کو گود میں اٹھائے ڈیوڈ کے پیچھے ظاہر ہوا۔

"اس کے ساتھ کوئی لڑکی آئی تھی جو بگھی میں چھپی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی بو محسوس ہوئی تو میں اس تک پہنچ گیا۔ یہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی۔" عفریت نے اس لڑکی کو زمین پر لٹاتے ہوئے الیگزینڈر کو مطلع کیا۔

ڈیوڈ نے افسوس سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ لڑکی تو اسے کہہ رہی تھی کہ اس نے الیگزینڈر کے ساتھ ہی جادو اور ایگزارسزم سیکھا تھا مگر یہ تو عفریت کی ایک جھلک پا کر ہی بے ہوش ہو چکی تھی اور اب اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

الیگزینڈر غصے سے ڈیوڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ اکیلے آنا۔ کسے ساتھ لے کر آئے ہو؟" الیگزینڈر غصے سے چلایا اور پھر اس کی نظر بے ہوش ازابیلا پر پڑی۔ وہ یقیناً الیگزینڈر کی سچائی جان چکی تھی جبھی تو ڈیوڈ کے ساتھ قلعے تک چلی آئی تھی۔

ازابیلا کو وہاں دیکھ کر الیگزینڈر کو شدید غصہ آیا تھا۔ وہ تیزی سے ڈیوڈ کی طرف بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر اس کے منہ پر ایک مکا جڑ دیا۔

"اب میں تمہیں دکھاؤں گا کہ مجھے دھوکا دینے کا کیا انجام ہوتا ہے۔" الیگزینڈر یہ کہہ کر جارحانہ انداز میں ایلینا کی طرف بڑھا۔

ایلینا بے ہوش تھی مگر الیگزینڈر کے اشارہ کرتے ہی اس کے جسم نے تڑپنا شروع کر دیا۔ اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آئی اور اچانک اس کے حلق سے خوفناک چیخیں بلند

urdunovels.com

ہوا شروع ہو گیا۔

"رو...... مت کرو...... لیلیا کو چھوڑ دو......

میں...... میں تمہیں چابی کا مقام بتانے کے لیے تیار ہوں۔"

ڈیوڈ فوراً ہی مان گیا۔

الیگزینڈر کے ہوا میں بلند ہاتھ رک گئے۔

"جلدی کرو۔ میرا وقت ضائع مت کرو۔" الیگزینڈر اب ڈیوڈ کو ذرا سی بھی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"یہ...... یہاں سے اس تہ خانے کا راستہ جہاں پر وہ چابی موجود ہے۔" ڈیوڈ کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس نے فوارے کے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو، آگے بڑھو اور مجھے وہ خفیہ دروازہ کھول کر دکھاؤ۔" الیگزینڈر سخت لہجے میں بولا تو ڈیوڈ آگے بڑھ کر اس فوارے کی منڈیر سے اندر اتر گیا۔ اس نے مطلوبہ جگہ پہنچ کر تماس کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس راستے کو کھول دیا۔

الیگزینڈر نے دیکھا، اس خفیہ دروازے سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔

"ان دونوں لڑکیوں کو تہ خانے میں لے آؤ اور یہ لڑکی جو اس کے ساتھ آئی ہے، اسے یہیں چھوڑ دو۔ تم میں سے کچھ میرے ساتھ تہ خانے کے اندر رکیں گے اور باقی باہر پہرا دیں گے۔" الیگزینڈر نے ان عفریتوں کو ہدایت دے کر ڈیوڈ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

ڈیوڈ آگے چلنے لگا، الیگزینڈر اس کی پیروی کر رہا تھا۔ چند عفریت بھی ان کے پیچھے ہی اس تہ خانے میں اتر آئے۔ بدبو شدید ہو گئی تھی۔

"کہاں ہے چابی؟" الیگزینڈر، ڈیوڈ سے مخاطب ہوا۔

"وہ وہاں...... سامنے جو تابوت رکھا ہے، اس میں ایک کتاب ہے۔ چابی اس کے اندر رکھی ہے۔" ڈیوڈ بولا۔

الیگزینڈر نے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ یہ بھی وہ جگہ جس کا پتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے نہ جانے کتنے ہی کے کتنے پہرے دار مارے گئے تھے مگر وہ اس چابی تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ تہ خانے میں پھیلی بو اس بات کا اشارہ تھی کہ طلسم ٹوٹ رہا ہے۔

ایک عفریت آگے بڑھ کر ڈیوڈ کو پکڑ چکا تھا۔ الیگزینڈر کو اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تابوت کے قریب چلا آیا اور اسے کھول دیا۔

اندر ایک پرانا ڈھانچا تھا جس نے کتاب تھام رکھی تھی۔ الیگزینڈر نے ہاتھ بڑھا کر اس کتاب کو اٹھانے کی کوشش کی مگر اسے شدید جھٹکا لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"دھیان سے الیگزینڈر! جلدی مت کرو۔" اچانک ہی تہ خانے میں ریڈ ڈیول کی آواز گونجی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ ریڈ ڈیول آ چکا تھا۔

"مبارک ہو۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔" وہ الیگزینڈر کو اپنی طرف متوجہ پا کر خباثت سے مسکرایا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے کتاب حاصل کر لی ہے۔" الیگزینڈر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"ہاں، میں تمہیں اس تحریر کی نقل دینے آیا تھا۔ تم تیاری شروع کرو۔ چاند نکلنے والا ہے۔" ریڈ ڈیول بولا۔

"اور اس چابی کا کیا کروں؟ اس پر سخت حصار ہے۔" الیگزینڈر بولا۔

ریڈ ڈیول چلتا ہوا تابوت تک آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کتاب اٹھائی اور کتاب کے صفحے پلٹ کر چابی نکال کر الیگزینڈر کے سامنے لہرانے لگا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ ہر کام عہدے کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ جو حصار اس پر لگا تھا، اسے تم توڑ نہیں سکتے تھے مگر میں نے توڑ دیا لیکن میں اس چابی کو تلاش نہیں کر پایا تھا۔ لہٰذا اس کامیابی کا سہرا صرف اور صرف تمہارے سر ہے۔ اب تم قربانی کی تیاری کرو۔ میں چلتا ہوں۔ آج رات جشن کے دوران ملیں گے۔" وہ یہ کہہ کر وہاں سے غائب ہو گیا۔

الیگزینڈر نے ایک گہری سانس لے کر چابی کو دیکھا اور اس تحریر پر نظر دوڑانے لگا۔

"ان دونوں کو یہاں لٹا دو اور الاؤ روشن کرو۔" الیگزینڈر نے ایک عفریت کو ہدایت کی اور خود اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں طلسم سو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تہ خانے میں "کلک" کی آواز گونجی۔

اندھیرے ستون کے پیچھے چھپے تماس نے افسوس سے سر ہلایا۔ الیگزینڈر تالا کھول چکا تھا۔ بس اب طلسم کو جاگنے کی دیر تھی اور یہاں قیامت برپا ہونے والی تھی۔

"یا خدا! ہماری مدد کیجیے۔" تماس دل ہی دل میں دعا کرنے لگا۔ اچانک تماس کے سامنے زوراج ظاہر ہوا۔ وہ اور آرتھر چونک پڑے۔ زوراج نے انہیں اشارے سے خاموش رہنے کا کہا۔

"وہ کیا کر رہا ہے؟" عفریت اب ڈیوڈ کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔

urdunovels.com

"اسے یہیں کہیں باندھ دو۔ قربانی کے بعد تمہاری خوراک میں کام آئے گا۔" الیگزینڈر حقارت سے بولا اور کاغذ پر لکھی تحریر پر متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

سنگھیا کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک آسمان پر چاند ظاہر ہوا۔ رسم کا وقت آچکا تھا۔ اس نے وہ کاغذ کھول کر منتر پڑھنا شروع کیے۔

Year 1773

ایڈنبرا

الیگزینڈر الاؤ کے پاس آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

"چاند ظاہر ہو گیا ہے۔" اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ اس نے ریڈ ڈیول کا دیا گیا کاغذ اپنے سامنے رکھا اور اس پر لکھی تحریر کو دہرانا شروع کیا۔

Year 1773

الفرافرہ۔ مصر

صحرا کے بیچوں بیچ الاؤ جل رہا تھا اور فرّاش اس الاؤ کے پاس کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اس کے قبیلے کے شیاطین کثیر تعداد میں موجود تھے۔

ایک طرف الیگزینڈر اور یوسف بے ہوش پڑے تھے۔

فرّاش کی نظریں چاند پر تھیں۔ وہ چاند نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک صحرا کی ہوا تیز ہو گئی۔ سرخ شیطان اس کے سامنے ظاہر ہوا اور اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

"میں الیگزینڈر اور سنگھیا کو طلسمان کی نقل دے آیا ہوں۔ چاند نکلنے ہی والا ہے۔ کیا تم تیار ہو؟" وہ فرّاش سے مخاطب ہوا۔ فرّاش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے بھی فرّاش کے ساتھ ہی آسمان پر نظریں لگا دیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی آسمان پر چاند نمودار ہوا۔ ان دونوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

فرّاش نے کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھ لی۔ اس نے کتاب پر لکھی تحریر کو دہرانا شروع کیا۔ اچانک ہی صحرا میں تیز آندھی چل پڑی۔ ریڈ ڈیول اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

صحرا میں پھیلا وہ گرد وغبار کا طوفان اس بات کا ثبوت تھا کہ فرات قبیلہ ایک بار پھر سے اس کے سامنے کھڑا ہونے والا ہے۔ اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں نمودار ہوئے تھے۔ عیاد کے ساتھ فرات قبیلے کی فوج بڑی تعداد میں دشمن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یعنی اس جنگ کا وقت آچکا تھا۔

"تم طلسمان مکمل کرو، ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ طلسمان نہیں رکنا چاہیے۔" ریڈ ڈیول نے یہ کہہ کر اپنی فوج کو اشارہ کیا۔

صحرا میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ ایک طرف عیاد، ارامان اور نیل کھڑے تھے اور ان کے پیچھے فرات قبیلہ تھا۔ دوسری طرف ریڈ ڈیول اور اس کی فوج تھی۔

"آؤ ارامان! آؤ...... تم سے تو بہت سارے حساب چکانے ہیں۔ تمہاری وجہ سے میں نے اپنا عہدہ کھو دیا تھا اور اب تمہارا خاتمہ کر کے میں اس سے بھی بہتر عہدے پر فائز ہو جاؤں گا۔" ریڈ ڈیول، ارامان کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ اس بار بھی تم کامیاب ہونے والے ہو۔" ارامان مسکرائے۔

"تم شاید بھول چکے ہو کہ کتاب اب ہمارے پاس ہے۔ کچھ ہی دیر میں عظیم جاگنے والے ہیں اور فرّاش تک پہنچنے کے لیے تمہیں ہم سے لڑنا ہوگا۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے پاس اتنا وقت نہیں بچے گا۔" ریڈ ڈیول مسکرایا۔

"کتاب تو تمہارے پاس پہلے بھی تھی۔ کتاب کا ایک نسخہ تو تمہارے پاس ہی رہ گیا تھا، تب بھی تم یہ سب نہیں کر پائے۔" ارامان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میں جانتا تھا کہ تمہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ ہمارے پاس جو نسخہ تھا، اس میں عظیم کو جگانے کی وہ تحریر موجود ہی نہیں تھی۔ جبھی ہم اتنے سالوں سے اس کتاب کے پیچھے تھے اور تم نے یہ جو نیا پہرے دار بلایا ہے، یہ تو کسی کام کا نہیں۔ اس سے کتاب حاصل کرنا بہت آسان تھا۔ تم پہرے داروں کی پہچان کرنا بھول گئے ہو اور اب تمہیں اس کا خمیازہ اپنی موت کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔ دنیا پر ایک بار پھر سے ہمارا قبضہ ہوگا۔" ریڈ ڈیول یہ کہہ کر قہقہے لگانے لگا۔

"تو چلو پھر جنگ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ موت آئی تو کم از کم بہادری اور ایمان کے ساتھ آئے گی۔" ارامان نے یہ کہہ کر فرات قبیلے کو اشارہ کیا۔

وہ سب ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ عیاد بھی تلوار چلاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا مقصد فرّاش تک پہنچنا تھا تاکہ کسی طرح طلسمان ختم ہونے سے پہلے وہ اس کا خاتمہ کر سکے مگر یہ ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔

چاروں طرف گھمسان کی جنگ تھی۔ فنواش نے اپنی ساری توجہ صرف اور صرف طلسمان مکمل کرنے پر مرکوز کر رکھی تھی۔ طلسمان مکمل ہونے والا تھا۔ بس چند لمحے اور...... پھر طلسم جاگ جاتا اور فنواش قربانی کی رسم پوری کر دیتا۔ اس بار یہ جنگ وہی جیتنے والے تھے۔

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

ابھی سنگھیا کے منتر جاری ہی تھے کہ قلعے کا بھاری دروازہ ایک دھماکے سے ٹوٹ کر دور جا گرا۔ سنگھیا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ قلعے کے داخلی راستے پر ایک عجیب و غریب حلیے والا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے بال لمبے اور گھنگرالے تھے اور اس کی ایک آنکھ خراب لگتی تھی۔ وہ سنگھیا کو گھور رہا تھا۔ سنگھیا منتر چھوڑ کر اٹھ نہیں سکتا تھا۔ وہ منتر جاری رکھتے ہوئے اس شخص کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک ہی اس عجیب و غریب شخص کے پیچھے جنات کی ایک فوج نمودار ہوئی۔ سنگھیا نے عفریتوں کو اس پر حملے کا اشارہ کیا۔ وہ حملہ کر چکے تھے مگر وہ آدمی بغیر کسی رکاوٹ کے تیزی سے سنگھیا کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ سنگھیا اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر منتر نہیں روکے تھے۔ اس شخص کے راستے میں جو بھی آ رہا تھا، اڑ کر دور گر رہا تھا۔

Year 1773

ایڈنبرا

اچانک تہ خانے کے اندھیرے حصے سے کسی کے قدموں کی آواز ابھری۔ الیگزینڈر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے تھامس اور آرتھر کھڑے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ وہ ان کی بو کیوں نہیں محسوس کر پایا تھا۔

اس نے عفریتوں کو اشارہ کیا مگر اچانک ہی سارا تہ خانہ گڑگڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ ان پر حملہ ہوا تھا۔ عفریت مقابلہ کرنے کے لیے تہ خانے سے باہر نکلنے لگے۔ ایک عفریت تھامس اور آرتھر کی طرف بڑھا۔

"تم جاؤ، الیگزینڈر سے نمٹو۔ اس سے میں نمٹ لوں گا۔" تھامس نے آرتھر کو اشارہ کیا۔

آرتھر تیزی سے الیگزینڈر کی طرف بڑھا مگر ایک عفریت اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ الیگزینڈر نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ طلسمان مکمل ہونے والے تھے۔ آرتھر سے تو وہ بعد میں بھی نمٹ سکتا تھا۔

Year 1773

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مارچ کے شمارے

کی دل لبھاتی جھلک

اولین صفحات

موسم میں تبدیلی آئی ہے۔ سنگتی دھوپ کے بعد بہار کی سرشاری۔ مگر سیاست و معاشرت کے وجود میں افلاس کی بہبود کے علاوہ سب موجود ہے۔ درد و کرب میں ادبی سیاسی کہانی کے نشیب و فراز پروین زبیر کے قلم سے

سرورق

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کرداروں کی پُراسرار داستان...... طاہر جاوید مغل کے قلم سے

نہر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا سامنا کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی دوڑ دھوپ... حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

پھر حقیقتیں آسیب کی طرح چمٹ جاتی ہیں...... ایک دن کی مسافت پر مشتمل شکار اور شکاری کا ٹکراؤ...... عائشہ منصور کی کاوش

دوسرا رنگ

ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ رونما ہونے والے خوفناک واقعے کی روداد...... محمد فاروق انجم کی جیتی کہانی

الغردقہ، مصر

"طلسمان مکمل ہو چکا ہے۔" اچانک اس گھمسان کی جنگ کے دوران فزراش کی آواز گونجی اور صحرا میں سکوت چھا گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ عیاد جو فزراش کے قریب پہنچنے ہی والا تھا، اس کا یہ فقرہ سن کر وہیں جم گیا۔

وہ ناکام ہو گیا تھا۔

فزراش کو طلسمان مکمل کرنے سے پہلے ہی ختم کرنا تھا۔

ظلیم جاگ چکے تھے...... نیکی کو شکست ہوئی تھی۔

عیاد نے صدمے کی کیفیت میں ارامان کی طرف دیکھا۔

وہ اطمینان سے کھڑے تھے۔

"ہاہاہا...... ہاہاہا...... ہم...... ہم کامیاب ہو گئے...... ظلیم جاگ گئے۔ اب تم سب مارے جاؤ گے۔ قربانی کی رسم پوری کرو۔" ریڈ ڈیول نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

"اب دنیا پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ہاہاہا...... ہاہاہا......" ریڈ ڈیول مسلسل قہقہے لگا رہا تھا۔

اچانک وہ ایک احساس کے تحت پلٹا اور ارامان کی طرف دیکھنے لگا۔

ارامان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کہاں ہے ظلیم؟ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا؟ کہاں ہے وہ آندھی...... وہ تباہی اور وہ دیا جو اس کے جاگتے ہی پھیل جاتی تھی؟" وہ اطمینان سے مسکرائے۔

"کک...... کیا مطلب؟" ریڈ ڈیول نے پلٹ کر اس مقام کو دیکھا جہاں ظلیم سو رہا تھا۔ وہاں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ نہ کوئی بجلی کڑکی تھی۔ آسمان بالکل صاف پڑا تھا۔ وہ جاگ کیوں نہیں رہا تھا؟ اس بار تو شیطانوں کی فوج نیکی کی فوج سے پہلے ان تک پہنچی تھی۔ ان کی نیند اب ٹوٹ جانا چاہیے تھی۔ ان کے جاگنے کی نشانیاں ظاہر ہوتے ہی قربانی کی رسم ادا کی جاتی مگر ایک بھی نشانی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔

وہ دوبارہ ارامان کی طرف پلٹا۔

"کتاب ہمارے ہی پاس ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اتنے سالوں سے تیاری کر رہے تھے تو ہم بے خبر تھے؟ کیا ہم نہیں جانتے تھے کہ تمہارے پاس کتاب کا وہ نسخہ موجود نہیں جس میں ظلیم کو جگانے کے طلسمان لکھے ہیں؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں یہ کتاب اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ میں آنے دوں گا؟ میں نے عیاد کو جو نسخہ دیا تھا، اس میں، میں نے اپنے ہاتھ سے ایک طلسمان تحریر کیا تھا جو ظلیم کو جگانے کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے مدد بلانے کے لیے تھا۔ تمہیں بھی لگا کہ تم کامیاب ہو رہے ہو اور ہم نے تمہیں کامیاب ہونے دیا کیونکہ اب تمہارا سامنا کرنا اور تمہارا خاتمہ کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ بہت عرصے سے پیچھے کی تکمیل جاری تھی۔ آج نہ صرف تم بلکہ تمہاری یہ خبیث روح اور زمین میں دفن یہ نحوست بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔" ارامان بولے اور اچانک ہی صحرا شدید گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔

وہ نہ جانے کون تھے اور کہاں سے آئے تھے مگر لاکھوں کی تعداد میں انہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"یہ تمہاری فوج سے نمٹیں گے مگر تمہارا خاتمہ میں اپنے ہاتھ سے کروں گا۔ عیاد! تم فزراش کا خاتمہ کر کے وہ طلسمان مکمل کرو جو ابو عباس نے تمہیں پڑھایا ہے۔" وہ عیاد سے مخاطب ہو کر ریڈ ڈیول کی طرف بڑھے۔

آسمان سے آنے والی وہ مدد لاکھوں کی تعداد میں ان شیطانوں پر ٹوٹ پڑی۔ صحرا میں گھمسان کی جنگ جاری تھی۔

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

سنگھیا کے منتر مکمل ہو چکے تھے۔ اس کی طرف تیزی سے بڑھنے والا وہ عجیب و غریب شخص چند لمحے کے لیے رکا۔ سنگھیا کے قہقہے بلند ہونے لگے۔

"تم جو بھی ہو، تمہارا آنا بیکار گیا۔ منتر مکمل ہو چکے ہیں۔ اب میں تمہارا خاتمہ اپنے ہاتھوں سے کروں گا۔" وہ یہ کہہ کر تیزی سے اس عجیب و غریب شخص کی طرف بڑھا۔

ابو ہریرہ اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اچانک اس کے سامنے زمزاج نمودار ہوا۔

"معاف کیجیے گا، مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی مگر میں آپ کے لیے بہت ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔" زمزاج، ابو ہریرہ سے مخاطب ہوا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر ابو ہریرہ کے کان میں کوئی بات کہی اور لمحوں میں وہاں سے غائب ہو گیا۔ ابو ہریرہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اچانک ہی وہ علاقہ تیز گڑگڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ سنگھیا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لاکھوں کی تعداد میں جنات کی ایک فوج ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ پورے راج گڑھ کو لمحوں میں ختم کر سکتی تھی۔

"لگتا ہے تمہارے منتر الٹے پڑ گئے ہیں۔" وہ شخص مسکرایا۔

سنگھیا نے حیرت سے پہلے اس فوج کو اور پھر اس شخص کو دیکھا۔

راج گڑھ پر جن شیطانوں کا قبضہ تھا، وہ پہلے ہی اس شخص کے ساتھ آنے والی فوج سے مقابلہ کر رہے تھے مگر اب

ودوان کے لیے بھیجی گئی تھی، اس سے مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

"کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟" شمس یا غصے سے چلایا۔

"میرا نام ابو ہریرہ ہے اور یہ نام تم جہنم کی وادیوں میں بھی یاد رکھو گے۔" یہ کہہ کر اس شخص نے اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کیے۔

راج گڑھ میں گھمسان کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔

Year 1773

ایڈنبرا

طلسمان مکمل کرتے ہی الیگزینڈر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ آرتھر اور تھامس ابھی تک ان عفریتوں سے نمٹنے میں ہی مصروف تھے اور وہ تقلیم کو جگا چکا تھا۔ اس کی جیت ہو چکی تھی۔

"رک جاؤ۔ ان کا انجام اب تقلیم کے ہاتھوں ہوگا۔ قربانی کی رسم پوری کرو۔" الیگزینڈر چلا کر عفریتوں سے مخاطب ہوا۔ اچانک قلعہ خوفناک گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔

"تقلیم جاگ چکا ہے۔" الیگزینڈر مسکرایا مگر اچانک ہی چاروں طرف سے عفریتوں کی چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" الیگزینڈر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہاری موت کا انتظام ہو رہا ہے۔" تھامس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ الیگزینڈر نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"تم نے تقلیم کو نہیں جگایا بلکہ ہمارے لیے مدد بلوائی ہے۔" تھامس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ الیگزینڈر اس کی بات سن کر تیزی سے تہ خانے سے باہر کی طرف بھاگا۔ تہ خانے میں موجود عفریت بھی اس کے پیچھے نکل گئے۔

"فادر! یہ تو بھاگ گیا ہے۔" آرتھر بولا۔

"فکر نہیں کرو۔ یہ اس قلعے سے باہر نہیں نکل پائے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔" تھامس نے الاؤ کے پاس رکھی وہ چابی اٹھائی جو الیگزینڈر وہیں بھول گیا تھا اور آرتھر کو ساتھ لے کر اس تابوت کی طرف بڑھا۔

اس نے تابوت میں رکھی کتاب اٹھا کر ہاتھ میں پکڑی اور چابی دوبارہ اس کے اندر رکھ دی مگر کتاب کو دوبارہ تابوت میں رکھنے کے بجائے بغل میں دبا لیا۔

"فادر! یہ......" آرتھر نے کچھ کہنا چاہا مگر تھامس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی...... یہ لو۔"

تھامس نے تابوت کے دائیں طرف رکھی ایک چمکدار تلوار نکال کر آرتھر کو تھمائی۔

"جاؤ آرتھر! مقابلے کا وقت آ چکا ہے۔ اس کا خاتمہ تمہارے ہاتھوں ہی ہونا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ تمہارا امتحان بھی ہے اور نئے سفر کی شروعات بھی...... اسے ختم کرتے ہوئے تم نے بالکل نہیں گھبرانا کیونکہ وہ خود اپنی روح شیطان کے حوالے کر چکا ہے اور تم ایک انسان کا نہیں بلکہ ایک شیطان کا خاتمہ کرو گے۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

آرتھر نے ایک نظر تلوار پر ڈالی اور لمحے کی دیر کیے بغیر تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل گیا۔

تھامس نے احتیاط سے تابوت کو دوبارہ بند کر دیا۔

"ڈیوڈ! تم ان دونوں بچیوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔" فادر تھامس نے وہاں بندھے ڈیوڈ کو رسیوں سے آزاد کرتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

وہ آزاد ہوتے ہی تیزی سے ایلیا اور جینفر کی طرف بڑھ گیا۔ تھامس نے پلٹ کر اس تقلیم پر نظر ڈالی جو اب سے تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہونے والا تھا۔

"تمہیں جہنم رسید کرنے کا وقت آ گیا ہے۔" تھامس نے آنکھیں بند کر کے وہ الفاظ دہرانا شروع کیے جو اب سے کچھ دیر پہلے زمراج انہیں بتا کر گیا تھا۔

آرتھر، الیگزینڈر کو ڈھونڈتے ہوئے باہر نکلا۔ قلعے میں جنگ کا سا سماں تھا۔ نیکی اور بدی کی طاقتوں میں خوفناک لڑائی جاری تھی۔ اس کے سامنے کئی عفریت ڈھیر ہو کر دھوئیں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ان سے لڑنے والے سفید روشنی کے مانند تھے۔ وہ حیرت سے اس منظر کو دیکھنے لگا۔

"مجھے ڈھونڈ رہے ہو؟" اچانک اسے پیچھے سے الیگزینڈر کی آواز سنائی دی۔

وہ پلٹا۔ الیگزینڈر نے ازابیلا کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔

"ازابیلا......! چھوڑ دو ازابیلا کو۔" آرتھر چلایا۔

اسے ازابیلا کو وہاں دیکھ کر دھچکا لگا تھا۔

"آرتھر...... آرتھر......!" ازابیلا مدد کے لیے چلائی۔

"اگر تم یا تمہارے ان ساتھیوں میں سے کوئی میرے قریب بھی آیا تو میں اسے ختم کر دوں گا۔" الیگزینڈر چلایا۔

"الیگزینڈر! تمہاری لڑائی مجھ سے ہے۔ ازابیلا کو چھوڑ دو۔" آرتھر چلایا۔

"لڑائی اور تم سے؟ تم ہو کون؟ ایک معمولی سے طالب علم! دیکھو...... تھامس سے کہو مجھے جانے دے۔ میں یہاں سے نکلتے ہی ازابیلا کو آزاد کر دوں گا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ

urdunovels.com

اور تھا اس کو بلا کر لاؤ۔ تم سے تو مسز مارتھا کی حماقت نہیں ہوئی۔ تمہاری جگہ اس بڑھیا کی جان لینا پڑ گئی۔ مجھ سے لڑو گے تم؟'' الیگزینڈر حقارت سے چلایا۔

اس کی بات سن کر آرتھر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''آج تمہاری لڑائی اس معمولی طالب علم سے ہی ہوگی الیگزینڈر، اور میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتاروں گا۔'' آرتھر غراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور تلوار سے اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر الیگزینڈر نے ازابیلا کو ڈھال بنا کر اس کے حملے سے بچتے ہوئے اسے ایک لات رسید کی۔

آرتھر الٹ کر ایک طرف جا گرا۔ الیگزینڈر کے قہقہے گونج اٹھے۔ آرتھر نے تلوار کو دوبارہ تھاما اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر اٹھتے ہی اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

اس کے سامنے دو الیگزینڈر موجود تھے۔ دونوں نے ازابیلا کو پکڑ رکھا تھا اور دونوں ہی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''کیا ہوا، رک کیوں گئے؟ آؤ حملہ کرو مجھ پر۔'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے اور قہقہے لگانے لگے۔

''آرتھر...... آرتھر! یہ ہے اصلی الیگزینڈر!''

اچانک ازابیلا چلائی۔

''نہیں آرتھر......! یہ ہے الیگزینڈر......!'' دوسری ازابیلا بھی چلائی۔

آرتھر کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ یقیناً ان میں سے ایک الیگزینڈر کا ہمزاد تھا۔ بالفرض وہ غلطی سے پہلے ہمزاد پر حملہ کر دیتا تو یقیناً اس کے ہاتھوں مارا جاتا اور اگر حملہ اصل الیگزینڈر پر کرتا تو ہمزاد بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا۔

آرتھر کے لیے یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ اس نے لمحے بھر کو اپنی آنکھیں بند کیں۔

بچپن، چرچ، وہ بدروح، مسز مارتھا...... سب کچھ اس ایک لمحے میں سمٹ کر اس کے ذہن کے پردے پر ظاہر ہونا شروع ہوا۔

اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

الیگزینڈر قہقہے لگا رہا تھا۔ ازابیلا چلا رہی تھی۔ چاروں طرف دھواں، شور، گھمسان کی لڑائی...... اچانک اس کے اردگرد سکوت چھا گیا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ان دو افراد کی آنکھوں میں جھانکا اور فیصلہ کر کے تیزی سے دائیں طرف کھڑے الیگزینڈر تک دوڑتا ہوا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، اس نے دائیں کے بجائے بائیں طرف کھڑے الیگزینڈر پر تلوار چلائی۔

خون کا ایک فوارہ بلند ہوا۔ الیگزینڈر نے کراہتے ہوئے ازابیلا پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ ازابیلا نے اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے الیگزینڈر کی پسلی میں کہنی رسید کی۔ اس کی گرفت مزید ڈھیلی ہوئی۔ ازابیلا نے جلدی سے خود کو آزاد کرایا اور الیگزینڈر کے سامنے سے ہٹ گئی۔

آرتھر تلوار لہراتے ہوئے الیگزینڈر کی طرف بڑھا اور تلوار کو پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ تیز بجلی کوندی۔ الیگزینڈر گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا ہمزاد چیختے ہوئے دھواں بن کر تحلیل ہو رہا تھا۔ دوسری ازابیلا غائب ہو چکی تھی۔

الیگزینڈر کی آنکھوں کے سامنے جہنم کے دربان موجود تھے جو اسے آگ کی بھٹی میں لینے آئے تھے۔ ازابیلا نے یہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شیطان کو ایک بار پھر شکست ہوئی تھی۔

☆☆☆

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

راج گڑھ کا وہ قلعہ کسی جنگ کا اختتامی منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کی دیواریں مختلف جگہوں سے ٹوٹ چکی تھیں اور جگہ جگہ سے دھواں ابھی اٹھ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ شیطان کو شکست ہوئی تھی۔

ابوہریرہ نے زمزاج کے بتائے گئے طلسمات پڑھ کر اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے ظلم سے پاک کر دیا تھا۔

ابوہریرہ اور مان سنگھ، سنکھیا کی لاش کے قریب کھڑے تھے۔ ان کی رعایا پر ہوا جادو ٹوٹ چکا تھا اور اب وہ سب اپنا بچا کھچا سامان سمیٹ رہے تھے۔ جن کے گھر، پریوار والے، سنکھیا کے عتاب کا نشانہ بنے تھے اور مارے گئے تھے، وہ ان کی لاشوں کے سامنے بیٹھے بین کر رہے تھے۔

پاروتی، رتناوتی اور راگنی کو اپنے سینے سے لپٹائے کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی صدمے کے آثار تھے۔

''میں نہیں جانتا آپ کون ہیں مگر میں جیون بھر آپ کا آبھاری رہوں گا۔ آپ نے ہماری اس شیطان سے رکھشا کی اور اس کا انت کیا۔'' مان سنگھ ہاتھ جوڑتے ہوئے ابوہریرہ سے مخاطب تھے۔

ابوہریرہ نے ہاتھ بڑھا کر ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو نیچے کر دیا۔

"یہ میرا فرض تھا۔ ہاتھ جوڑنے ہی ہیں تو آسمان والے کے سامنے جوڑیں۔ وہی ہم سب کا مددگار ہے۔ سنگھیا نے آپ کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ بس مجھے یہ افسوس رہے گا کہ مجھے آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔" ابوہریرہ نے دکھ سے قلعے میں پھیلی لاشوں پر نظر دوڑائی۔

"آپ بتائیے، میں آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں؟" مان سنگھ اس شخص کی کرامات دیکھ چکے تھے۔ اس کے ساتھ جو مدد نازل ہوئی تھی، اسی نے سنگھیا کی اس شیطانی فوج کو شکست دی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس آپ نے یہ وعدہ کرنا ہے کہ آپ کسی سے میرا ذکر نہیں کریں گے اور اس قلعے کو فوراً خالی کر دیں۔ یہ جگہیں اپنے ساتھ نحوست سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ گو کہ اب یہاں اس نحوست کا کوئی وجود نہیں مگر پھر بھی یہ جگہ شیطانوں کے لیے ان کا مسکن رہے گی۔ جہاں وہ ایک بار اپنی چھاپ چھوڑ دیں، اس جگہ سے ہجرت کر جانا ہی بہتر ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔" وہ جانے کے لیے پلٹا۔

مان سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔

"کہاں جائیں گے آپ؟ میرے ساتھ میرے آبائی محل چلیں۔ ہم آپ کی سیوا میں کوئی کمی نہیں چھوڑیں گے۔" مان سنگھ بولا۔

ابوہریرہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا سفر تمام ہوا۔ اب نیکی کے مجھ جیسے پہرے دار اپنا عہدہ سنبھالنے آ چکے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اولیاء کرام کو ہندوستان کی سرزمین پر پھیلنے دیں۔ میزان میں نیکی کا پلڑا بھاری رہے گا تو آئندہ کبھی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مان سنگھ اسے جاتا دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ نہ جانے کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ مگر جو کہہ گیا تھا، اس پر انہیں عمل کرنا تھا اور یہ بھی یاد رکھنا تھا کہ انسان کا کردار اس کے چہرے، حلیے اور ظاہری خوبصورتی سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے اسے جاننا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

قلعے کو ہمیشہ کے لیے خالی کر دیا گیا۔ رتنا وتی اور کاویہ کا بیاہ دھوم دھام سے ہوا۔ کوئی نہیں جانتا کہ راج گڑھ کے قلعے میں اس شام کیا ہوا تھا۔ ہندوستان کی سرزمین پر اولیاء کرام کی آمد ہوتی رہی۔ قلعہ اب تک خالی پڑا ہے۔ سنا ہے شام ہوتے ہی اس کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ وہاں کسی کو آنے جانے کی اجازت نہیں اور اگر کوئی شام ڈھلے غلطی سے وہاں چلا بھی جاتا ہے تو واپس لوٹ کر نہیں آتا۔

☆☆☆

Year 1773

ایڈنبرا

قلعے کے باہر چرچ کی گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ چرچ کے مددگار وہاں پہنچ چکے تھے۔ تھامس ان کے چرچ کی ایجنسی نے آ کر خبر دی تھی کہ قلعے میں مدد کی ضرورت ہے اور اب وہ ڈیوڈ سمیت ان تینوں لڑکیوں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔

تھامس، آرتھر کے ساتھ کھڑا تھا۔

"تم نے ایگزیکیوٹر کو کیسے پہچانا؟" تھامس نے اس سے سوال کیا۔

"اس کی آنکھوں سے فادر! ایگزیکیوٹر کی آنکھوں میں شیطان کا سایہ تھا جبکہ اس کے بھائی کی آنکھوں میں اس سائے کی ہلکی سی جھلک تھی۔ میں اس سائے کو پہچانتا ہوں۔" آرتھر بولا تو تھامس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس رات نے آرتھر کو کتنا بدل دیا تھا۔

"فادر! میں سمجھ چکا ہوں کہ میرا اس راہ کو چننا محض ایک اتفاق نہیں ہو سکتا۔ میں اس سفر کو آپ کی سرپرستی میں جاری رکھنا چاہتا ہوں۔" آرتھر، تھامس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

جو کچھ اس نے آج قلعے میں دیکھا تھا، اس پر یقین کرنا مشکل تھا مگر وہ خود اس آگ سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا۔

"تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔ اس کے لیے تمہیں میری سرپرستی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم نیکی کے پہرے دار ہو اور تمہیں اس مقصد کو آگے لے کر چلنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

آرتھر نے پلٹ کر ازابیلا کی طرف دیکھا جس کے بازو پر چرچ کا مددگار پٹی باندھ رہا تھا۔

"ازابیلا اور جینیفر کو ان کے گھر چھوڑنے کے بعد تم لندن روانہ ہو جاؤ۔ یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے آرتھر! شیطانی تنظیموں کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ ہمیں بہت سے اہم مقاصد پورے کرنے ہیں۔ یہ جنگ تو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ ہم میں سے کچھ ہیں جو اپنی زندگی اس مقصد کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ یہاں بھی لوگ ہیں جنہیں چن لیا گیا ہے۔ ہم رشتے جوڑ کر ان کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ اب بھی فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"میں لندن جانا چاہوں گا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" تھامس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"مگر ازابیلا اور جیمز......؟ کیا یہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کریں گے؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں، وہ تمہیں بھول جائیں گے۔ یہاں سے جاتے ہی ان کی یادداشت سے تمہاری اور الیگزینڈر کی ساری یادیں مٹادی جائیں گی۔ یہ کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ انہوں نے وہ سب دیکھ لیا ہے جو انہیں نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ نہ صرف ان کی بلکہ ہمیں ڈیوڈ اور ایلینا کی یادداشت سے بھی یہ سب مٹانا ہوگا۔

"اب نہ جانی ہے اور نہ ہی اس مقام کو حفاظت کی ضرورت ہے کیونکہ تقلیم کو یہاں سے ہمیشہ کے لیے اٹھالیا گیا ہے مگر اس قلعے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر آباد رہنے دیا جائے گا کیونکہ جن کا مسکن رہا ہے، ان کی نحوست ہمیشہ یہاں قائم رہے گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے بند رہنے دیا جائے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ یہ کہہ کر بگھی کی طرف بڑھ گئے۔

چرچ کی ایک بگھی نے ڈیوڈ اور ایلینا کو رچرڈ کے گھر کے سامنے اتارا اور روانہ ہوگئی۔ گھر کے اندر داخل ہونے تک ان کے ذہن سے وہ تمام واقعات محو ہو چکے تھے جو قلعے میں پیش آئے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ ڈیوڈ، ایلینا کو ڈھونڈنے گیا تھا اور ساتھ لے کر لوٹا تھا۔ رچرڈ نے وہ علاقہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب وہ ایک نئے قصبے میں نئی زندگی کی شروعات کررہے تھے۔

الیگزینڈر کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ جاننا چاہتا تھا۔ اس کا نام ایڈنبرا کی تاریخ سے غائب ہو چکا تھا۔

آرتھر نے ازابیلا اور جیمز کو خود ہی ان کے گھر تک چھوڑا اور اس کے والد سے ملنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے دماغ سے جاتے ہی ان کے ذہن سے اس کی تمام یادیں مٹ گئیں۔ یہی ضروری تھا۔ اسے لندن پہنچنا تھا۔ الیونچاپل اور قریبی میں بدی کی جنگوں کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اور وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ ہر جنگ فوراً نہیں لڑی جاتی۔ کچھ جنگوں کے لیے صحیح وقت کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ کچھ جنگیں دشمن کا سامنا کر کے لڑی جاتی ہیں اور کچھ جنگیں خاموش رہ کر۔ کبھی جیت نیکی کی ہوتی ہے اور کبھی بدی کی...... مگر بدی کی جیت ہمیشہ عارضی ہوتی ہے لہٰذا خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے سیکھ لیا تھا کہ برائی کے خاتمے کے لیے نیکی کا طاقتور ہونا ضروری ہے۔ اور اب اسے تاعمر اسی مقصد کے لیے کام کرنا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

الفرافرہ۔ مصر

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ شیطانوں کی اس فوج کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ طفراس، عیاد کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ وہ مخلوق خدا جو ان کی مدد کرنے کے لیے اس صحرا میں اتری تھی، ریڈیول اور تقلیم کی اس دفن شدہ لاش کو لے کر ہمیشہ کے لیے آسمان کی بلندیوں میں جا چکی تھی۔

"جہنم واصل اسے اس قلعے کو برسوں پہلے ختم کردیا گیا تھا۔ آج پھر اس کا قصہ تمام ہوا۔" ارامان آسمان پر نظریں لگائے بولے۔

"آپ سب کچھ جانتے تھے...... کتاب بھی آپ کے پاس تھی تو پھر آپ نے اس سے پہلے مدد کیوں نہیں بلائی تھی؟" عیاد بولا۔

"ہر جنگ کو لڑنے کا ایک وقت مقرر ہے۔ میں اپنے تمام دشمنوں کو ایک ساتھ ہی جہنم واصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا صحیح وقت کا انتظار کررہا تھا۔ یہ اسی طرح لکھا گیا تھا لہٰذا اسی طرح ہونا تھا۔ ہمیں تمہاری آمد کا انتظار تھا اور دیکھو، تمہیں ہی اوباس کی طرف سے بروقت وہ اشارہ ملا۔ میرے پاس تو مدد بلانے کا علم تھا مگر تمہیں تو تقلیم کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کرنے کا علم عطا کردیا گیا۔ تم نے جو طلسمان دہرائے، اس سے وہ مدد بھی پہنچی جو ایک بار پھر دنیا کو تقلیم جیسی خباثت سے پاک کرگئی۔ اگر ہم ان شیاطین کا خاتمہ کر بھی دیتے تب بھی تقلیم کی موجودگی اور اس مقام کی حفاظت کی تلوار ہمیشہ ہم پر لٹکی رہتی۔ تم نے اس جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا اور زمراج نے ہمارے دوسرے پہرے داروں کو بھی بروقت یہ پیغام پہنچا کر اس عمل کو ایک ساتھ انجام دینے میں ہماری مدد کی۔

"مگر یہ جنگ تقلیم کو دوبارہ جگانے کی نہیں بلکہ بدی کے خاتمے کی جنگ تھی عیاد...... اگر تم یہ سمجھتے کہ جنگ ختم ہو چکی ہے...... یہ جنگ تو ہمیشہ چلتی رہے گی۔ ایک شیطان گیا ہے تو دوسرا آجائے گا کیونکہ اس کا مقصد تو تاقیامت انسانیت کو گمراہ کرنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

عیاد نے پیچھے پلٹ کر یوسف اور امیرا کو دیکھا۔ وہ دونوں اب تک بے ہوش تھے۔

"تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے؟" ارامان نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی، اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ میں اس کی لاش ساتھ لے جانا چاہوں گا۔" عیاد نے حلیمہ کی طرف اشارہ کیا جس کا جسم فرزانس کی موت کے بعد بے جان پڑا تھا۔

"ٹھیک ہے، اب ہم چلتے ہیں۔ فرات اپنا ڈیرا کہیں اور ڈال رہا ہے۔ اس سرزمین کی حفاظت کی ذمے داری تمہارے اور نبیل کے حوالے۔" وہ اپنی بات مکمل کرکے مسکرائے۔

"کیا میرے بعد بھی اسی طرح نیکی کے پہرے دار آتے رہیں گے؟ کیا وہ مجھ سے ملیں گے یا مجھے انہیں ڈھونڈنا ہوگا؟" عیاد نے سوال کیا۔

"تم اسے پہچان لو گے اور مجھے جب بھی پکارو گے، میں حاضر ہو جاؤں گا۔ یہ لو......! یہ کتاب آج سے تمہارے پاس بطور امانت رہے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کر سکتے ہو۔" وہ مسکرا کر ہوا میں تحلیل ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی فرات قبیلہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" نبیل، عیاد کے قریب آکر بولا۔

"چلو...... ہمیں الیزا اور یوسف کو ان کے گھر چھوڑنا ہے اور حلیمہ کو عبداللہ کے حوالے کرنا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں ایک بگھی محل کے سامنے آکر رکی۔

عیاد نے ایک نظر بے ہوش پڑی الیزا پر ڈالی اور اس کا نقاب اس کے چہرے پر ڈال دیا۔

یہ بہت مشکل تھا...... وہ تو اسے دیکھے بغیر ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا تھا اور اب اس پری چہرہ کے دیدار کے بجائے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا کتنا تکلیف دہ تھا۔ اس نے شدت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ آنکھیں دھندلی ہونے لگی تھیں۔ نبیل نے اسے تسلی دی۔

وہ الیزا کو گود میں اٹھائے بگھی سے نیچے اتر آیا۔ جتنی دیر کرتا، اتنا ہی یہ امر مشکل ہو جاتا۔ پہرے دار الیزا کو دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑا۔ زبیر بن دمام، صبورہ، یونس کے ساتھ تیزی سے دوڑتے ہوئے باہر کی طرف آئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر الیزا کو تھام لیا۔

"سوال مت کیجیے گا۔ بس اتنا جان لیں کہ یہ جیسے گئی تھیں، ویسے ہی واپس لوٹی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ انہیں اندر لے جائیں۔ کسی نے انہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو بلاوجہ الزام تراشی کا موقع مل جائے گا۔ انہیں صبح تک ہوش آجائے گا۔" وہ عیاد کی بات سمجھ کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد الیزا کو ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ یونس وہیں کھڑا رہا۔

"آپ کا بہت شکریہ عیاد! آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔" وہ مشکور لہجے میں بولا۔

"میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے لیکن آپ سے جاتے ہوئے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"جی، کہیں۔" یونس بولا۔

"الیزا آپ کی امانت ہے اور آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہے جتنی وہ آپ سے ملنے سے پہلے تھیں۔ حلیمہ نے چھ شیطانی طاقتوں کی مدد سے الیزا سے بدلہ لینے کی کوشش کی اور اسے اغوا کر لیا تھا۔ حلیمہ کی لاش بگھی میں موجود ہے۔ آپ چاہیں تو چل کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں اس کی لاش کو اس کے رشتے داروں کے حوالے کر دوں گا مگر آپ مجھ سے یہ وعدہ کریں کہ آپ الیزا سے نکاح ضرور کریں گے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو یونس اس کی بات سن کر چونک پڑا۔

"شیطانی طاقتیں......؟ میں سمجھا نہیں اور عیاد......! الیزا آپ کو پسند کرتی ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا خاص مقام ہے...... وہ جگہ میں کبھی نہیں لے سکوں گا...... میں یہ نہیں کر سکوں گا۔" یونس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ مجھے صبح تک بھول چکی ہوں گی۔ ان کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ ان کی ملاقات کسی عیاد سے ہوئی تھی۔ میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں...... میری طرف کشش محسوس کرنا ایک فطری عمل ہے اور اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔" وہ بولا تو یونس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں۔" یونس بولا۔

اچانک عیاد بگھی سمیت وہاں سے غائب ہو گیا۔

یونس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ پہرے دار بھی پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

"بگھی کہاں گئی؟" یونس نے دربان سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔" وہ بھی پریشان تھے۔

یونس سن ہو گیا۔

تو کیا عیاد انسان نہیں تھا؟

تو کیا الیزا واقعی غیبی طاقتوں کے جال میں پھنس گئی تھی؟

اس کا دل الیزا کی طرف سے فوراً ہی صاف ہو گیا۔

وہ غیبی طاقتیں الیزا کو خود اس کے حوالے کر کے گئی تھیں۔

جیسا عیاد نے کہا تھا، ویسا ہی ہوا تھا......!

صبح ہونے تک الیرا کے ذہن سے وہ تمام یادیں مٹ گئی تھیں۔ نہ اسے یہ یاد تھا کہ اس نے کتب میں کوئی مضمون شروع کیا تھا، نہ اسے یہ یاد تھا کہ حلیمہ کہاں گئی تھی۔ یونس نے زبیر اور صبورہ کو اس سے مزید کوئی سوال جواب کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کی الیرا خیریت سے گھر واپس آ گئی تھی۔

وہ اسے ساتھ لے کر استنبول روانہ ہو چکے تھے۔ دو ماہ بعد انہیں الیرا کو یونس کے ساتھ رخصت کرنا تھا۔

☆☆☆

چند ماہ بعد......!

عیاد، یوسف کے ہمراہ نیل کنارے کھڑا تھا۔ چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ نیل سے آتی ٹھنڈی ہوائیں بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔

"معذرت! مجھے آنے میں پھر دیر ہو گئی!" اچانک نیل ان کے سروں پر منڈلانے لگا۔

"تم ہمیشہ یہی کرتے ہو۔" یوسف ناراضگی سے بولا۔ عیاد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"عروج نے مجھ پر بہت زیادہ ذمے داریاں لاد دی ہیں۔ اب میں قاہرہ کا نگراں جو ہوں۔" وہ فخر سے بولا۔

"ارے نگراں سے مجھے یاد آیا...... عیاد! کل رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔" یوسف بولا۔

"کیا خواب دیکھا؟" عیاد نیل کے گہرے پانیوں پر نظریں جمائے بولا۔

"میں نے دیکھا، میں کرناک کے ستونوں کے درمیان کھڑا ہوں اور تمام سیارے اور ستارے ایک قطار میں جمع ہو کر ان ستونوں کے درمیان آ چکے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ عیاد اس کا خواب سن کر چونک پڑا۔ اس نے نیل کی طرف دیکھا۔ نیل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کا مطلب میں تمہیں تمہارے جوان ہونے کے بعد بتاؤں گا۔ ابھی تمہیں ایسے بہت سارے خواب آئیں گے کیونکہ تم بہت خاص ہو۔" عیاد نے پیار سے اس کے بال سہلائے۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ نیکی کا اگلا پہرے دار کون ہوگا۔

"تم دونوں ہمیشہ ایسا کرتے ہو...... مجھ سے بہت ساری باتیں چھپاتے ہو۔ خود کو بہت عقلمند سمجھتے ہو تم دونوں۔ ایک دن میرے پاس تم دونوں سے زیادہ علم ہوگا۔" وہ ناراضگی سے بولا تو عیاد اور نیل ہنس پڑے۔

"بالکل سچ کہہ رہے ہو تم۔ ایسا ہی ہوگا۔" عیاد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

عیاد نے اپنا کتب جاری رکھا تھا۔ الیرا، یونس کے ساتھ رخصت ہو کر جا چکی تھی اور ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ نیل اکثر ہی اس کی خبریں لے آتا تھا۔

حلیمہ قبر کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔ اس کی لاش نیل کنارے پڑی ملی تھی اور دیکھنے والوں نے عبداللہ کو خبر کر دی تھی۔ اس کی موت کی وجہ نامعلوم رہی تھی۔

شمس المعارف کا وہ نادر نسخہ عیاد کے پاس محفوظ ہے اور یہ اسی طرح نیکی کے پہرے داروں میں منتقل ہوتا رہے گا مگر عیاد نے اس نسخے سے ان صفحات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا ہے جس میں نظلیم کی تاریخ تحریر تھی۔ اسے یہی بہتر لگا۔ بدی کی طاقتیں بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں گی۔ اگر وہ نظلیم کو نہیں جگا سکے تو کسی اور کو جگانے کی کوشش کریں گے۔ دنیا کے حالات اتنے تبدیل کر دیے جائیں گے کہ برائی کو برائی کہنا گناہ ہوگا۔ عریانی، فحاشی، قتل و غارت اور فریب عام ہو جائے گا۔ جھوٹ کا بول بالا ہوگا۔ ایسے میں جب کائنات کے میزان میں بدی کا پلڑا بھاری ہو جائے گا تو "وہ" ظاہر ہوگا جسے جگانے کی کوششوں میں وہ برسوں سے مصروف ہیں۔

"دجال"

مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نیکی کے پہرے دار ہر جگہ موجود ہیں اور ان کے پاس وہ کتاب ہے جو ہر باطل کو فنا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

آپ ہیں نیکی کے وہ پہرے دار!

اور آپ کے پاس ہے قرآن کریم کی طاقت!

قرآن ہے وہ شمس المعارف جو آسمان سے مدد بلانے کی طاقت رکھتا ہے۔

آپ کے پاس ہے وہ دین، وہ ایمان جس کے آگے دنیا کی ہر برائی اور ہر جادو کی حیثیت صفر ہے۔

آپ کو قرآن سے مدد لینا ہے اور اس نظلیم سے لڑنے کے لیے آپ کے پاس کہف کی طاقت ہے۔ وہ دنیا کو آلودہ کرنے آ رہا ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ جیت ہماری ہوگی۔ ہمیں بتا دیا گیا ہے کہ اس کا خاتمہ ہوگا۔ بس ہمیں اپنے ایمان کی حفاظت کرنا ہے اور قرآن کو اپنے دلوں میں بسا لینا ہے۔

کیا آپ عیاد کی طرح اس جنگ کی تیاری کر رہے ہیں؟

(ختم شد)

urdunovelsi.com

درپردہ

عمران قریشی

زندگی میں بہتر مقام بنانے کے لیے انتھک محنت کی ضرورت ہوتی ہے... اور شارٹ کٹ کے چکر میں بعض دفعہ انسان بڑی طرح پھنس جاتا ہے... اسے بھی اپنا اسٹیٹس بنانا تھا کیونکہ اس کی محبت، اس کی منگیتر اس سے دور جا رہی تھی... وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنا چاہتا تھا... اسی لیے اس نے مجرموں کا ساتھ دیا... مگر کیا وہ قانون کے شکنجے سے بچ پاتا؟

درپردہ مجرموں کا ساتھ دینے والے نوجوان کی پریشانی

مجھے ان تینوں پر پہلے دن ہی شک ہو گیا تھا لیکن چونکہ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اس لیے میں نے سوچے سمجھے بغیر گھر ان کو کرائے پر دے دیا۔ ان کے پاس سامان زیادہ نہیں تھا صرف ایک دری، تین سرہانے اور چند کپڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایم اے کا ایگزام دینے کے لیے آئے ہیں اور گھر اس لیے کرائے پر لے کر تیاری کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس کاپیاں اور کتابیں نہیں تھیں۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ قریبی لائبریری میں

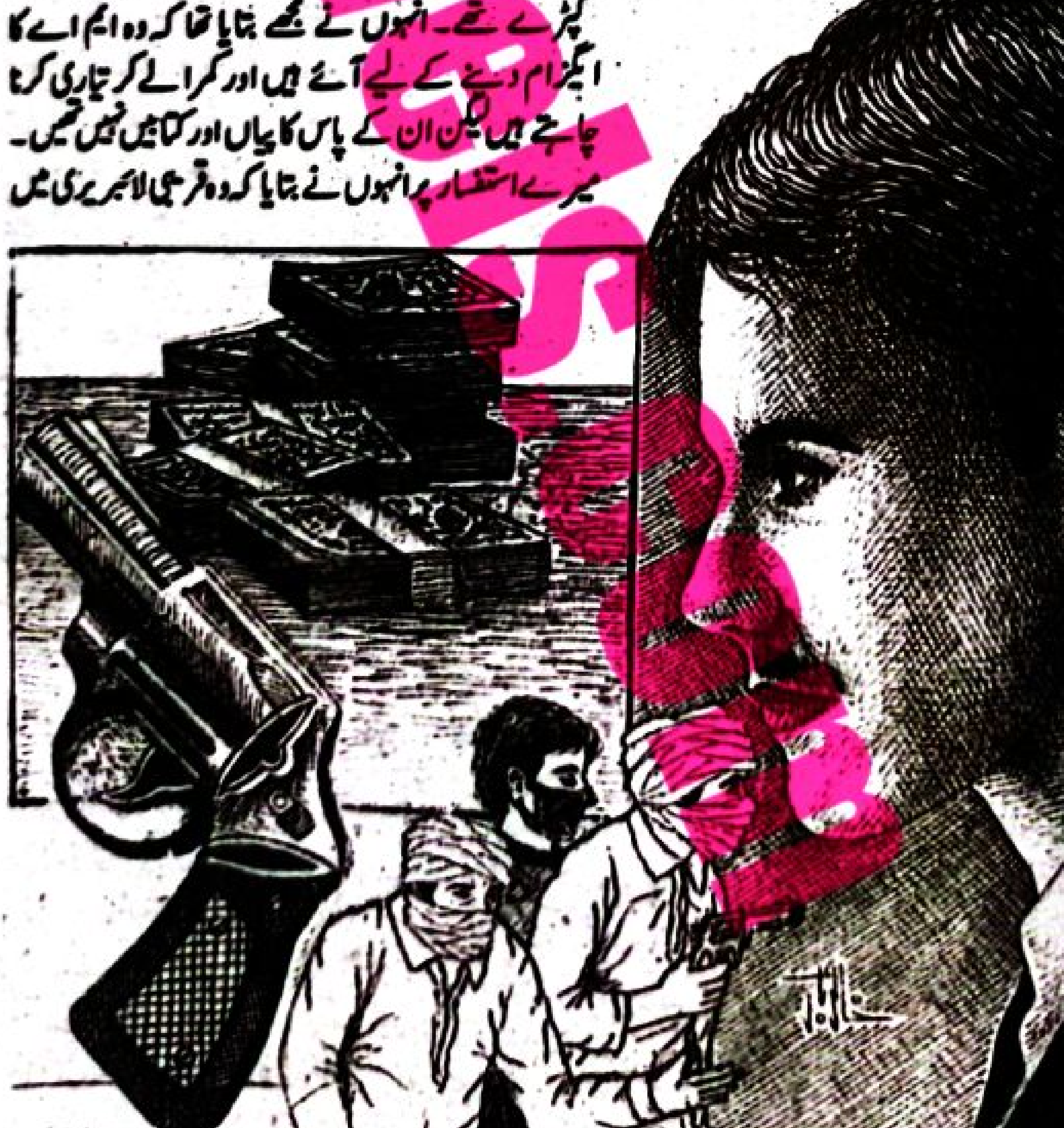

تیاری کریں گے کیونکہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ کتابیں خرید سکیں۔

مجھے کرائے کی فکر لاحق ہوئی لیکن انہوں نے ایک مہینے کا کرایہ ایڈوانس میں میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ بہت شرافت اور خوش مزاجی کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے انہیں کمرا کرائے پر دے دیا کیونکہ میرے حالات بگڑتے چلے جا رہے تھے اور مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی۔

والدین کی وفات کے بعد مجھے بہت مشکلوں سے بینک میں کیشیئر کی نوکری ملی تھی، تنخواہ پینتیس ہزار روپے ماہوار تھی۔ بجلی اور گیس کے بل تقریباً پانچ ہزار روپے آجاتے تھے اس لیے پندرہ ہزار روپے مالک مکان کو دینے کے بعد میرے پاس صرف پندرہ ہزار روپے باقی بچتے تھے جس میں مجھے تین وقت کھانے کے علاوہ بینک جانے اور واپس آنے کا کرایہ بھی دینا ہوتا تھا۔ مہینے کے آخری دنوں میں نوبت ادھار تک آجاتی تھی۔

کمرا میں نے مالک مکان سے چھپ کر کرائے پر دیا تھا۔ وہ وہاں سے کافی دور رہتا تھا اس لیے اسے معلوم ہونے کا اندیشہ لاحق نہیں تھا۔ حالانکہ وہ والد صاحب کا گہرا دوست تھا لیکن ان کی وفات کے بعد اس نے اپنے آنکھیں پھیری تھیں کہ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کبھی والد صاحب کا دوست تھا بھی یا نہیں، لیکن مجھے اس کے رویے پر تعجب نہیں ہوتا تھا۔ عام سی بات ہے، جب حالات خراب ہوتے ہیں تو سب ہی آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

والدہ کی وفات سے پہلے خالہ نے اپنی اکلوتی لڑکی حنا کا رشتہ مجھے دینے کی ہامی بھری تھی اور میں نے اسے انگوٹھی بھی پہنائی تھی لیکن والدہ کی وفات کے بعد خالو مکر گئے۔ اب وہ حنا کا رشتہ شوہر ہمسے کر رہے تھے جو بینک میں منیجر تھا۔

بہر حال وہ تینوں اپنا مختصر سامان لے کر گھر میں آگئے۔ ان کا کمرا اوپر والا تھا اور میں نیچے رہتا تھا۔ میرے کمرے کے آگے مختصر صحن تھا جس کے ایک جانب کچن اور دوسری طرف باتھ روم تھا جنہیں اب ہم نے اکٹھے استعمال کرنا تھا۔ میں رات کو آٹھ بجے سے پہلے نہیں آتا تھا اس لیے کھانا باہر کھاتا تھا۔ مجھے صرف صبح کے وقت ناشتا بنانا ہوتا تھا جو محض چائے اور رسک پر مشتمل ہوتا تھا۔ کمرا بمشکل تمام پانچ ہزار ماہوار کرائے پر چڑھا تھا، اس طرح گھر مجھے دس ہزار میں پڑ گیا تھا جس میں بجلی اور گیس کا بل بھی شامل تھا لیکن میری اچھی خاصی مدد ہو گئی تھی۔

دو ہی دن میں مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ تینوں بہت بے پروا تھے۔ باتھ روم میں پانی استعمال کرنے کے بعد بند نہیں کرتے تھے، کچن میں کھانے کے برتنوں کو گندا چھوڑ دیتے تھے۔ حد تو اس وقت ہوئی جب انہوں نے گیس کو بھی کھلا چھوڑ دیا۔

سال کے آخری دن چل رہے تھے اور بینک میں کام بہت زیادہ تھا اس لیے میں رات کو دیر سے گھر آتا تھا۔ اس رات بھی مجھے دیر ہو گئی اور گیارہ بجے جب میں ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد گھر کی طرف آیا تو اتنا تھک چکا تھا کہ سامنے والے دروازے کی طرف سے آنے کے بجائے قریبی گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی کے شروع میں میرے کمرے کا پچھلا دروازہ تھا۔ میں عموماً اسے استعمال نہیں کرتا تھا لیکن چونکہ اس دن بہت تھک چکا تھا اس لیے دروازہ کھول کر اندر آگیا اور جیسے ہی میں نے کچن میں قدم رکھا تو گیس کو کھلا ہوا پایا۔ میں نے ایگزاسٹ فین کا بٹن دبا دیا اور غصے کے عالم میں پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپری کمرے کی طرف آگیا۔ ان کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور وہ تینوں اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ سینٹرل بینک کا تذکرہ آنے پر میں اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

پہلے میں آپ کو ان تینوں کے نام بتا دیتا ہوں تاکہ آپ کو سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ان میں بڑے والے کا نام برجو تھا اور اس سے چھوٹے کا نام راجو جبکہ سب سے چھوٹے اور مختصر جسامت والے کا نام تاجو تھا۔ مجھے ان کے ناموں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور پھر ان کی بات چیت سننے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ شریف بھی نہیں تھے۔ اب میں آپ کو ان کی بات چیت کے متعلق بتاتا ہوں۔ برجو اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

”میں نے کمرا بہت سوچ سمجھ کر کرائے پر لیا ہے۔ کیشیئر کا تعلق سینٹرل بینک سے ہے جس کے باہر سیکیورٹی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم کیشیئر کو یرغمال بنا کر بآسانی ڈکیتی ڈال سکتے ہیں۔“

”کیوں نہ ہم کیشیئر کو بھی ساتھ ملا لیں۔ وہ ہمارے بہت کام آسکتا ہے۔ اسے رقم کے بارے میں بھی معلوم ہوگا کہ بینک کے اندر کتنی رقم موجود ہے۔ ہم کچھ رقم اسے بھی دے دیں گے۔“ راجو کی آواز سنائی دی۔

برجو غصے میں بولا۔ ”نہیں، ہم منصوبے میں کسی کو بھی شامل کرنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ اس چھوٹے سے بینک

urdunovels.com

بھی رقم ہی کتنی ہوگی جو ہم آپس میں بانٹنے کے بعد اسے بھی دیں گے اور پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ ریوالور کی ٹھنڈک کو محسوس کرنے کے بعد خود ہی ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ ہم اسے گن پوائنٹ پر لے کر بینک میں داخل ہوں گے اور پھر عملے کو یرغمال بنانے کے بعد انہیں تمام رقم بیگ میں ڈالنے کے لیے کہیں گے، اس کے بعد بیگ کو لے کر فرار ہوجائیں گے۔"

راجو کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ "کتنا آسان پلان ہے تمہارا، لیکن تم نے ان دو سیکیورٹی گارڈز کو نظر انداز کردیا ہے جو بینک کے باہر متعین ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی مزاحمت کریں گے اس لیے اتنی آسانی سے ہم رقم حاصل نہیں کرسکیں گے۔"

برجو نے بتایا۔ "میں کافی دنوں سے تحقیقات کر رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ بینک میں عملہ زیادہ نہیں ہے اور جو ہے وہ کھانے کے دوران باہر چلا جاتا ہے اس لیے اس وقت بینک میں کیشیئر کے علاوہ صرف کلرک موجود ہوتا ہے۔ سیکیورٹی گارڈز بینک کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان چاروں پر قابو پالیں تو یوں سمجھو کہ ہم نے بینک کو لوٹ لیا۔ میرے خیال میں وہاں سے ہمیں اتنی رقم مل جائے گی کہ آئندہ ہمیں چوری چکاری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

تاجو کی آواز سنائی دی۔ "کیشیئر ابھی تک نہیں آیا ہے، عموماً اس وقت تک آجاتا ہے۔ میرے خیال میں آج اسے زیادہ دیر ہوگئی ہے۔"

برجو نے دوبارہ بتایا۔ "سال کے آخری دنوں میں کام زیادہ ہوتا ہے اس لیے رقم بھی اچھی خاصی ہوگی لیکن ہمیں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میں کبھی بھی ڈکیتی کی بات کرنے میں نہ کرتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ تاہم تم نیچے نظر رکھنا وہ کسی وقت بھی واپس آسکتا ہے۔"

تاجو بولا۔ "میں دیکھ کر آیا ہوں، وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ اگر کہتے ہو تو ایک دفعہ پھر دیکھ آتا ہوں۔"

میں پھرتی کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر کمرے میں آگیا، پھر پچھلا دروازہ کھول کر گلی عبور کرنے کے بعد دوسری گلی سے ہوتا ہوا مکان کے مین دروازے کی طرف آگیا۔ میں نے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر قدموں کی آواز پیدا کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر میں گھس کر سوچنے لگا۔

رقم کی تو مجھے بھی بہت ضرورت ہے۔ سال کے آخری دنوں میں بینک کے والٹ روم میں اچھی خاصی رقم موجود ہوتی ہے لیکن شاید یہ رقم ہم چاروں کے لیے ناکافی ثابت ہوسکتی ہے۔

ہاں اگر میں اکیلا رقم حاصل کرلوں تو بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا، رقم کتنی ہوسکتی ہے؟ ایک کیشیئر کو اس کے متعلق اندازہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں بخوبی بتاسکتا ہوں، یہ رقم کسی طرح بھی ایک کروڑ سے کم نہیں تھی۔ اب اگر اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا تو سب کے حصے میں پچیس لاکھ کی رقم آتی۔ اس میں شاید ان تینوں کا بہت کچھ ہوجاتا کیونکہ انہیں پچھتر لاکھ ملتے، لیکن پچیس لاکھ میں، میں کچھ نہیں کرپاتا تاہم کیشیئر ہونے کی وجہ سے میں ان کے بہت کام آسکتا تھا۔ اس کے باوجود بھی مجھے تمام رقم ان کے ہاتھوں سے چھیننا تھی اس لیے میں نے تمام معاملے کو دماغ کی سلیٹ سے مٹا دیا۔

مجھے ان کا ساتھ بالکل بھی نہیں دینا چاہیے تھا۔ ڈکیتی کے بعد پولیس سب سے پہلے مجھے ہی شک کی نظروں سے دیکھتی۔ ایک کیشیئر کے بغیر بینک میں چوری کیسے ہوسکتی تھی؟ ہوسکتا تھا کہ پولیس مجھے بھی حراست میں لے لیتی اور پوچھ گچھ کے دوران انہیں یہ معلوم ہوجاتا کہ تینوں میرے گھر میں کرائے پر لے کر کچھ دن رہ رہے تھے۔

ہرچند کہ ان تینوں کے متعلق کسی کو زیادہ معلوم نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بھی محلے والوں میں سے کوئی انہیں بتاسکتا تھا کہ وہ کچھ دن مکان میں رہے تھے اور میں نے مالک مکان کی لاعلمی کے دوران کرائے پر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ واردات کے متعلق بخوبی اندازہ لگاسکتے تھے اس لیے مجھے پیچھے رہ کر کٹھ پتلیوں کی ڈور کو سنبھالنا چاہیے تھا۔ وہ آگے رہ کر ڈکیتی کرتے اور میں کچھ دماغ استعمال کرکے ایک کروڑ کی رقم ان سے ہتھیا سکتا تھا لیکن اب سوچنا یہ تھا کہ میں ان سے رقم کیسے حاصل کرتا۔

انہیں بلیک میل کیا جاسکتا تھا لیکن وہ اس کھیل کے پرانے کھلاڑی تھے اور میں نے کبھی بھی کوئی غیرقانونی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود بھی مجھے حالات نے مجبور کردیا تھا کہ میں غلط قدم اٹھا کر رقم حاصل کرنے کے متعلق سوچ سکوں، ورنہ میری منگیتر حنا کی شادی تنویر احمد سے ہوجاتی اور میں اسے رخصت ہوتا دیکھتا رہ جاتا۔

مجھے رقم تو حاصل کرنی ہی تھی۔ اگر میں اپنا دامن بچا کر ان تینوں کو بلیک میل کرتا تو سب کچھ حسب منشا ہوسکتا تھا۔ بس اس کے لیے تھوڑی سی پلاننگ کی ضرورت تھی جو میں کچھ سوچ بچار کے بعد کرسکتا تھا اور وہ تمام رات میں نے اسی سوچ بچار کے دوران گزار دی۔

☆☆☆

اگلے دن ہفتہ وار چھٹی تھی۔ میں صبح اٹھ کر کچن میں

آ گیا۔ میں نے چائے کے چار کپ تیار کیے اور پلیٹ میں رسک رکھ کر ٹرے اٹھائے اوپری منزل کی طرف آ گیا۔ وہ اٹھ چکے تھے اور شاید ناشتے کے لیے کچن کی طرف آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے جب کمرے میں قدم رکھا تو تاجو چادر اوڑھے دری پر لیٹا ہوا تھا جبکہ برجو اور راجو بیٹھے ناشتے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے ٹرے کو ان کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”آج کا ناشتا میری جانب سے۔ میں زیادہ اہتمام تو نہیں کر سکتا ہوں اس لیے چائے کے ساتھ صرف رسک پیش کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں محسوس نہیں کرو گے۔“

برجو ممنون لہجے میں بولا۔ ”تم ہمیں شرمندہ کر رہے ہو، اس تکلف کی بھلا کیا ضرورت تھی، ہم نیچے کچن میں آنے والے تھے، خود ہی بنا لیتے۔ سامان ہم کل لے آئے تھے۔“

میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس خاطر داری کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ تم کچن میں گیس کھلی چھوڑ آتے ہو، اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے۔ یہ یاد رکھو کہ گیس کا بل ہم چاروں نے مل کر دینا ہے۔“

برجو نے راجو کی جانب دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”رات کا کھانا تم نے گرم کیا تھا، گیس کیوں بند نہیں کی؟“

راجو نے لاعلمی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بند کی تھی لیکن بعد میں تاجو چائے بنانے کے لیے گیا تھا، اس نے کھلی چھوڑ دی ہوگی۔“

اب چونکہ تاجو سویا ہوا تھا اس لیے وہ صفائی پیش نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں بجلی اور گیس بہت احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا ہوں کیونکہ بینک میں میری تنخواہ بہت کم ہے، گزارہ بمشکل تمام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ناقص سیکیورٹی کی وجہ سے خدشہ بھی لاحق رہتا ہے کہ کہیں ڈاکا نہ پڑ جائے۔“

برجو نے پر تجسس لہجے میں پوچھا۔ ”میرے خیال میں تو چھوٹا سا بینک ہے۔ اس میں اتنی رقم نہیں ہونی چاہیے جس کے لیے سیکیورٹی کی ضرورت پڑ سکے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، عام دنوں میں رقم زیادہ نہیں ہوتی لیکن سال کے آخری مہینے میں کروڑوں سے اوپر چلی جاتی ہے، بعد میں اسے ہیڈ آفس بھجوا دیا جاتا ہے۔“

اس دفعہ راجو نے پوچھا۔ ”کیا وہاں سی سی ٹی وی کیمرے نہیں ہیں اور گیٹ پر بھی میں نے دو سیکیورٹی گارڈز کھڑے دیکھے ہیں جن کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ زنگ کی وجہ سے بمشکل تمام چلتی ہوں گی۔“

میں نے بتایا۔ ”بندوقوں کے بارے میں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن سی سی ٹی وی کیمرے کئی دنوں سے خراب پڑے ہوئے ہیں۔ ہیڈ کوارٹر کو ان کے متعلق معلوم ہے لیکن وہ توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ میں اپنی نوکری سے تنگ آ چکا ہوں، شاید میں جلد ہی اسے چھوڑ دوں۔“

اتنے میں تاجو سو کر اٹھ گیا اور ہم چاروں نے ناشتا کیا۔ پھر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں کچی پکی کہانی کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ واقعی طالب علم ہوں اور میں نے جو باتیں سنی تھیں، وہ انہوں نے مذاق میں کی ہوں۔

میں نے دل میں تہیہ کیا کہ کچھ دن اور ان کی بات چیت سنوں گا تا کہ ان کے ارادوں کے متعلق حتمی طور پر معلوم ہو سکے۔ ہفتے کے دن میں باقی دنوں کا کچا راشن لے آیا کرتا تھا تا کہ باقی دنوں میں مجھے خوار نہ ہونا پڑے۔ دوپہر اور رات کا کھانا باہر کھانے کے باوجود بھی مجھے چائے گھر پر بنانی پڑتی تھی جس میں چینی اور دودھ پڑتا تھا، اس لیے دودھ کے ڈبے اور رسک لا کر کچن میں رکھ دیا کرتا تھا، البتہ اتوار کا دن میں سو کر گزارتا تھا۔

اس رات گیارہ بجے کے قریب میں دوبارہ دبے قدموں چلتا ہوا اوپری کمرے کی طرف آیا۔ کمرے کی لائٹ آن تھی اور دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ تینوں کمبل اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے کان لگا دیے لیکن اس رات انہوں نے ڈکیتی کے متعلق زیادہ بات چیت نہیں کی، سوائے اس کے کہ انہوں نے سینٹرل بینک کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ انہیں وہاں سیکیورٹی کم دکھائی دی تھی۔ اس لیے اچھی خاصی رقم ہاتھ لگ سکتی تھی۔ انہوں نے کیشیئر کے متعلق معلومات کیں تو معلوم ہوا کہ میں کمرا کرائے پر دینا چاہتا ہوں اور میرے حالات بہتر نہیں ہیں اس لیے انہوں نے کمرا کرائے پر لے لیا تا کہ مجھ سے نہ صرف معلومات حاصل کر سکیں بلکہ یرغمال بنا کر بینک کے اندر بھی داخل ہو سکیں۔ بس یہی وہ باتیں تھیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً کی تھیں، وہ بھی اس لیے کہ ان کے خیال میں، میں گھر میں نہیں تھا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ان تینوں کی طرح مجھے بھی رقم کی اشد ضرورت تھی لیکن اتنی ہمت نہیں تھی کہ بینک میں ڈاکا ڈال سکتا اور پھر اکیلے سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ نمٹ لینا میرے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے

میں نے ان تینوں کو اچھی طرح ورغلایا تھا۔ اب ڈاکا انہوں نے ڈالنا تھا اور رقم کو میں ہتھیا کر لے جاتا۔

☆☆☆

اگلے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ میں ان تینوں کو یہ بتا کر مکان سے باہر آگیا کہ میں دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے شہر سے باہر جارہا ہوں، شاید واپسی رات کو دیر سے ہوگی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور میں مکان سے باہر نکلنے کے بعد پچھلے دروازے سے واپس اندر آگیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور دبے قدموں چلتا ہوا اوپری کمرے کی طرف آگیا۔ وہ چائے کے ساتھ بسکٹ کھا رہے تھے اور ان کی گفتگو کا موضوع میں تھا۔ راجو کہہ رہا تھا۔

"کیشیئر کو یرغمال بنانے کے بعد ہمیں بینک کے اندر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اس کے بدلے میں رقم کہیں پر بھی منگوا سکتے ہیں۔"

برجو کی آواز سنائی دی۔ "نہیں، بینک کا عملہ ایک عام سے کیشیئر کے لیے ایک کروڑ کی رقم دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوگا، وہ پولیس کو اطلاع کردیں گے اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فرار ہونا پڑے گا۔ ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

تاجو کی آواز سنائی دی۔ "لیکن اس کے علاوہ ہم اور کیا کرسکتے ہیں۔ کمرا کرائے پر لینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ کیشیئر کے ذریعے رقم نکلوائی جائے۔ کیونکہ ہمارے پاس ریوالور ایک ہے اور بینک سیکیورٹی پر دو گارڈز متعین ہیں۔ ہم کس کس کو قابو کرتے پھریں گے۔"

برجو کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "میں نے سب پلاننگ کرلی ہے۔ میں ایسے ہی کمرا کرائے پر لے کر وقت ضائع نہیں کررہا ہوں۔ ہم کیشیئر کو مجبور کریں گے کہ وہ فون کرکے بینک منیجر کو اپنے گھر بلائے اور جب منیجر یہاں آئے گا تب ہم اسے یرغمال بنانے کے بعد کیشیئر کو مجبور کریں گے کہ وہ بینک میں جاکر تمام کیش کسی بیگ میں ڈال کر واپس یہاں لے آئے...... اور جب وہ لے آئے گا تو ہم ان دونوں کو باندھ کر یہاں سے فرار ہوجائیں گے۔"

راجو بولا۔ "اتنی لمبی چوڑی پلاننگ سے بہتر ہے کہ ہم بینک کے منیجر کو اس کے گھر میں یرغمال بنالیں اور کیشیئر کو وہاں رقم لانے کے لیے کہیں۔ اس طرح درمیان والا جھنجٹ ہی ختم ہوجائے گا۔"

برجو نے جواب دیا۔ "کسی کے گھر میں داخل ہونا اور بعد میں اسے یرغمال بنا کر رقم منگوانے سے بہتر ہے کہ باہر محفوظ طریقے سے کام کیا جائے۔"

تاجو بولا۔ "تو پھر منیجر کو بینک سے باہر کسی [illegible] سے اغوا کر لیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں کسی محفوظ مقام کا تعین کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب [illegible] آسانی کرسکتے ہیں۔"

برجو نے دوبارہ انکار کیا۔ "سڑک [illegible] سے یرغمال بنانے سے بہتر یہی ہے کہ ہم اسے کیشیئر کے گھر میں یرغمال بنالیں۔ سڑک پر تو کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن یہاں ہم محفوظ ہیں۔"

بس میں نے اتنی ہی بات سنی اور [illegible] قدموں چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے ان کی منصوبہ بندی پسند آئی تھی۔ ہر چند کہ اس کا مرکزی کردار میں تھا مگر ہم ان کے منصوبے میں کچھ ردوبدل کرنا مقصود تھا۔ اگر کارروائی میرے گھر ہوتی تو مجھے بھی تفتیش میں شامل کرلیا جاتا اس لیے ضروری تھا کہ سب کچھ بینک کے اردگرد ہی کیا جاتا۔ اس لیے میں کمرے کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ پھر گلی کے سامنے سے گھوم کر مکان کے مین دروازے کی طرف چلا آیا۔ میں نے چابی گھمائی اور زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھولنے کے بعد مکان میں قدم رکھا۔ ان تینوں میں سے ایک نے سر نکال کر نیچے جھانکا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا پھر غصے کے عالم میں دروازے کو بند کرکے کنڈی لگادی اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا ان کے کمرے میں آگیا۔ وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں انہیں بتایا۔

"میرا اور میرے دوستوں کا تمام پروگرام غارت ہوکر رہ گیا ہے۔ چھٹی کے دن بھی بینک والوں کو چین نہیں ہے۔"

میں ان کے قریب ہی دری پر بیٹھ گیا۔

برجو نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ تم تو اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے شہر سے باہر جارہے تھے پھر واپس کیوں آگئے؟"

میں نے فیصلے لہجے میں بتایا۔ "کیشیئر بینک والوں کا غلام ہوتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ میں ابھی دوستوں کے گھر پہنچا ہی تھا کہ منیجر کا فون آگیا۔ وہ دوپہر کا کھانا ہمیشہ بینک کے سامنے بنے ہوئے ریسٹورنٹ میں کھاتا ہے۔ چونکہ اسے وہاں کا کھانا بہت پسند ہے اس لیے چھٹی والے دن بھی کوٹھی میں بیٹھ کر تناول کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ دو بجے کھانا ریسٹورنٹ سے لے کر اس کی کوٹھی میں پہنچادوں۔"

وہ تینوں حیران پریشان مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے دوبارہ فیصلے لہجے میں کہا۔ "اس ریسٹورنٹ کے اوپر کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کمرا منیجر

کے نام پر کی ہے۔ کل میں اسے مشورہ دوں گا کہ وہ کوٹھی کو چھوڑ کر اس کمرے میں منتقل ہو جائے، وہاں اسے کھانا بہ آسانی مل جائے گا۔"

برجو نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔ "کیا منیجر دوپہر کا کھانا ریسٹورنٹ میں کھاتا ہے، اس کے گھر سے کھانا نہیں بھجوایا جاتا؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں، گزشتہ سال تک بھجوایا جاتا تھا لیکن جب سے منیجر کو ریسٹورنٹ کا کھانا پسند آیا ہے، تب سے اس نے گھر والوں کو کھانا بھجوانے سے منع کر دیا ہے اور دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں جانا شروع کر دیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر اوپر والے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ وہاں وہ پانچ بجے تک آرام کرتا ہے اور پھر بینک آ جاتا ہے۔"

راجو بولا۔ "ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ تم کھانا دینے کے بعد اپنے دوستوں کی طرف جا سکتے ہو۔ پورا دن ابھی باقی پڑا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ظاہر ہے، گھر میں رہ کر کیا کروں گا۔ تفریح کے لیے شہر سے باہر جانا تو اب ممکن نہیں لیکن دوستوں کی طرف ضرور جاؤں گا۔ کھانا وہیں سے ان کی کوٹھی لے جاؤں گا۔ تم دروازہ بند کر لو اور گیس احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا۔"

وہ شرمندگی سے مسکرا دیے اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان میں سے ایک سیڑھیوں سے نیچے جھانک رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ اس میں آٹو میٹک لاک لگا ہوا تھا اس لیے ان تینوں میں سے کسی کو نیچے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں گلی کو عبور کر کے پچھلی گلی میں سے ہوتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے کی طرف آ گیا۔ میں نے آہستہ سے لاک کھولا اور اندر آنے کے بعد دبے قدموں چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ وہ مطمئن ہونے کے بعد اونچی آواز میں بات چیت کر رہے تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اب میں ان کی بات چیت بہ آسانی سن سکتا تھا۔

برجو بول رہا تھا۔ "میں کل بینک میں جا کر لوکیشن چیک کروں گا۔ ریسٹورنٹ میں نے دیکھا ہوا ہے بلکہ دو دن قبل وہاں چائے بھی پی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ منیجر کے پاس اپنا کمرا ہے اس لیے ہمیں ریسٹورنٹ میں کمرا کرائے پر نہیں لینا ہوگا۔ اب صرف یہ کرنا ہے کہ تین بجے کے قریب ریسٹورنٹ میں جا کر گن پوائنٹ پر منیجر کو اوپری کمرے میں لے جانا ہے۔ کیشیئر کا موبائل نمبر میں نے باہر کھڑے سیکیورٹی گارڈز سے لے لیا ہے۔ میں کیشیئر سے بھی لے سکتا تھا لیکن اگر اسے شک پڑ جاتا تو بنا بنایا معاملہ بگڑ جاتا۔ سیکیورٹی گارڈ نمبر نہیں دے رہا تھا اس لیے میں نے اسے بتایا کہ میں اس کا رشتہ دار ہوں اور اس سے ضروری بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کچھ دیر پس و پیش کے بعد نمبر دے دیا۔ منیجر کو اوپری کمرے میں لے جانے کے بعد ہم کیشیئر کو فون کریں گے، اس کے بعد موبائل منیجر کے ہاتھوں میں پکڑا دیں گے۔ وہ کیشیئر کو بتائے گا کہ اسے یرغمال بنا کر ریسٹورنٹ کے اوپر والے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس لیے فوراً ہی کیشیئر ایک کروڑ کی رقم جو کہ بڑے نوٹوں پر مشتمل ہونی چاہیے، کسی بیگ میں ڈال کر ریسٹورنٹ کے باہر کھڑے ہوئے آدمی کو دے آئے ورنہ اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

تاجو کی آواز سنائی دی۔ "اور ریسٹورنٹ سے باہر میں سیاہ کپڑے سے منہ ڈھانپے کھڑا ہوں گا۔ جیسے ہی مجھے رقم سے بھرا ہوا بیگ ملے گا، میں اسے لے کر کمرے میں آ جاؤں گا۔"

راجو بولا۔ "نہیں، ہم رقم حاصل کرنے کے فوراً بعد شہر کو الوداع کہہ دیں گے اور بس پکڑ کر اپنے گاؤں چلے جائیں گے۔ شہر میں رہنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

برجو کی آواز سنائی دی۔ "ہم گاؤں جانے کے لیے کوچ کا ٹکٹ لیں گے۔ وہ چار بجے روانہ ہوتی ہے۔ ہمیں ایک گھنٹے کے دوران نہ صرف رقم حاصل کرنا ہوگی بلکہ اسے کوچ کے اڈے تک بھی لے جانا ہوگا ...... اور اس سے پہلے کہ پولیس تفتیش کا آغاز کرے، ہم شہر سے دور جا چکے ہوں گے لیکن کوچ میں ہماری سیٹیں اکٹھی نہیں ہوں گی۔ میں سب سے اگلی سیٹ حاصل کروں گا، راجو درمیان والی اور تاجو سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے گا۔"

تاجو بولا۔ "اب وہ کام بھی بتا دو جو ہم نے انجام دینے ہیں تاکہ ہم اپنے آپ کو اس کے لیے پہلے سے ہی تیار کر لیں۔"

برجو کی آواز سنائی دی۔ "میں پورا منصوبہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔ دوپہر کو پورے تین بجے بینک کا منیجر کھانا کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں داخل ہوگا۔ راجو دروازے کے پاس اس کا منتظر ہوگا۔ وہ ریوالور کی نال اس کی کمر سے لگا دے گا۔ میں اس سے کچھ پیچھے کھڑے ہو کر ان دونوں کو کور کروں گا۔ راجو اسے دوسری منزل پر واقع رہائشی کمرے کی طرف لے جائے گا اور پھر اندر داخل ہونے کے بعد ہم کیشیئر کو فون کریں گے کہ وہ رقم باہر لا کر تاجو کو دینے کا

ہم دیں گے۔ تاجو ریسٹورنٹ کے دروازے کے ساتھ بنے ہوئے پان کے کھوکھے کے قریب کھڑا ہو کر سگریٹ پی رہا ہوگا۔ اس کا چہرہ فیس ماسک کے پیچھے چھپا ہوگا۔ ایسا ہی فیس ماسک ہم دونوں بھی چہرے پر لگا کر رکھیں گے۔ جیسے ہی کیشیئر رقم لے کر ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف آئے گا، تاجو بیگ اس کے ہاتھوں سے لینے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا قریبی چوک کی طرف چلا جائے گا۔ وہاں رکشے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ ان میں سے ایک میں بیٹھ کر کوچ کے اڈے کی طرف جائے گا اور بیگ کے ساتھ ہی اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے گا۔ دوسری طرف ہم کیشیئر کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد ریسٹورنٹ کے پچھلے دروازے سے نکل کر چوک کی طرف آئیں گے، پھر علیحدہ علیحدہ رکشے پکڑ کر کوچ کے اڈے میں آنے کے بعد اپنی سیٹوں پر براجمان ہو جائیں گے۔ اس کے بعد پولیس ہمیں شہر میں تلاش کرتی رہے گی اور ہم گاؤں میں بیٹھ کر عیاشی کریں گے۔"

تاجو نے پوچھا۔ "تینوں کے حصے میں کتنی رقم آئے گی؟"

برجو نے حساب لگاتے ہوئے بتایا۔ "میرے خیال میں تینتیس لاکھ ہر ایک کے حصے میں آئیں گے۔ باقی کا بچ جانے والا ایک لاکھ اخراجات کی نذر ہو جائے گا۔ ہم تینوں کے لیے یہ رقم بہت ہے۔"

راجو کی خوشی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ "میں گاؤں کے درمیان میں باڑا خریدوں گا۔ میرے خیال میں دس بھینسوں پر مشتمل باڑا بہ آسانی مل جائے گا۔ اگر کچھ رقم بچ گئی تو باڑے کے اندر اپنے لیے کچا پکا کمرا بھی ڈال لوں گا۔"

تاجو بولا۔ "میں دو ٹریکٹر خرید کر کسانوں کو کرائے پر دوں گا۔ میرے خیال میں اتنی رقم میں آ جائیں گے۔ ان سے حاصل ہونے والی رقم سے میری گزر بسر بہ آسانی ہو جائے گی۔"

برجو طنزیہ لہجے میں بولا۔ "یہ سب خواب ہم رقم حاصل ہو جانے کے بعد دیکھیں گے۔ ابھی تو ہمیں کچھ اور محنت کرنی ہے۔" اس نے راجو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم کل جا کر کوچ میں اٹھائیس تاریخ کے ٹکٹ کروا لینا۔ میں اور تاجو ریسٹورنٹ اور اس کے اوپر بنے ہوئے کمرے کا جائزہ لیں گے۔ ریسٹورنٹ کے دو دروازے ہیں، یہ دونوں دروازے دو بالکل دو سڑکوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ یعنی تم پیچھے والی گلی سے بھی ریسٹورنٹ میں داخل ہو سکتے ہو اور بینک کے سامنے والی گلی میں سے بھی اندر آ سکتے ہو۔ اٹھائیس تاریخ کو ہم واردات کریں گے۔ کل ہم یہ کمرا چھوڑ دیں گے اور تمام سامان پیک کر کے [illegible] روم میں رکھوا دیں گے۔"

راجو بولا۔ "ہمارے پاس کمبل اور دری کے علاوہ ہے ہی کیا؟ انہیں ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ کیشیئر کا بھلا ہو جائے گا۔"

برجو نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ ہم اپنے پیچھے کسی قسم کا نشان نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی اٹھائیس تاریخ میں کچھ دن باقی ہیں اس لیے اطمینان کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے رہیں گے۔"

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی اور میں سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ شام چھ بجے تک کا وقت میں نے سو کر گزارا پھر پچھلے دروازے سے نکل کر گلی عبور کرنے کے بعد مکان کے اگلے دروازے کی طرف آ گیا۔ میں نے چابی گھمائی اور اندر آنے کے بعد جان بوجھ کر دروازے کو زور سے بند کیا۔ سیڑھیوں پر سے کسی نے جھانک کر دیکھا۔ وہ تاجو تھا، اس نے مجھے اوپر آنے کے لیے کہا۔ میں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر ان کے کمرے میں آ گیا۔ راجو اور برجو دری پر بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔

تب برجو بولا۔ "بات یہ ہے کہ ہمیں کالج کے ہاسٹل میں کمرا مل گیا ہے اس لیے کل ہم وہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔ یہاں ہمارا وقت بہت اچھا گزر رہا ہے۔ ہم جانا نہیں چاہتے لیکن کیا کریں، مجبوری ہے۔ ہمیں یہاں سے بس پکڑ کر کالج تک جانا پڑتا ہے اور ہم اس فضول خرچی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

میں نے اپنے چہرے پر زبردستی پریشانی کے تاثرات پیدا کیے اور افسردہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میں کرائے کی رقم خرچ کر چکا ہوں اس لیے جلدی واپس نہیں لوٹا سکتا۔ تمہیں ایک مہینا انتظار کرنا ہوگا۔"

برجو بولا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمیں جب بھی موقع ملا ہم لینے کے لیے آ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ دنوں کے لیے گاؤں چلے جائیں۔ اس کے بعد شاید واپسی اگلے ماہ ہوگی۔"

میں نے گاؤں کا نام پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ "گاؤں یہاں سے کافی دور ہے۔ وہاں ہمیں بچہ بچہ جانتا ہے۔ تم وہاں ضرور آنا، ہمیں بہت خوشی ہوگی، لیکن اطلاع دینے کے بعد آنا۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "بینک کی نوکری کے ہوتے ہوئے میں وہاں کیسے آ سکتا ہوں، لیکن تمہاری رقم جلد از جلد واپس کرنے کی کوشش کروں گا۔"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح انہوں نے کمرا چھوڑ دیا۔ میں نے بینک سے ایک گھنٹے کی چھٹی لی اور ان کے انتظار میں گلی کے کونے پر آکر کھڑا ہو گیا۔

دس بجے کے قریب وہ تینوں گھر سے باہر نکلے اور رکشا میں بیٹھ کر مضافات میں واقع آبادی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی رکشا پکڑا اور اسے ان تینوں کے رکشے کے پیچھے چلنے کے لیے کہا۔

میں احتیاطاً ان کا ایڈریس معلوم کرکے رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے خدشہ لاحق تھا کہ کہیں منصوبے میں تبدیلی کے بعد رقم ہاتھوں سے نکل نہ جائے اس لیے ان پر مکمل نظر رکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ان کا رکشا ایک تھرڈ کلاس ہوٹل کے سامنے رک گیا۔ تب مجھے ان کی عقل کی داد دینا پڑی۔ یہ ہوٹل بینک کی مخالف سمت پر کافی دور واقع تھا اور یہاں انہیں کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے جو کمرا حاصل کیا، اس کے متعلق میں نے کلرک کو سو کا نوٹ دینے کے بعد معلوم کرلیا۔

بینک سے نکلنے کے بعد میں نے چہرے پر فیس ماسک لگایا تھا تاکہ ان تینوں کو میرے متعلق معلوم نہ ہو سکے۔ کمرے کا نمبر معلوم کرنے کے بعد میں رکشے میں بیٹھ کر واپس بینک آگیا۔

میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ انہوں نے جس گاؤں کے متعلق بتایا تھا، وہ واقعی ان کا گاؤں تھا بھی یا نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہو اور اگر وہ رقم لے کر کہیں اور چلے جاتے تو میں انہیں کہاں ڈھونڈتا پھرتا؟ بہرحال اگلے دن پچیس دسمبر کی چھٹی تھی۔ میں بہ آسانی اپنی معلومات مکمل کرسکتا تھا۔ مجھے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی معاملے کو بگاڑ سکتی تھی۔ اس لیے اگلے دن ہی صبح بس پکڑ کر دیپال گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ واقعی شہر سے بہت دور تھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں چار گھنٹے لگ گئے۔ گاؤں کے باہر ایک ہوٹل بنا ہوا تھا۔ میں اس ہوٹل کے اندر آگیا۔ میں نے چائے منگوائی اور قریب ہی اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں دبلے پتلے اور مریل سے لڑکے نے چائے کا کپ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ واپس جانے لگا تو میں نے دس کا نوٹ اس کے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”بدھو اور راجو کو جانتے ہو جو گاؤں چھوڑ کر شہر چلے گئے؟ ان کے ایک ساتھی کا نام جمو بھی ہے۔“

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ تینوں بھائی ہیں۔ گاؤں میں رہتے تھے تو کبھی جانور چوری کرکے قریبی منڈی میں فروخت کردیتے تھے اور کبھی سڑک پر لوگوں کو لوٹتے تھے اور پھر جب بدنام ہو گئے تو شہر چلے گئے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے ان کے گھر تک لے جاسکتے ہو؟ یہ دس کا نوٹ اور رکھ لو۔“

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ پھر ہوٹل کے مالک کو بتا کر سڑک عبور کرنے کے بعد نیچے اترنے لگا۔ گاؤں وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع تھا وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں بہ مشکل بیس پچیس کے قریب گھر موجود تھے اور سرسبز کھیت دور دور تک لہلہاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکا مجھے گاؤں کی گلیوں میں لے آیا۔ ان کے درمیان میں کچا پکا گھر تھا، جو ان تینوں کا تھا۔ وہ بہت خستہ حالت میں تھا۔

میں نے لڑکے سے پوچھا۔ ”گھر میں کون کون رہتا ہے؟“

لڑکے نے بتایا۔ ”ان کی ماں تھی جس کا چند ماہ قبل انتقال ہوگیا۔ وہ اسے دفنانے کے لیے بھی گاؤں نہیں آئے اور شاید ہی اب کبھی واپس آئیں گے۔“

مجھے رقم کی فکر لاحق ہوئی۔ اگر وہ گاؤں نہ آتے تو میں انہیں کہاں تلاش کرتا، تاہم شہر میں موجود ان کے ایڈریس سے میں بہرحال واقف تھا۔ میں ان پر بہ آسانی نظر رکھ سکتا تھا۔ میں نے سڑک سے بس پکڑی اور واپس شہر آگیا۔ اب مجھے اس ڈکیتی کا انتظار کرنا تھا جس کا تانا بانا میں نے ہی ان تینوں کے دماغوں میں ڈالا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اب وہ کس حد تک اس پر عمل کرتے ہیں۔ بہرحال رات کو تھکن کی وجہ سے نیند خوب آئی۔ خواب میں، میں نوٹوں سے کھیلتا رہا۔

☆☆☆

اور پھر اٹھائیس تاریخ کو تین بجے کے بعد مجھے ان کی جانب سے کال موصول ہوئی۔ انہوں نے منصوبے کے مطابق خود بات نہیں کی بلکہ موبائل منیجر کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ مجھے اس کی پریشان آواز سنائی دی۔

”فوراً دوسری منزل پر آؤ اور کھڑکی میں سے باہر جھانکو۔ میں حالات کے متعلق تمہیں وہیں بتاؤں گا۔“

میں مسکراتا ہوا اپنی سیٹ سے اٹھ کر دوسری منزل کی طرف آگیا۔ بینک کا تمام اسٹاف کھانا کھانے کے لیے باہر چلا گیا تھا اور اس وقت میں میرے علاوہ چپڑاسی یا پھر کلرک موجود تھا۔ سیکیورٹی گارڈز باہر مین دروازے پر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ بینک کے اندر کچھ دیر کے بعد ڈکیتی ہونے والی تھی۔ میں نے دوسری منزل پر آنے کے بعد کھڑکی کھول کر سامنے دیکھا۔ ریسٹورنٹ کی دوسری منزل والی کھڑکی میں منیجر ہراساں چہرہ لیے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے راجو چہرے پر فیس ماسک

لے کھڑا تھا اور اس نے ہاتھ میں ریوالور پکڑا ہوا تھا جس کی نال کا رخ منیجر کے سر کی جانب تھا۔ مجھے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل میں سے منیجر کی آواز سنائی دی۔

"تم بخوبی دیکھ سکتے ہو کہ ان کے تیور کتنے خطرناک ہیں، تو فوراً نیچے جاؤ اور والٹ روم میں سے تمام رقم نکال کر بیگ میں بھر دو اور وہ بیگ ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے ان کے آدمی کے ہاتھ میں دے آؤ۔ تمہیں اسے پہچاننے کی ضرورت نہیں ہے، وہ خود تم سے بیگ لے لے گا...... اور کوشش کرنا کہ بینک کے کسی عملے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ والٹ روم کی چابی میری میز کی دراز میں موجود ہے اور دراز کی چابی میں تمہاری جانب پھینک رہا ہوں۔" اس نے چابی میری جانب اچھال دی۔ میں نے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح کیچ کی اور مطمئن قدموں کے ساتھ چلتا ہوا نچلی منزل پر آ گیا۔

والٹ روم کی عموماً تین چابیاں ہوتی ہیں لیکن چونکہ ہماری برانچ میں کام کم تھا اس لیے یہاں کی دو چابیاں تھیں۔ ایک میرے پاس تھی اور دوسری منیجر کے پاس۔ چونکہ سال کا آخری ہفتہ ختم ہونے والا تھا اس لیے برانچ میں ایک کروڑ سے کچھ اوپر رقم موجود تھی۔ میں نے نیچے جانے کے بعد منیجر کی دراز میں سے والٹ روم کی چابی باہر نکالی اور والٹ روم میں آ گیا۔ میں نے منیجر کی چابی تالے میں لگائی پھر اپنی چابی لگانے کے بعد ہینڈل کو گھما دیا۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا، پھر میں نے تمام رقم سیاہ بیگ میں منتقل کرنا شروع کی۔ یہ بیگ منیجر کے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ اسی بیگ میں اگلے دن رقم بھرنے کے بعد ہیڈ کوارٹر منتقل کرنا تھی لیکن اب یہ ورد دوسری ختم ہونے والی تھی۔ رقم منتقل کرنے کے بعد میں بینک سے باہر آ گیا۔ دونوں گارڈز نے میری جانب تشویشی نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے بتایا کہ ریسٹورنٹ سے کال کر کے منیجر نے مجھے بلایا ہے، میں جلد واپس آ جاؤں گا۔ پھر ان کا جواب سنے بغیر سڑک کو عبور کر کے سامنے بنے ریسٹورنٹ کی طرف آ گیا۔ تاجر چہرے کو ماسک کے پیچھے چھپائے پان کے کھوکھے کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیگ میرے ہاتھوں سے لے لیا اور تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا قریبی چوک کی طرف چلا گیا۔ میں نے طویل سانس لیا اور واپس بینک میں آ گیا۔ اب مجھے عملے کے واپس بینک میں آنے کا انتظار کرنا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ان کی واپسی شروع ہوئی اور میں ہراساں لہجے میں انہیں ڈکیتی کے متعلق بتانے لگا۔ سیکیورٹی گارڈز بھی بینک کے اندر آ گئے۔ عملے کا ایک آدمی پولیس کو فون کرنے لگا اور باقی میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔

میں نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے رقم کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی منیجر کی ہے۔ ڈکیتی ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے، نہ جانے انہوں نے منیجر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کیوں نہ ہم ریسٹورنٹ کے اوپر والے کمرے میں جا کر دیکھیں، منیجر صاحب خیریت سے ہیں یا نہیں؟"

بینک کے عملے میں سے ایک بولا۔ "نہیں، پولیس کے آنے سے پہلے ہمیں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ وہ خود ہی اوپر جا کر دیکھ لیں گے۔" تمام عملے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور میں چپ ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس آ گئی اور انہوں نے ریسٹورنٹ کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں جا کر منیجر کو باہر نکال لیا۔ اسے رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ اس کے بعد معمول کی کارروائی شروع ہوئی۔ منیجر کا بیان لیا گیا۔ مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ میں نے جو دیکھا تھا، وہ سچ سچ بتا دیا اور پولیس والوں نے ریسٹورنٹ کے اوپری کمرے سے فنگر پرنٹ اٹھانا شروع کر دیے۔

منیجر نے ہیڈ کوارٹر فون کر کے ڈکیتی کی اطلاع دے دی۔ وہاں سے اگلے دن آڈٹ ٹیم بھجوانے کے لیے کہا گیا۔ میں بالکل مطمئن تھا کیونکہ اس تمام کارروائی میں میرا رتی برابر بھی ہاتھ نہیں تھا تاہم پولیس والوں سے مجھے کچھ ڈر ضرور تھا۔ وہ کسی کو بھی معاملے میں ملوث کر سکتے تھے اور وہی ہوا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر منیجر سے پوچھ گچھ کی اور اس نے بتایا کہ ڈاکو نے اسے موبائل پر کیشیئر کا نمبر ملا کر دیا تھا اور اس نے کیشیئر کو رقم ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے ان کے ساتھی کو دینے کے لیے کہا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "انہیں کیشیئر کا نمبر کہاں سے معلوم ہوا؟"

منیجر نے لاعلمی کا اظہار کیا، پھر مجھے بلایا گیا۔ میرے موبائل کا ڈیٹا چیک کیا گیا، دوستوں کی تفصیل معلوم کی گئی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ ان تینوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہے اور پھر جب انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ ڈاکوؤں کو میرے موبائل کا نمبر معلوم تھا۔ انہیں نمبر کس نے دیا؟

میں نے فوراً بہانہ بنا دیا۔ "بینک کے عملے میں سے کسی نے دیا ہوگا۔ میری محدود زندگی میں کسی کے ساتھ ملنا جلنا زیادہ نہیں ہے۔"

انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا اور مجھے احساس ہو گیا کہ مجھ سے اصل غلطی ہو گئی ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اس لیے چپ ہو کر

بیٹھ گیا۔ پھر تمام عملے کو باری باری کمرے میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی۔ سیکیورٹی گارڈز نے فوراً بتا دیا کہ چند دن پہلے ایک آدمی نے مینیجر کا نمبر دریافت کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مینیجر کا کرائے دار ہے۔ پوچھ گچھ کے متعلق سیکیورٹی گارڈز نے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد مجھے بتا دیا۔

اتنی جلدی پول کھل جانے پر میں پریشان ہو گیا۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ جب پولیس اہلکار میرے محلے میں جا کر معلومات کرتا، تب انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ میرے گھر میں تین افراد نے قیام کیا تھا۔ پھر چند دن پہلے کمرا چھوڑ کر چلے گئے۔ ریسٹورنٹ میں تفتیش کے دوران انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکوؤں کی تعداد تین تھی۔ ریسپشنسٹ کلرک نے انہیں بتایا تھا کہ یہ دونوں کچھ دن پہلے ریسٹورنٹ میں آئے تھے۔ چونکہ ان کی حرکات مشکوک تھیں اس لیے اس نے ان پر خصوصی نگاہ رکھی تھی لیکن وہ ریسٹورنٹ کے اوپری کمرے کا جائزہ لینے کے بعد واپس چلے گئے تھے۔

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اگر پولیس والے مجھ سے سختی کے ساتھ تفتیش کرتے تو شاید میں سب کچھ اگل دیتا، حالانکہ میرا اس معاملے میں اتنا زیادہ عمل دخل نہیں تھا لیکن بہرحال میں ملوث ضرور تھا۔ اس کے علاوہ میں نے جو بھی کیا تھا وہ رقم کے حصول کے لیے نہیں کیا تھا، بات در پردہ کچھ اور تھی جس پر شاید ہی کوئی یقین کرتا، لیکن اگر میں قبل از وقت وعدہ معاف گواہ بننے کے بعد سب کچھ بتا دیتا تو شاید جیل جانے سے بچ جاتا بصورت دیگر مجھے ان تینوں کا ساتھی ہی گردانا جاتا۔

انسپکٹر، مینیجر کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کی طرف آ گیا۔ وہاں انسپکٹر کے علاوہ دونوں سیکیورٹی گارڈز بھی کھڑے تھے۔ مینیجر وہاں نہیں تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر انسپکٹر نے انہیں جانے کے لیے کہا۔ وہ باہر چلے گئے تو انسپکٹر نے گہری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سرد لہریں میرے جسم کے اندر اترتی جا رہی ہوں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تم معاملے میں ملوث نہیں ہو، تمہیں استعمال کیا گیا ہے۔" اس کے نرم لہجے کو محسوس کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے بھرائی ہوئی آواز میں بات شروع کی۔

"میں وعدہ معاف گواہ بننا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ کو مجھے یقین دلانا ہوگا کہ مجھے سزا نہیں ہوگی۔ درحقیقت میرا اس معاملے میں اتنا زیادہ قصور نہیں۔ میں نے جو بھی کیا، وہ کسی اور نیت سے کیا۔ میرا ارادہ ان کا ساتھ دینے کا نہیں تھا۔" انسپکٹر اب بھی مجھے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

وہ دوبارہ نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے پولیس کی نوکری کرتے ہوئے پندرہ سال گزر گئے ہیں اور میں کسی کے چہرے کو دیکھ کر اس کی دلی کیفیت کے متعلق بخوبی اندازہ لگا لیتا ہوں۔ تمہارے چہرے پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم ڈکیتی میں کسی نہ کسی حد تک ملوث ہو لیکن شاید براہ راست نہیں۔ تمہیں اس کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام منظر عام پر نہیں آنے دوں گا۔ تم سب کچھ کھل کر بتا دو اور فکر نہ کرو، تمہیں سزا نہیں ہوگی۔"

میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ "والدین کی وفات کے بعد جب حالات خراب ہوتے چلے گئے تب مجھے پینتیس چالیس ہزار کی نوکری میں گزارہ کرنا دشوار ترین لگنے لگا۔ پھر میری خالہ نے اپنی لڑکی مجھے دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حنا میری منگیتر تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے پسند کرتے تھے لیکن اچانک ہی تنویر احمد کا رشتہ آ گیا۔ وہ بینک میں مینیجر ہے۔ اس کی تنخواہ ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہے۔ خالو نے فوراً ہاں کر دی لیکن خالہ نے مجھے بتایا کہ اگر میں ایک سال کے دوران اپنی تنخواہ میں ایک لاکھ تک اضافہ کرلوں تو وہ اپنے وعدے پر اب بھی قائم و دائم رہیں گی۔

"میں نے فوراً ہامی بھر لی، لیکن تنخواہ میں اتنا اضافہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے دوسرے بینکوں میں اپلائی کرنا شروع کر دیا لیکن خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے۔ مجبوراً میں نے کمرا کرائے پر دینا شروع کر دیا اور اس دوران ان تینوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے نام برجو، راجو اور تاجو تھے۔ میں نے انہیں کمرا کرائے پر دے دیا اور پھر ان کی گفتگو اتفاقاً سن لی جس میں وہ بینک لوٹنے کی بات کر رہے تھے۔ تذکرہ میرا ہو رہا تھا۔ انہوں نے پہلے میرے بینک کا انتخاب کیا تھا، پھر میرا ایڈریس لے کر گھر آئے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر بینک میں داخل ہوں گے۔ اس کے بعد رقم حاصل کر کے فرار ہو جائیں گے۔ تب میں نے غیر محسوس طریقے سے انہیں ورغلایا کہ وہ سامنے والے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے مینیجر کو یرغمال بنا کر محفوظ طریقے سے ڈکیتی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے میری بات کو سمجھ لیا اور ان کی

urdunovels.com

کرنے کے بعد فرار ہو گئے۔"

انسپکٹر نے پوچھا۔ "یقیناً تم نے ان کے متعلق پہلے سے ہی معلومات لی ہوں گی تاکہ بعد میں انہیں بلیک میل کر سکو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں نے ان سے وہاں کا نام پوچھ لیا تھا جہاں ان کا چھپنے کا ارادہ تھا لیکن سچ بتاؤں تو میں انہیں بلیک میل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔ اگر میں ان سے ایک کروڑ کی رقم ہتھیا لیتا تو وہ کتنا عرصہ چل سکتی تھی؟ لیکن اگر میں بینک میں منیجر لگ جاتا تو ڈیڑھ لاکھ کی تنخواہ مجھے ماہانہ مل سکتی تھی اور میں حنا سے شادی بھی کر سکتا تھا۔ بس میرا منصوبہ اتنا سا تھا کہ ڈکیتی کے بعد ان تینوں کو گرفتار کروا کر اعلیٰ حکام سے درخواست کرتا کہ مجھے بینک میں منیجر کی نوکری دے دی جائے۔"

انسپکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یعنی تم نے سب کچھ منیجر کی پوسٹ حاصل کرنے کے لیے کیا۔ میں تمہاری عقل کی داد دیتا ہوں، لیکن اگر تم وعدہ معاف گواہ بنتے تو بری طرح پھنس جاتے۔ اب بھی میں معاملے کی باقاعدہ تحقیقات کروں گا۔ تم اپنی خالہ کا ایڈریس مجھے بتا دو۔ میں ان سے جلد ملاقات کروں گا تاہم اس سے پہلے ان تینوں کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ اگر تم نے ہمارا ساتھ دیا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ نہ صرف تمہیں سزا سے بچاؤں گا بلکہ بینک کے اعلیٰ حکام سے بات چیت کر کے تمہیں منیجر کی پوسٹ دلوانے کی بھی کوشش کروں گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں ڈاکوؤں کی لوکیشن سے آگاہ کر دیا اور یوں یہ ملاقات اختتام پذیر ہوئی۔

☆☆☆

اگلے دن ان تینوں کو گرفتار کر لیا گیا اور پوچھ گچھ کرنے کے بعد مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میں اپنے گھر آ گیا۔ زندگی دوبارہ معمول پر آنے لگی لیکن مجھے منیجر کی پوسٹ نہیں ملی۔

میں صبح بینک جاتا اور شام کو تھکا ہارا واپس آ جاتا۔ ایک ہفتہ گزر گیا پھر خالہ نے مجھے بتایا کہ خالو حنا کا ہاتھ تنویر احمد کے ہاتھوں میں دینے کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کرنے والے ہیں۔ چونکہ میں ناکام ہو چکا تھا اس لیے گلہ شکوہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔

خالہ واپس چلی گئیں اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں حنا سے بہت محبت کرتا تھا اور وہ بھی مجھ سے کرتی تھی لیکن ہم دونوں مجبور و لاچار تھے۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی تھی اور جیل جاتے جاتے بچا تھا۔ انسپکٹر کا وعدہ محض ایک وعدہ ثابت ہوا تھا، اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ کل منیجر کو درخواست دے دوں گا کہ میری تقرری کسی اور شہر میں کر دی جائے تاکہ میں حنا کی شادی والے دن یہاں نہ ہوں۔

وہ تمام رات میں نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ صبح سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ میں نے چائے پی اور تیار ہو کر بینک آ گیا۔ منیجر نو بجے کے قریب آتا تھا۔ اس وقت تک میں نے درخواست لکھ لی لیکن منیجر نے بینک آنے کے فوراً بعد چپراسی کو بھیج کر مجھے کمرے میں بلا لیا۔ میں نے درخواست جیب میں رکھی اور منیجر کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے دوبارہ چپراسی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بینک کے تمام عملے کو کمرے میں بلا لائے۔ میں پریشان ہو گیا۔ اب مجھے اپنی نوکری خطرے میں پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ میرے خیال میں انسپکٹر نے انہیں تمام معاملے سے آگاہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں تمام عملہ منیجر کے کمرے میں جمع ہو گیا۔ وہ سب معنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد منیجر نے کہنا شروع کیا۔

"نئے سال کا سورج بینک کے کچھ ورکرز کے لیے بہت اچھا ثابت ہونے والا ہے جس میں سرفہرست کیشیئر ہے۔ آپ اسے مبارک باد دیجیے کیونکہ اسے ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ایک بڑے اور معروف بینک کا منیجر بنانے کے لیے لیٹر بھجوا دیا گیا ہے۔ یہ سب کیونکر ہوا شاید اس کے متعلق آپ کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو چکا ہوگا، اگر نہیں ہوا تو میں بتائے دیتا ہوں۔ کچھ دن پہلے جو ایک کروڑ کی ڈکیتی ہوئی تھی، اس میں تین ڈاکو ملوث تھے۔ اگر کیشیئر انہیں نہ پکڑواتا تو شاید رقم واپس نہ ملتی۔ اس کی کاوشوں کی وجہ سے وہ تینوں گرفتار ہوئے اور ایک کروڑ کی رقم بینک کو واپس مل گئی۔ انسپکٹر نے تعریفی کلمات والا لیٹر ہیڈ کوارٹر بھجوایا تھا اور اس میں یہ اپیل بھی کی تھی کہ اسے اس کاوش کے بعد منیجر کی پوسٹ کے لیے منتخب کیا جائے۔ آج صبح مجھے لیٹر موصول ہو گیا اس لیے اپنے کولیگ کو مبارک باد دیجیے جو جلد ہی منیجر بننے والا ہے۔"

تمام عملے نے تحسین بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے مبارک باد دی لیکن میں جلد از جلد یہ خوشخبری خالو کو سنانا چاہتا تھا تاکہ وہ تنویر احمد کو رشتے سے انکار کر دیں ورنہ حنا کے ساتھ میری شادی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے عجلت کے عالم میں اٹھ کر اپنی سیٹ پر رکھے موبائل کی طرف دوڑ پڑا۔

بینک کا عملہ مجھے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

✻✻✻

خوامخواہ

مرزا امجد بیگ

ہمدردی اور محبت یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ کسی بھی شخص کو کچھ بھی کرنے پر آمادہ کر دیتی ہیں... جب یہ دو جذبے یکجا ہو جائیں تو انسان سامنے والے کی ہر ممکن مدد کرنے پر تیار ہو جاتا ہے... اس نے بھی انہی جذبوں کے زیرِاثر ایک خاتون کی مدد کرنے کی ٹھانی... مگر اسے پتا نہیں تھا کہ اس کے لیے "چال" تیار کر لیا گیا ہے... اب اس کی مدد صرف مرزا امجد بیگ ہی کر سکتے تھے...

ناکردہ جرم میں پھنسے ایک شخص کا

وہ گردن جھکائے اور دیوار سے ٹیک لگائے ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ فرش اس کے گھر کا نہیں بلکہ تھانے کی بے رحم حوالات کا تھا۔ اس پر قتل کا الزام تھا اس لیے حوالات میں ملاقات کی غرض سے مجھے تھوڑا ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ پولیس والوں سے کام نکالنے کے لیے سیدھا راستہ ہمیشہ کسی بند گلی میں لے جاتا ہے اس لیے الٹے قدموں واپسی کی راہ لینے سے بہتر ہے خود کو ہی ٹیڑھا کر لیا جائے۔

وہ بھی ابھی گزشتہ روز ہی یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور ملزم سے ملنے تھانے چلا آیا تھا۔ میرا موکل میری آمد سے بے خبر کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

"عدیل!" میں نے معتدل انداز میں اسے پکارا۔

اس نے سر اٹھا کر اداس نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور آنکھوں میں ویرانی جھلک رہی تھی۔ وہ ڈرا سہا انداز میں یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میری پکار کے جواب میں کیا کہے۔

"میرا نام مرزا امجد بیگ ہے اور میں ایک وکیل ہوں۔" میں نے اس کی مشکل کو آسان کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس سارے معاملے کو میں خود دیکھ لوں گا اور اس جھمیلے سے تمہیں باہر نکالنا میری ذمے داری ہے۔ سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

عدیل کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس رنگ میں امید اور مسرت بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر میرے نزدیک آ کر بیچارگی سے بولا۔ "وکیل صاحب! میں نے شازیہ کو قتل نہیں کیا۔"

ہمارے درمیان حوالات کی آہنی سلاخوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اگر مجھے تمہاری بے گناہی کا یقین نہ ہوتا تو اس وقت میں تھانے کے بجائے کہیں اور ہوتا۔"

"بہت شکریہ وکیل صاحب!" وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ "ابو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے لیے کسی

"وکیل کا بندوبست کریں گے۔" اس کی بات مکمل ہونے پر میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "سمجھو کہ یہ بندوبست تو ہو چکا۔ تمہارے والد صاحب کی زبانی مجھے بہت کچھ پتا چلا ہے لیکن میں ان معلومات کو کافی نہیں سمجھتا اسی لیے تم سے ملاقات کرنے یہاں آیا ہوں۔ جرم تم پر بیتی ہے، اس کے بارے میں تم سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "صرف میرے، تمہیں بے قصور سمجھ لینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ تمہاری بے گناہی کو مجھے عدالت میں ثابت بھی کرنا ہوگا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔"

"میں کروں گا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "بتائیں وکیل صاحب! آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟"

"عدیل! مجھے بتاؤ، وقوعہ کی رات کیا ہوا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کسی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات کو بھی نظرانداز نہیں کرنا۔"

"ٹھیک ہے وکیل صاحب!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے اپنے بریف کیس میں سے پین اور نوٹ بک نکالنے کے بعد کہا۔ "عدیل! شروع ہو جاؤ۔"

آئندہ آدھے گھنٹے میں اس نے مجھے پوری تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتا دیا۔ نئی معلومات حاصل ہو جانے کے بعد مجھے پہلے سے زیادہ اس کی بے گناہی کا یقین ہو گیا، تاہم وہ جس نوعیت کے واہیات حالات کا شکار تھا، اس کے پیش نظر یہ کوئی حلوا کیس نہیں تھا۔

بہرکیف، میں نے اس کی کتھا سننے کے بعد درخواست ضمانت اور وکالت نامے پر اس کے دستخط کرائے، اسے پولیس کے تفتیشی حربوں سے محفوظ رہنے کے گر سمجھائے اور تسلی تشفی کے بعد واپس آ گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کیس کا پس منظر آپ کی نذر کرنا چاہوں گا تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہ واضح کر دوں کہ عدیل کی داستان میں سے میں نے چند ایک چیزیں دانستہ آپ سے چھپا لی ہیں جن کا ذکر بعد میں مناسب مواقع پر کیا جائے گا۔ اسی طرح میں نے یہاں کچھ ایسی باتیں بھی شامل کر دی ہیں جو عدیل نے یا اس کے باپ نے مجھے نہیں بتائی تھیں۔ یہ خالصتاً میری تحقیق اور جستجو کا ثمر ہے۔

☆☆☆

میرے موکل عدیل کی عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ وہ ایک دراز قد اور وجیہہ وشکیل نوجوان تھا۔ عدیل نے بی کام کر رکھا تھا اور ایک اکاؤنٹس منیجر (اکاؤنٹنٹ) کی حیثیت سے "بھائی ٹریڈرز" نامی ایک کمپنی میں کام کرتا تھا۔ بھائی ٹریڈرز ایک ملٹی ٹریڈ کمپنی تھی جہاں پرائز بانڈز، منی چینجنگ سے لے کر اسٹاک ایکسچینج وغیرہ تک کے معاملات کو ڈیل کیا جاتا تھا۔ کمپنی کے مالک رمضان بھائی کے بارے میں کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ میچ فکسنگ اور بک میکنگ کے علاوہ حوالہ اور ہنڈی کا دھندا بھی کرتا تھا مگر نہایت ہی احتیاط اور رازداری کے ساتھ۔ گویا اس کا کاروبار "ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، چبانے کے اور" کی عملی تفسیر تھا اور ملزم اسی رمضان بھائی کے حساب کتاب کو چیک کرتا تھا۔

عدیل ایک مختصر فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی والدہ تحسین فاطمہ ایک گھریلو خاتون تھی جبکہ والد ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا، جہاں اسٹیشنری، بک بائنڈنگ اور فوٹو اسٹیٹ جیسے کام ہوتے تھے۔ احسان اللہ کی یہ دکان گارڈن ویسٹ کے علاقے چاندنی چوک میں تھی جو کہ اس کی رہائش گاہ کے نزدیک واقع تھی۔ عدیل کی صرف ایک بہن راحیلہ تھی جو اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ راحیلہ نے انٹر تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور اسی سال اکتوبر میں راحیلہ کی شادی طے تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اس فیملی کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی تھی۔

مقتولہ کا نام شازلین تھا۔ شازلین ایک پرکشش اور حسین وجمیل بیوہ تھی۔ تین سال پہلے اس کے شوہر حسن علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ مرحوم حسن علی ایک چھوٹا بزنس مین تھا۔ وہ شازلین کے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا تھا جس میں نقدی کے علاوہ ایک لگژری اپارٹمنٹ بھی تھا۔ وہ اپارٹمنٹ علامہ اقبال روڈ پر واقع تھا۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد شازلین اس کے کاروبار کو اچھے سے سنبھال نہیں پائی تھی لہٰذا ہاتھ میں موجود رقم کو اس نے ادھر اُدھر انویسٹ کر دیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ اکثر رمضان بھائی کے آفس بھی آیا کرتی تھی۔ بھائی ٹریڈرز کا آفس آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا۔

ملزم عدیل، مقتولہ شازلین کو دل سے پسند کرتا تھا۔ عدیل گزشتہ دو سال سے رمضان بھائی کے پاس کام کر رہا تھا چنانچہ وہ اس کے دھندے کے "سیاہ وسفید" سے اچھی طرح واقف تھا۔ فروری کے اوائل میں رمضان بھائی نے مقتولہ کو اپنے شیشے میں اتارنے کی مہم کا آغاز کیا تو ملزم کے کان کھڑے ہو گئے۔ رمضان بھائی، شازلین کو

...کی جانب لانے کے سہانے خواب دکھا رہا تھا۔
عدیل نے طے کرلیا کہ وہ شازلین کو کسی بڑے نقصان سے بچانے کی کوشش کرے گا۔
عدیل، شازلین کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ بھی جواباً اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔ عدیل کے ایک دوست کا دعویٰ تھا کہ وہ حسینہ عدیل کو پسند کرنے لگی ہے۔ بہرحال، یہ بات غلط نہیں تھی کہ وہ اکثر و بیشتر شازلین کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔
چودہ فروری کی دوپہر شازلین، رمضان بھائی سے ایک طویل میٹنگ کرکے واپس گئی تو عدیل کو کئی طرح کے خدشات نے گھیر لیا۔ وہ اس میٹنگ کی حقیقت سے بخوبی واقف تھا لہٰذا آفس سے چھٹی کرنے کے بعد وہ سیدھا شازلین کے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کی آفس ڈیوٹی دن گیارہ بجے سے شام سات بجے تک کی تھی مگر آف کرتے کرتے آٹھ بج ہی جایا کرتے تھے۔
شازلین کی رہائش علامہ اقبال روڈ پر واقع "ڈائمنڈ اپارٹمنٹس" میں تھی۔ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ بلڈنگ کے چوکیدار علی رضا سے اس کا سامنا ہوا۔ علی رضا ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ بھی تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اجنبی بلڈنگ کے اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ ریسیپشن پر پہنچنے کے بعد عدیل نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔
"مجھے میڈم شازلین سے ملنا ہے۔"
"آپ کا نام؟" گارڈ نے پوچھا۔
"عدیل...... عدیل احسان!" عدیل نے بتایا۔
سیکیورٹی گارڈ نے انٹرکام پر اپارٹمنٹ نمبر 302 سے رابطہ کیا۔ شازلین تھرڈ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر دو میں رہتی تھی۔ دوسری جانب شازلین نے ریسیور اٹھایا تو سیکیورٹی گارڈ نے احترام بھرے لہجے میں کہا۔
"باجی! کوئی عدیل احسان صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"
"عدیل احسان......!" شازلین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ فوری طور پر اسے عدیل احسان کے حوالے سے کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ اس نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔ "آپ عدیل احسان سے میری بات کرائیں۔"
گارڈ نے انٹرکام کا ریسیور عدیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ خود باجی سے بات کرلیں۔"
اگلے ہی لمحے عدیل، شازلین کے رابطے میں آگیا۔

"معاف کیجیے گا۔" عدیل کے "ہیلو" کے جواب میں شازلین نے متحمل انداز میں کہا۔ "میں آپ کو پہچان نہیں پائی ہوں۔ بتائیں، آپ کہاں سے آئے ہیں اور آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"
عدیل نے "بھائی ٹریڈرز" کا حوالہ دینے کے بعد اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ "میڈم! آج رمضان بھائی نے آپ کو جو آئیڈیا دیا ہے، اس میں کئی ایک پیچیدگیاں ہیں۔ میں اسی سلسلے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں تاکہ آپ تگڑے نقصان سے بچ جائیں۔"
"ٹھیک ہے۔" شازلین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ فون گارڈ کو دیں۔"
انٹرکام کا ریسیور عدیل کو تھمانے کے بعد سیکیورٹی گارڈ پارکنگ والے گیٹ کی طرف چلا گیا تھا کیونکہ اسی وقت کسی رہائشی کی گاڑی آگئی تھی جسے پارکنگ کے لیے بیسمنٹ میں جانا تھا۔ علی رضا اسی گاڑی کے لیے گیٹ کھولنے گیا تھا۔ چنانچہ عدیل اور شازلین کے درمیان ہونے والی گفتگو وہ سن نہیں سکا تھا۔ بہرحال، جب وہ دوبارہ ریسیپشن پر آیا تو عدیل نے اس سے کہا کہ وہ میڈم سے بات کرلے۔
سیکیورٹی گارڈ نے شازلین سے بات کی اور اس کی اجازت کے بعد عدیل کو اپارٹمنٹ نمبر 302 کی طرف جانے دیا۔ عدیل لفٹ کے ذریعے تھرڈ فلور پر پہنچ گیا۔
شازلین نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کی تواضع کے لیے چائے، پانی اور بسکٹس وغیرہ لے آئی۔ گفتگو کے دوران میں عدیل نے شازلین کو بتایا کہ رمضان بھائی نے شیئرز کے حوالے سے اسے جو گیم بتایا ہے، وہ سراسر ایک دھوکا ہے۔ اس کھیل میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ اگر آپ نے رمضان بھائی کے مشورے پر عمل کیا تو آپ کی رقم ڈوب جائے گی...... وغیرہ۔
"لیکن رمضان بھائی کی ہر پیشگوئی ہمیشہ درست ثابت ہوئی ہے۔" شازلین نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "میں انہیں اچھی طرح آزمانے کے بعد ہی اس کام کے لیے تیار ہوئی ہوں۔"
"یہ بہت اونچے درجے کا کھیل ہے میڈم!" عدیل نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "آسانی سے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا اور جب آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا، اس وقت تک بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ ویسے آپ نے کتنی رقم لگانے کے لیے آمادگی ظاہر کی ہے؟"
"رمضان بھائی تو کم از کم دس لاکھ کی بات کررہے

urdunovels.com

تھے۔" شازلین نے بتایا۔ "لیکن میں نے فی الحال پانچ لاکھ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یہ بھی اچھی خاصی رقم ہے۔" عدیل نے کہا۔ "میرا کام تھا آپ کو کسی بڑے خطرے سے آگاہ کرنا۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔"

"میں جان سکتی ہوں کہ آپ مجھے نقصان سے بچانے کے لیے اپنے باس سے غداری کیوں کر رہے ہیں؟" شازلین نے ایک اہم سوال کیا۔

"انسانی ہمدردی۔" عدیل نے مختصر جواب دیا۔

"رمضان بھائی نے شیئرز مارکیٹ کے حوالے سے مجھے انویسٹمنٹ کی جو پیشکش کی ہے، یہ ان کا کوئی پہلا پروجیکٹ تو ہوگا نہیں؟" شازلین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت تحیرانہ انداز میں کہا۔ "اگر میں آپ کی بات کو درست مان لوں تو اس کا مطلب ہے، وہ اس سے پہلے بھی کئی افراد کو لوٹ چکے ہوں گے۔ کیا آپ ہر جگہ انسانی ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کرتے؟"

"مجھے ابھی حال ہی میں رمضان بھائی کے اس نئے پیترے کا علم ہوا ہے۔" عدیل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور......اور......!"

"اور کیا؟" شازلین نے زیرِلب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"انسانی ہمدردی بھی ہر جگہ مناسب نہیں لگتی میڈم!" عدیل نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"مطلب یہ کہ......!" شازلین نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔ "آپ یہ نیک کام صرف خاص لوگوں کے لیے کرتے ہیں؟"

عدیل کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ جھجکتے انداز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "جی میڈم!"

"ٹھیک ہے عدیل صاحب!" شازلین نے اس کے چہرے پہ نگاہ جما کر کہا۔ "آپ مجھے رمضان بھائی کے طریقۂ واردات کے بارے میں مکمل کر بتا سکیں۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گی کہ مجھے رمضان بھائی کی بات ماننا ہے یا آپ کے کہے پہ یقین کرنا ہے۔"

آئندہ دس منٹ میں عدیل نے شازلین کو رمضان بھائی کے خوبصورت جال اور پُرکشش چال کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا اور آخر میں کہا۔

"میڈم! یہ آپ کی بدقسمتی یا رمضان بھائی کی خوش قسمتی ہے کہ آپ آخری پانچ افراد میں سے ایک ہیں جن کے لیے رمضان بھائی کی ہر پیشگوئی درست ثابت ہوئی ہے۔"

"عدیل صاحب! آپ نے مجھے چالیس افراد کے ساتھ کھیلے جانے والے جس گھناؤنے کھیل کے بارے میں آگاہ کیا ہے، اسے میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔" شازلین نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ "میں نے تو آج صبح بینک سے پانچ لاکھ روپے نکلوا بھی لیے تھے لیکن میں نے اس رقم کے بارے میں رمضان بھائی کو کچھ نہیں بتایا۔ میں ایک دن مزید سوچنا چاہتی تھی۔ اللہ نے میری مدد کی اور آپ رحمت کا فرشتہ بن کر میرے پاس آگئے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔"

"میں نے کسی احسان کی نظر سے یہ کام نہیں کیا میڈم!" عدیل نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "آپ بہت اچھی ہیں اور میرا ماننا ہے کہ...... اچھے لوگوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

اپنے لیے عدیل کے دل میں موجزن پسندیدگی کے جذبات کو میڈم شازلین نے بہت دور تک محسوس کر لیا تھا۔ اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

"شکریہ عدیل صاحب! اس موضوع پر ہم بعد میں تفصیل سے بات کریں گے۔"

شازلین کی جانب سے عدیل کے لیے یہ رخصتی کا واضح اشارہ تھا۔ سو، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپارٹمنٹ نمبر 302 سے باہر نکل گیا۔

اسی روز رات گئے عدیل احسان کو شازلین کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ اس موقع پر میں نے اپنے مؤکل عدیل احسان کی ضمانت کروانے کی حتی الامکان سعی کی مگر اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ پولیس نے جائے وقوعہ سے ملزم کے خلاف اچھا خاصا مواد حاصل کر لیا تھا چنانچہ عدالت نے ملزم کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا تھا۔

میں ایسی ہی توقع کر رہا تھا۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے، خاص طور پہ جب کرائم سین اور موقع کے گواہ اس کی مخالفت میں کھڑے ہوں تو پھر ضمانت منظور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ شازلین کی موت چودہ فروری کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع

ہوئی تھی۔ اسے ایک خطرناک زہر پوٹاشیم سائنائڈ کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی لاش بیڈ روم میں پڑی ملی تھی۔

اپارٹمنٹ کے ڈرائنگ روم میں سینٹر ٹیبل پر رکھے چائے کے برتنوں کا جب لیبارٹری ٹیسٹ کیا گیا تو ایک کپ میں پوٹاشیم سائنائڈ کے آثار مل گئے تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ مقتولہ شازلین کی موت زہریلی چائے پینے سے واقع ہوئی تھی۔ پوٹاشیم سائنائڈ (KNC) والے چائے کے کپ پر مقتولہ کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے جبکہ دوسرے کپ پر ملزم عدیل احسان کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ پولیس کے مطابق ملزم نے مقتولہ کی نظر بچا کر اس کی چائے میں پوٹاشیم سائنائڈ نامی زہر ملا دیا تھا۔

اپارٹمنٹ نمبر 302 کے ڈرائنگ روم کے مختلف حصوں میں بھی ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے جس سے پولیس کا کام کافی آسان ہو گیا تھا۔

اگرچہ واقعاتی شہادتیں اور دیگر معاملات میرے موکل کے خلاف جا رہے تھے لیکن میں مطمئن تھا کہ عدیل، شازلین کے قتل میں ملوث نہیں۔ میرا یہ اطمینان اور عدیل کے بے گناہ ہونے کا یقین ہم دونوں کے حق میں تھا۔

وقوعہ کے روز ملزم، مقتولہ کو جس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا، میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے بھی کہ آپ رمضان بھائی جیسے فراڈ لوگوں کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔ ایسے دھوکے باز افراد زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں۔

رمضان بھائی اپنے گیم کے لیے چالیس ایسے افراد کا انتخاب کرتا تھا جو صاحب استطاعت ہوں اور دس بیس لاکھ نکالنا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ وہ باری باری ان سے فون پر رابطہ کرتا اور انہیں راتوں رات اور زیادہ پیسے کمانے کا خواب دکھاتا۔

''اسٹاک ایکسچینج کے سیٹ اپ میں ایک ہنرمند بندے سے میری دوستی ہو گئی ہے، وہ اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ آئندہ روز کس کمپنی کے شیئرز اوپر جائیں گے اور کون سے شیئرز کی ویلیو گرے گی۔'' وہ سب سے اسی نوعیت کی گفتگو کرتا۔ ''اگر آپ مال بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو میں یہ اہم ٹپس آپ کو دے سکتا ہوں اور وہ بھی معمولی کمیشن پر۔''

جواب میں رمضان بھائی کو ملے جلے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ...... ''یہ معلومات اگر آپ صرف کمیشن پر کیوں اکتفا کرنا چاہتے ہیں؟ آپ اپنی جیب سے پیسا لگائیں اور خوب دولت کمائیں یا پھر یہ پوچھا جاتا کہ وہ بندہ خود کیوں نہیں اس کھیل میں حصہ لیتا؟ دوسروں کی مدد کرنے کے بجائے اسے اپنے فائدے کے بارے میں سوچنا چاہیے...... وغیرہ۔''

رمضان بھائی نے پہلے سے ہر سوال کا جواب سوچ رکھا ہوتا تھا جیسا کہ...... ''اس بندے کے پاس زیادہ سرمایہ نہیں ہے اور اسٹاک ایکسچینج کا کھیل 'جتنی گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا' کی بنیاد پر چلتا ہے۔ جو لوگ لاکھوں اور کروڑوں کی انویسٹمنٹ کرتے ہیں، زیادہ فائدہ بھی وہی اٹھاتے ہیں۔''

بعض لوگ یہ بھی کہتے۔ ''وہ بندہ غلط بتا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے اس کے زیادہ تر تکے تیر ثابت ہو جاتے ہوں۔''

ایسے تیز دماغ لوگوں کو گھیرنے کا گر بھی رمضان بھائی کو آتا تھا۔ وہ جواب میں بڑے اعتماد سے کہتا۔ ''اگر آپ کو اس بندے کی رسائی پر کسی قسم کا کوئی شک ہے تو آزما کر دیکھ لیں۔''

''وہ کیسے؟'' رمضان بھائی سے پوچھا جاتا۔

''میرے سورس نے مجھے بتایا ہے کہ کل فلاں کمپنی کے شیئرز اوپر جانے والے ہیں۔'' وہ اسٹاک ایکسچینج والے فرضی بندے کو اپنا ''سورس'' کہہ کر متعارف کراتا تھا۔ ''آپ کل چیک کر لیجیے، آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میرا سورس تک بندی کرتا ہے یا پھر اس کی رسائی بہت اندر تک ہے۔''

اس کے بعد رمضان بھائی مذکورہ کمپنی کا نام بھی بتا دیتا تھا۔ یہ ایک طرح کی نفسیاتی چال تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی بتائی ہوئی کمپنی کے شیئرز کا ریٹ یا تو اوپر جاتا تھا یا پھر نیچے۔ تیسرا کوئی آپشن تھا ہی نہیں۔ واضح رہے کہ چالیس افراد میں سے بیس کو وہ بتاتا تھا کہ اس کمپنی کے شیئرز کی قیمت بڑھے گی اور بیس کو بتاتا تھا۔ قیمت گرے گی۔ آئندہ روز بیس افراد کے لیے اس کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی تھی اور باقی بیس کے لیے غلط۔ اس طرح بیس افراد رمضان بھائی پر بھروسا نہیں کرتے تھے اور باقی بیس کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی کیونکہ وہ رمضان بھائی کی پیشگوئی کو درست ہوتا دیکھ چکے تھے اور اب وہ انہی بیس کو اپنا ٹارگٹ بناتا تھا۔

طریقہ بالکل پہلے جیسا تھا۔ دس افراد کو وہ بتاتا کہ فلاں کمپنی کے شیئرز اوپر جانے والے ہیں اور دس سے کہتا

کہ اس کمپنی کے شیئرز نیچے گرنے والے ہیں لہٰذا ان میں سے دس افراد اس پُراسرار کھیل کا حصہ نہ رہتے لیکن باقی دس لوگوں کا یقین اور پختہ ہو جاتا۔

اگلے مرحلے میں ان دس میں سے پانچ پیچھے ہٹ جاتے مگر باقی پانچ کو صد فیصد یقین آ جاتا کہ رمضان بھائی کا وہ بندہ بہت ہی کام کا ہے۔ ہر بار اس کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی ہے۔ یہی پانچ افراد رمضان بھائی کا اصل ٹارگٹ ہوتے تھے جن میں سے کوئی ایک یا دو بھی رمضان بھائی کے بتائے ہوئے طریقے سے اسٹاک ایکسچینج میں پیسا لگانے کے لیے تیار ہو جاتے تو وہ ایک ہی جھٹکے میں بیس تیس لاکھ روپے کما لیتا تھا۔

واضح رہے کہ یہ کہانی جس دور کی ہے تب اسٹاک ایکسچینج کا بزنس آج کی طرح ڈیجیٹل اور ٹرانسپیرنٹ نہیں ہوا کرتا تھا۔ شیئرز کی خرید و فروخت کے مراحل میں کئی بروکر اور ایجنٹس بھی موجود ہوتے تھے، اسی لیے فراڈ کے امکانات زیادہ تھے۔ رمضان بھائی ایسے ہی مصنوعی بروکرز اور ایجنٹس کو بیچ میں رکھ کر لوگوں کی رقوم سے کھیلتا تھا اور جہاں تک کسی انسان کی پیشگوئی کا تعلق ہے تو یہ کوئی سائنسی فارمولا نہیں کہ ہر بار پیشگوئی سولہ آنے درست ہی ثابت ہوگی۔ اگر دس باتیں ٹھیک نکل آئیں تو ایک بات غلط بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ رمضان بھائی اسی "ہیومن ایرر" کے پیچھے چھپ کر شکار کرتا تھا۔

مگر جو لوگ رمضان بھائی کے سورس سے متاثر ہو کر اپنی رقوم کو اسی کے ذریعے شیئرز مارکیٹ میں لگاتے تھے یعنی ان کے اپنے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پچھلے دو ماہ کی "محنت" کے بعد رمضان بھائی نے شازمین کو پوری طرح اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ شازمین، رمضان بھائی کے سورس کی انکوائری سے اس قدر متاثر ہو گئی تھی کہ اس نے بینک سے پانچ لاکھ روپے بھی نکلوا لیے تھے۔ اگر وقوعہ کی رات فضیل احسان اسے خبردار کرنے اس کے اپارٹمنٹ پر نہ پہنچ جاتا تو اگلی صبح اس نے مبلغ پانچ لاکھ روپے رمضان بھائی کے حوالے کر دینا تھے۔

زندگی اگر مگر اور لیکن کے تابع نہیں ہے۔ اس کا اپنا ایک طے شدہ شیڈول ہے اور وہ اسی کے مطابق آگے بڑھتی ہے۔ میرے موکل کی کوشش کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس نے خلوص نیت کے ساتھ مقتولہ کو رمضان بھائی کے ہاتھوں لٹنے سے تو بچا لیا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے روز وہ خود پولیس کسٹڈی میں ہوگا اور شازمین منوں مٹی کے نیچے...... بس، یہی زندگی کی حقیقت ہے۔

☆☆☆

کم و بیش دو ماہ کے بعد اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا بیان حلفی ریکارڈ کیا گیا۔

"پراسیکیوشن!" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایکوزڈ باکس (ملزم والے کٹہرے) کے نزدیک چلا گیا اور جارحانہ انداز میں ملزم پر جرح شروع کر دی۔

"تم مقتولہ کو کتنے عرصے سے جانتے تھے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"پانچ چھ ماہ سے۔" ملزم نے جواب دیا۔ "جب سے اس نے "بھائی ٹریڈرز" پر آنا شروع کیا تھا۔"

"اور اس جان پہچان کی نوعیت کیا تھی؟"

"نوعیت...... کچھ بھی نہیں۔" ملزم نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "میں بھائی ٹریڈرز میں ایک اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور وہ میرے باس رمضان بھائی کے پاس اپنے کام سے آیا کرتی تھی۔"

"مطلب یہ کہ مقتولہ سے تمہارے ذاتی تعلقات نہیں تھے؟"

ملزم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

"چودہ فروری کی شام کو یاد کرو۔" وکیل استغاثہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں استفسار کیا۔ "تم اس روز مقتولہ سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ پر گئے تھے، آٹھ اور نو بجے کے درمیان۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" ملزم نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "میں لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچا تھا۔"

"کیا تم اس سے پہلے بھی مقتولہ سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ پر جاتے رہتے تھے؟" وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

ملزم نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

"جب مقتولہ سے تمہارے ذاتی تعلقات نہیں تھے تو تم وقوعہ کی شام اس کے اپارٹمنٹ پر کیا کرنے گئے تھے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "معزز عدالت یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ مقتولہ کی رہائش گاہ کے بارے میں تمہیں کیسے معلوم ہوا تھا؟"

"اپنے اپارٹمنٹ کے بارے میں تو اس نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔" ملزم نے جواب دیا۔ "جب وہ رمضان

بھائی کے آفس آتی تھی تو مجھ سے بھی اس کی بات چیت ہو جاتی تھی۔ وقوعہ کی شام میں اسے ایک بڑے خطرے سے آگاہ کرنے گیا تھا۔“

ملزم نے عدالت کے سامنے جو حلفیہ بیان دیا تھا، وہ میری ہدایات کے عین مطابق تھا اور وہ اسی کی روشنی میں وکیلِ استغاثہ کی جرح کا بھی سامنا کر رہا تھا۔

”اوہ...... تو تم مقتولہ کی جانب بڑھنے والے خطرات سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔“ وکیلِ استغاثہ نے طنز آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں اس کا بہت خیال تھا۔“

”ایسا ہی سمجھ لیں وکیل صاحب!“ ملزم نے مختصر جواب دیا۔

”میرے سمجھ لینے سے بات نہیں بنے گی۔“ وکیلِ استغاثہ نے زور دے کر کہا۔ ”عدالت تمہارے دوٹوک جواب کا انتظار کر رہی ہے۔ تمہیں مقتولہ کے فائدے اور نقصان سے دلچسپی تھی یا نہیں؟“

”آبجیکشن یور آنر!“ میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”پبلک پراسیکیوٹر میرے موکل کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ملزم کو مقتولہ کا خیال تھا یا نہیں، اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملزم وقوعہ کی شام کس مقصد سے مقتولہ کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ استغاثہ کی جانب سے سوال بھی یہی آیا تھا مگر میرے فاضل دوست اپنے سوال کو فراموش کر کے فروعی باتوں میں الجھ گئے ہیں۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ملزم کو مقتولہ کا خیال تھا اسی لیے تو وہ اس شام مقتولہ کو کسی خطرے سے باخبر کرنے گیا تھا۔“

”آبجیکشن سسٹینڈ!“ جج نے میرے اعتراض کو درست مانتے ہوئے وکیلِ استغاثہ سے کہا۔ ”پراسیکیوشن اپنے سوال پر فوکس کریں۔“ وکیلِ استغاثہ نے ناپسندیدہ نظر سے گھور کر مجھے دیکھا پھر ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اپنے سوال کو دہرا دیا۔

”تم وقوعہ کی شام مقتولہ کو کس خطرے سے باخبر کرنے گئے تھے؟“

آئندہ دو منٹ میں میرے موکل عدیل احسان نے معزز عدالت کو رمضان بھائی کے گھناؤنے کھیل کے بارے میں بتا دیا اور آخر میں کہا۔

”میں نہیں چاہتا تھا کہ مقتولہ شازلین، رمضان بھائی کے جال میں پھنس کر اپنے پانچ لاکھ روپے گنوا بیٹھے اسی لیے میں اسے حقیقت بتانے اس کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا۔ میری وہ کوشش بروقت تھی کیونکہ اگر میں اس شام مقتولہ کو حقیقتِ حال سے آگاہ نہ کرتا تو وہ اگلے روز پانچ لاکھ روپے رمضان بھائی کے حوالے کر دیتی۔ شازلین نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بینک سے پانچ لاکھ روپے نکلوا کر اپنے اپارٹمنٹ میں رکھے ہوئے تھے۔“

”یور آنر! ملزم نے اپنے سیٹھ رمضان بھائی کے فراڈ کے حوالے سے جو کہانی سنائی ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وکیلِ استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”رمضان بھائی کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔ آئندہ پیشی پر انہیں گواہی کے لیے عدالت میں بلایا جائے گا، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔

”تم نے پوٹاشیم سائنائڈ کہاں سے حاصل کیا تھا؟“

”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ ملزم نے جواب دیا۔

”پوٹاشیم سائنائڈ وہ زہر ہے جو مقتولہ کی ہلاکت کا سبب بنا تھا۔“ وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے بارے میں تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔“

بات کے اختتام پر وکیلِ استغاثہ نے سوالیہ نظر سے عدیل کی طرف دیکھا تو وہ بیزاری سے بولا۔ ”میں آپ کو جواب دے چکا ہوں وکیل صاحب!“

”کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہو کہ کھارادر کے ایک صراف ادریس علی سے تمہارے گہرے مراسم ہیں؟“ وکیلِ استغاثہ نے ملزم کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر استفسار کیا۔

”میں انکار نہیں کروں گا۔“ ملزم نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”ادریس علی سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ وہ ایک قابلِ بھروسا سنار ہیں۔ میں نے اپنی بہن کی شادی کا زیور انہی سے بنوایا ہے۔“

”اور یہی ادریس علی گولڈ میکنگ بھی کرتے ہیں؟“

”ظاہر ہے۔“ عدیل نے کہا۔ ”جب وہ سنار ہیں تو طلائی زیورات بنانا ان کے پیشے میں شامل ہے۔“

”زیورات بیچنا اور زیورات بنانا دو الگ شعبے ہیں۔“ وکیلِ استغاثہ نے اپنے سوال کے زاویے کو بدلتے ہوئے ملزم سے پوچھا۔ ”گولڈ میکنگ سے میری مراد یہ تھی

کہ وہ طلائی زیورات کی تیاری کے لیے خام سونے کی صفائی ستھرائی کا کام بھی اپنے ہی کارخانے میں کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔" ملزم نے اکتاہٹ آمیز انداز میں جواب دیا۔ "میں نے کبھی اس بارے میں ان سے سوال نہیں کیا اور نہ ہی میں نے ان کے کارخانے کی سیر کی ہے جو ان کیمیکل چیزوں کا مجھے علم ہو۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!" میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اس وقت عدالت میں شازلین مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست ملزم کو طلائی زیورات کی تیاری پر گیان دینے میں مصروف ہیں۔ میرے نزدیک یہ معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔"

"پراسیکیوشن!" جج نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا طلائی زیورات کی تیاری کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے جنابِ عالی!" وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ "کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ شازلین کی موت کا سبب پوٹاشیم سائنائڈ بتایا گیا ہے۔ وقوعہ کی شام مقتولہ نے جو چائے پی، اس کپ میں بھی اس خطرناک زہر کی موجودگی پائی گئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس روز مقتولہ اور ملزم نے ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پی تھی اور ملزم والے کپ میں پوٹاشیم سائنائڈ کے آثار نہیں پائے گئے تھے اور...... اور......!" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر انکشاف انگیز لہجے میں اضافہ کر دیا۔ "گولڈ کی صفائی کے پروسس میں پوٹاشیم سائنائڈ استعمال کیا جاتا ہے جو ہر سنار کے پاس ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سنار کا دوست ہو تو اس کے لیے یہ زہریلا کیمیکل حاصل کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ملزم معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ کھارادر کے سنار اویس علی سے اس کے دیرینہ مراسم ہیں...... مجھے اور کچھ نہیں کہنا جنابِ عالی!"

جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ڈیفنس......!"

"جنابِ عالی! کچھ کہنے سے پہلے میں اپنے فاضل دوست سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جج سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو۔"

"پرمیشن گرانٹڈ!" جج نے متحمل انداز میں کہا۔

میں نے روئے سخن وکیلِ استغاثہ کی جانب موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتا سکتے ہیں کہ خطرناک زہر پوٹاشیم سائنائڈ کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ بدکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے کبھی اسے چکھا نہیں ہے۔"

"اگر اتفاق سے چکھ لیتے تو پھر یہاں نہ ہوتے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ میری بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ نہ وہ الفاظ اور نہ ہی انداز۔ میں نے اس کے ردعمل کو نظرانداز کیا اور جج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یور آنر!" میں نے توانا لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "پوٹاشیم سائنائڈ ایک ایسا سریع الاثر اور مہلک زہر ہے کہ آج تک اس کے ذائقے کے حوالے سے معلومات حاصل نہیں کی جا سکیں۔ خطرناک ادویہ کے ٹیسٹ کے لیے کسی زمانے میں کتوں، بلیوں اور چوہوں وغیرہ کی قربانی دی جاتی تھی۔ آج کل یہی تجربات ان قیدیوں پر کیے جاتے ہیں جنہیں موت کی سزا سنا دی گئی ہو اور ان کا کوئی والی وارث بھی نہ ہو یعنی ان کی ہلاکت سے کسی کو فرق نہ پڑتا ہو۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"چند سال پہلے ایک ایسا ہی تجربہ کیا گیا تھا۔ سزائے پھانسی کے ایک لاوارث مجرم کو پوٹاشیم سائنائڈ کا ذائقہ معلوم کرنے کے لیے ایک ٹرائل سے گزارا گیا۔ اس کے سامنے ایک کاغذ رکھا گیا جس پر چار ذائقے درج تھے یعنی کڑوا، میٹھا، نمکین اور پھیکا۔ اس زہر کی خوراک دینے سے پہلے اس سے کہا گیا کہ وہ جیسا محسوس کرے، اس ذائقے پر انگلی رکھ دے۔ جب اس کی زبان پر پوٹاشیم سائنائڈ ڈالا گیا تو اس بے چارے کو انگلی اٹھانے کی بھی مہلت نہ مل سکی اور وہ فوراً سے پیشتر موت کے منہ میں چلا گیا۔"

میں نے سنسنی خیز انداز میں اپنی بات مکمل کی تو جج نے دلچسپی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ "ڈیفنس اس تفصیل سے کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟"

"دو اہم پوائنٹس جنابِ عالی!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "نمبر ایک...... میرے موکل نے مقتولہ شازلین کی چائے میں پوٹاشیم سائنائڈ نہیں ملایا تھا۔ نمبر دو...... پراسیکیوشن نے میرے موکل کے سنار اویس علی سے پوٹاشیم سائنائڈ حاصل کرنے کا جو قصہ سنایا ہے، وہ ایک من

گھڑت کہانی ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ابھی اور اسی وقت ثابت بھی کرسکتا ہوں۔"

ادھر میری بات مکمل ہوئی، ادھر کمرائے عدالت میں ایک شور سا اٹھا۔ وہاں موجود لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ جج نے اس موقع پر اپنے چوبی ہتھوڑے کا استعمال ناگزیر جانا۔

"آرڈر ان مائی کورٹ پلیز!" جج نے بہ آواز بلند کہا۔ "آرڈر، آرڈر!"

اگلے ہی لمحے کورٹ روم کو سانپ سونگھ گیا۔

"ڈیفنس اپنے دعوے کو ثابت کرے۔" جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے فراخدلی سے کہا۔

"جنابِ عالی!" میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "جیسا کہ میں نے دو اہم پوائنٹس کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک سیدھا اور سادہ ہے جبکہ دوسرا خاصا پیچیدہ اور وضاحت طلب ہے۔ میں پہلے اسی کو بیان کرنا چاہوں گا یعنی پوائنٹ نمبر دو۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سونے کی کان کنی (گولڈ مائننگ) کے دوران میں جو سونا ہاتھ لگتا ہے اسے کچ دھات یا خام دھات یا اور (ore) کہا جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ استعمال کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی دیکھنے کے لائق چنانچہ صنعتی پیمانے پر اس کی صفائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس پروسس کو "سائنائڈیشن" یا "گولڈ لیچنگ" کہا جاتا ہے۔ سائنائڈیشن کے دوران میں سونے کی کچ دھات کو سوڈیم سائنائڈ (NaCN) کے نسبتاً کمزور محلول کے اندر ڈبویا جاتا ہے جس کے نتیجے میں سونے کے ساتھ چپکی ہوئی معدنیاتی آلائشیں الگ ہوجاتی ہیں۔ اس طرح خالص سونا حاصل کرلیا جاتا ہے۔ گولڈ لیچنگ کے اس پروسس میں ایک انتہائی خطرناک اور جان لیوا گیس بھی خارج ہوتی ہے۔ اس گیس کو "پروسک ایسڈ" یا سادہ الفاظ میں ہائیڈروجن سائنائڈ (HCN) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک بے رنگ گیس ہے...... یور آنر! میں معذرت خواہ ہوں کہ میری وضاحت میں کیمسٹری کچھ زیادہ ہی آگئی ہے مگر یہ ضروری تھا کیونکہ سنار جب محدود پیمانے پر سونے کی صفائی کا کام کرتے ہیں تو وہ لوگ اس مقصد کے لیے پوٹاشیم سائنائڈ نہیں بلکہ سوڈیم سائنائڈ کا استعمال کرتے ہیں جبکہ مقتولہ شاز لین کی لیبارٹری رپورٹ کے مطابق اسے پوٹاشیم سائنائڈ کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے۔ اگر لیبارٹری ٹیسٹ کی صحت پر شک نہ کیا جائے تو پراسیکیوشن کی سنائی ہوئی کہانی فلاپ، بوگس اور انتہائی درجے کی جھوٹی ثابت ہوجاتی ہے۔ اب میں آتا ہوں نمبر ایک پوائنٹ کی طرف......!" میں نے ایک بار پھر چند لمحات کا توقف کیا اس کے بعد جج سے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے دو، چار ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، اگر پراسیکیوشن کو کوئی وقت یا اعتراض نہ ہو تو۔"

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ "آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

وکیل استغاثہ نے باول ناخواستہ کہا۔ "نو آبجیکشن یور آنر!"

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا ہوتا ہے چنانچہ میری فرمائش پر اس کیس کا تفتیشی افسر وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کا نام منظور حسین تھا اور عہدے کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔

"آئی او صاحب!" میں نے انکوائری آفیسر کے چہرے پر نگاہ جما کر پہلا سوال کیا۔ "ماشاء اللہ آپ ایک تجربہ کار پولیس آفیسر ہیں، آپ جانتے ہیں کہ ہر جرم کا کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا چاہیں گے کہ میرے موکل نے مقتولہ شاز لین کی جان کیوں لی ہوگی؟ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے موکل پر قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے ورنہ میں تو جانتا ہوں کہ ملزم عدیل احسان بے گناہ ہے اور میں اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہی یہاں ہوں۔"

"ملزم اور مقتولہ کے بیچ خوشگوار تعلقات استوار ہوچکے تھے۔ مقتولہ یہی سمجھ رہی تھی کہ ملزم اس کے ساتھ سنجیدہ ہے مگر ملزم کی نیت میں فتور تھا۔ وہ مقتولہ کو ایک بڑی مچھلی سمجھ کر اس کے نزدیک آیا تھا پھر جیسے ہی اسے پتا چلا کہ مقتولہ کے اپارٹمنٹ میں پانچ لاکھ روپے کیش کی صورت رکھے ہوئے ہیں تو اس نے وقوعہ والی شام کو موقع غنیمت جانا اور مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ مطلوبہ رقم کے ساتھ وہاں سے فرار ہوگیا۔"

"آئی او صاحب! آپ کی کہانی تو وکیل استغاثہ کی کہانی سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔" میں نے مسخرانہ انداز میں کہا۔ "میں تو ان کی سنائی ہوئی کہانی کی سرجری میں مصروف تھا کہ آپ نے میرے لیے ایک نئی جاب نکال دی ہے، خیر......!" دم بھر کے لیے رک کر میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''آپ کا معاملہ زیادہ سنگین نظر آرہا ہے لہٰذا پہلے آپ کے بیان کی جرح کر لیتے ہیں...... تو بتائیں، آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ملزم اور مقتولہ کے درمیان کسی طرح کا جھوٹا یا سچا عشق چل رہا تھا؟''

''اس بارے میں ملزم کے پاس رمضان بھائی نے پولیس کو بتایا تھا۔'' آئی او نے جواب دیا۔

''آئی او صاحب! آپ تو بہت دور کی کوڑی لائے ہیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس کے بارے میں، میں رمضان بھائی کو چیک کرلوں گا۔ آپ فی الوقت معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ یہ جانکاری آپ کو کہاں سے ملی کہ دو مئی کی شام مقتولہ کے اپارٹمنٹ میں پانچ لاکھ روپے بصورت کیش موجود تھے؟''

''یہ بات ملزم نے خود اپنے بیان میں پولیس کو بتائی تھی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''استغاثہ کی چارج شیٹ کے ساتھ منسلک رپورٹ کے مطابق آپ نے دو مئی کی رات ساڑھے گیارہ بجے ملزم کو اس کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا تھا۔ کیا آپ نے ملزم کے پاس سے وہ پانچ لاکھ روپے برآمد کرلیے تھے؟ پولیس کی رپورٹ میں اس رقم کا کہیں ذکر نہیں ہے۔''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ملزم نے گرفتاری سے پہلے ہی وہ رقم کہیں ٹھکانے لگا دی تھی۔''

''کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پانچ لاکھ روپے ملزم ہی نے مقتولہ کے اپارٹمنٹ سے اڑائے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس واقعے کا کوئی ٹھوس ثبوت ہے آپ کے پاس کہ وہ رقم میرا موکل ہی وہاں سے لے کر گیا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''جائے وقوعہ یعنی مقتولہ کے اپارٹمنٹ کی دو بار اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ ایک مرتبہ ملزم کی گرفتاری سے پہلے اور دوسری دفعہ ملزم کے بیان کے بعد مگر وہ خطیر رقم ہمیں کہیں نہیں ملی تھی جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ رقم کے غائب میں ملزم ہی کا ہاتھ ہے۔''

''یہ...... نہیں...... بالکل نہیں۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''یہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ آپ کا قیاس ہے کہ پانچ لاکھ روپے کے حصول کی خاطر میرے موکل نے مقتولہ شازلین کا خون کیا اور وہ رقم لے کر وہاں سے فرار ہو گیا کیونکہ آپ ملزم کے پاس سے پانچ لاکھ روپے برآمد نہیں کرسکے تھے۔ آپ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کسی اور شخص نے وہ رقم کہیں اِدھر اُدھر کردی ہو۔ بہرکیف......!'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آئی او صاحب! پولیس کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق مقتولہ کے ڈرائنگ روم میں رکھی سینٹر ٹیبل پر چائے کی جو دو پیالیاں پڑی ہوئی ملی تھیں، ان میں سے ایک پر مقتولہ کے اور دوسری پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود تھے جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کس پیالی میں کس نے چائے پی تھی۔ علاوہ ازیں مقتولہ کے فنگر پرنٹس والی پیالی میں ایک زوداثر زہر کے آثار بھی پائے گئے تھے۔ وہی زہر مقتولہ کی موت کا سبب بنا تھا۔ میرا اشارہ پوٹاشیم سائنائیڈ کی طرف ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''نہیں، آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے وکیل صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ مقتولہ کے ڈرائنگ روم کے مختلف حصوں پر بھی ملزم کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ملزم کے فنگر پرنٹس کی وقوع پذیری صرف چائے کی پیالی تک ہی محدود نہیں تھی...... ایم آئی رائٹ؟''

آئی او نے ترنت جواب دیا۔ ''یس سر!''

''کیا مقتولہ کے بیڈروم کے اندر بھی کہیں آپ کو ملزم کے فنگر پرنٹس کا سراغ ملا تھا؟'' میں نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا اور اس کے گرد جرح کا گھیرا تنگ کرنے لگا۔

''نو سر!'' اس نے جواب دیا۔

''جبکہ مقتولہ شازلین کی لاش آپ کو بیڈروم میں اس کے بیڈ پر پڑی ملی تھی؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ اور ملزم نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پی تھی۔ اس کے بعد مقتولہ وہاں سے اٹھ......''

''وضاحت نہیں، صرف جواب۔'' میں نے جارحانہ انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ بھی ٹو دی پوائنٹ...... مقتولہ کی لاش بیڈروم میں بیڈ پر پڑی تھی یا پھر ڈرائنگ روم کے صوفے پر؟''

اس نے مختصر جواب دیا۔ ''بیڈ پر۔''

''شکریہ آئی او صفدر حسین صاحب!'' میں نے انکوائری آفیسر پر اپنی جرح ختم کرتے ہوئے منویت

ج کی جانب موڑ دے

ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"یور آنر! پوٹاشیم سائنائیڈ کی سب سے خاصیت یہ ہے اپنے شکار کو انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہیں دیتا اور ... کی عمارت اس بنیاد پر کھڑی ہے کہ مقتولہ شازلین ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر زہر آلود چائے پیئے اور بڑے آرام سے بیڈ روم میں جا کر جان دے دے۔ اس سے بڑا ... اور کوئی ہو نہیں سکتا۔" میں نے ڈرامائی انداز میں ... کر کے حاضرین مجلس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ... کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جناب والا! یہ تو طے ہے کہ مقتولہ شازلین کو زہر ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ بیڈ روم میں عین بیڈ پر دیا گیا تھا اس لیے وہ ادھر ہی فوراً موت کے منہ میں چلی گئی۔ اگر استغاثہ یا کسی اور کو میری پوٹاشیم سائنائیڈ کی خوفناک اثر پذیری والی معلومات پر کسی قسم کا شک ہو تو آئندہ پیشی پر میں اپنے بیان کی تصدیق کے لیے کسی ماہر "کیمیکل اینالسٹ" کو یہاں لا سکتا ہوں۔ ایسا ہی بندوبست استغاثہ کی جانب سے بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ......" وکیل استغاثہ نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ "مقتولہ کی موت واقع ہو جانے کے بعد ملزم نے اس کی لاش کو اٹھا کر یا پھر گھسیٹ کر بیڈ روم میں پہنچا دیا ہو۔"

"پوائنٹ تو آپ نے بہت اچھا اٹھایا ہے میرے فاضل دوست!" میں نے طنز آمیز ستائشی لہجے میں کہا۔ "لیکن اس میں ایک خرابی ہے۔"

"کیسی خرابی؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"اگر میرا موکل، مقتولہ کو گود میں اٹھا کر یا کندھے پر ڈال کر اور یا پھر گھسیٹ کر اس کے بیڈ تک پہنچاتا تو بیڈ روم کے اندر کہیں نہ کہیں، اس کے فنگر پرنٹس یا فٹ پرنٹس ضرور ملتے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ملزم نے سپرمین کی طرح پرواز کرتے ہوئے مقتولہ شازلین کی لاش کو ڈرائنگ روم سے بیڈ روم میں منتقل کر دیا ہو۔"

میرے چبھتے ہوئے سوال نے بقول کسے، وکیل استغاثہ کے کانوں سے دھواں نکال دیا۔

قبل اس کے کہ وہ پلٹ کر میرے اس حملے کا جواب دیتا عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!"

اس کیس کی کارروائی کا آغاز ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنا ہوم ورک اینڈ فیلڈ ورک شروع کر دیا تھا۔ پولیس کے چالان کی کاپی کے علاوہ میرے پاس استغاثہ کے گواہوں کی فہرست بھی موجود تھی جن پر فرداً فرداً میں اپنا "تحقیقاتی" کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس سلسلے میں عدیل کے چند دوستوں نے بھی میری بھرپور مدد کی تھی۔ میں اتنی معلومات حاصل کر چکا تھا کہ آنے والی پیشیوں پر بہت زیادہ مزہ آنے والا تھا۔

☆☆☆

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے۔ پہلا نمبر مقتولہ والی رہائشی عمارت "ڈی الحمرا پلازہ" کے سیکیورٹی گارڈ علی رضا کا تھا۔ علی رضا نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

علی رضا کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہو گی۔ اس نے اچھی ہی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک صحت مند، مستعد اور قد آور شخص تھا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔

"علی رضا! تمہیں اس بلڈنگ کی رکھوالی کرتے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"لگ بھگ پندرہ سال۔" گواہ نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "اس بندے کو جانتے ہو؟" بات کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے انگلی کے اشارے سے کٹہرے میں کھڑے ملزم، جناب عدیل کی جانب اشارہ بھی کر دیا تھا۔ گواہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں اسے جانتا تو نہیں۔۔۔ ہاں مگر پہچانتا ضرور ہوں۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"دیکھیں وکیل صاحب! میں نے آج سے پہلے اس بندے کو صرف ایک بار دیکھا تھا جب یہ باجی شازلین سے ملنے ہماری بلڈنگ میں آیا تھا۔" گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس لیے میں نے صرف پہچان کی بات کی ہے۔ باقی اس کے بارے میں منیر صاحب اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، منیر صاحب کو ان کی باری پر یہاں بلایا جائے گا۔" وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ وقوعہ کی شام ملزم، مقتولہ سے ملنے کتنے بجے وہاں پہنچا تھا؟"

"تقریباً ساڑھے آٹھ بجے۔" گواہ نے بتایا۔

''اور اس کی واپسی کتنی دیر کے بعد ہوئی تھی؟''
''یہی کوئی ایک گھنٹے کے بعد۔''
''یعنی لگ بھگ ساڑھے نو بجے بلڈنگ سے نکل گیا تھا؟''
گواہ علی رضا نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''جب ملزم بلڈنگ میں داخل ہوا تو اس نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اور کیا اس کے پاس کسی قسم کا کوئی سامان وغیرہ بھی تھا؟''
''اس نے گرے پینٹ پر سرخ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔'' گواہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد بتایا۔ ''اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بیگ بھی تھا، جیسا کہ اسکول کے بچوں کے پاس ہوتا ہے۔''
''کیا تم نے ملزم کو بلڈنگ سے دور جاتے دیکھا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر دریافت کیا۔
''جی ہاں۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں اس وقت باہر ہی کھڑا تھا جب یہ اپنی بائیک پر سوار ہونے لگا تو اسی وقت صغیر صاحب بھی گھر واپس آئے تھے۔ یہ صغیر صاحب کو دیکھ کر رک گیا۔ ان دونوں کے درمیان مختصری گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد صغیر صاحب بلڈنگ میں داخل ہو گئے اور ملزم اپنی بائیک پر وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔''
''کیا صغیر صاحب بھی ڈائمنڈ اپارٹمنٹس ہی میں رہتے ہیں؟''
''جی ہاں۔'' گواہ نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بتایا۔ ''وہ اپارٹمنٹ نمبر 201 میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ طارق روڈ پر ان کی کپڑے کی دکان ہے۔''
''جب ملزم، صغیر صاحب سے بات کر رہا تھا تو تم ان سے کتنی دور کھڑے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ ''کیا تم معزز عدالت کو بتا سکتے ہو کہ ان کے درمیان کس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی؟''
''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ میں یہ تو نہ جان سکا کہ ان کے بیچ کون سا موضوع چل رہا تھا تاہم مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوئی۔''
''بھلا کیا بات ثابت ہوئی؟'' وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔
''یہی کہ وہ پہلے سے جاننے والے تھے۔'' گواہ نے بتایا۔ ''ڈائمنڈ اپارٹمنٹ میں آنے سے پہلے صغیر صاحب گارڈن ویسٹ کے علاقے ''چاندنی چوک'' میں رہا کرتے تھے اور مجھے پتا چلا ہے کہ ملزم بھی اسی علاقے کا رہائشی ہے۔''
''کیا یہ سچ ہے کہ صغیر صاحب کی نشاندہی پر ہی پولیس نے ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔
''جی... یہی حقیقت ہے۔'' گواہ نے جواب دیا۔
وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کو فارغ کرنے کے بعد میری جانب رخ پھیرا اور معتدل انداز میں کہا۔
''یور ونس پلیز!''
میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا اور معتدل انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ علی رضا سے سوال کیا۔
''تم پندرہ سال سے ڈائمنڈ اپارٹمنٹس میں سیکیورٹی گارڈ کی نوکری کر رہے ہو۔ کیا اس دوران میں بھی ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جیسا وقوعہ کی شام اپارٹمنٹ نمبر 302 میں رونما ہوا؟''
''نہیں جناب!'' گواہ نے جواب دیا۔
''تم نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ صغیر صاحب کی مدد سے پولیس، ملزم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مقتولہ کی موت کے بارے میں سب سے پہلے کو کس پتا چلا تھا اور کیسے؟ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا معلوم کرنا چاہ رہا ہوں؟''
''جی وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باجی شازلین کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں ہمیں انکل افضل کے ذریعے پتا چلا تھا۔''
''یہ انکل افضل کون ہیں؟'' میں نے متجسس آواز میں استفسار کیا۔ ''کیا وہ بھی ڈائمنڈ اپارٹمنٹس ہی کے رہائشی ہیں؟''
''نہیں وکیل صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''انکل افضل ہماری بلڈنگ میں نہیں رہتے۔ وہ دراصل باجی شازلین کے انکل ہیں اور کبھی کبھار باجی سے ملنے ان کے پاس آتے ہیں۔''
میں نے پوچھا۔ ''کبھی کبھار سے تمہاری کیا مراد ہے؟''
''مطلب یہ کہ ہفتے میں ایک آدھ بار۔''
''گویا وقوعہ کی شام انکل افضل مقتولہ سے ملنے ڈائمنڈ اپارٹمنٹس آئے تھے؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں گواہ کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔"

"وہ کتنے بجے وہاں پہنچے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ملزم کے جانے کے بعد۔" گواہ نے بتایا۔

"ملزم کے جانے کے کتنی دیر بعد؟" میں نے زیراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "تم نے وکیلِ استغاثہ کو جواب دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ملزم اس بلڈنگ سے لگ بھگ ساڑھے نو بجے رخصت ہوا تھا۔"

"جی ہاں۔ ملزم سوا نو اور ساڑھے نو کے درمیان واپس چلا گیا تھا۔" علی رضا نے بتایا۔ "اور اس کے فوراً بعد انکل افضل باجی شازلین سے ملنے آئے تھے۔"

"اس کے بعد......؟" میں نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

"انکل افضل چونکہ ہماری بلڈنگ میں گاہے بگاہے آتے رہتے تھے اس لیے میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔" استغاثہ کا گواہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے مجھے سلام کیا اور لفٹ کی جانب بڑھ گئے۔ لگ بھگ دس منٹ کے بعد وہ واپس آئے اور مجھ سے پوچھا۔ "کیا شازلین کہیں باہر گئی ہوئی ہے؟"

"نہیں جناب! وہ تو اپنے اپارٹمنٹ ہی میں ہیں۔" میں نے انکل افضل کو بتایا۔ "ابھی چند منٹ پہلے ہی تو ایک بندہ باجی سے مل کر گیا ہے۔"

میرے جواب پر انہوں نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "کمال ہے۔ میں نے شازلین کے دروازے پر دو تین بار دستک دی ہے مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پہلے میں نے یہی سوچا کہ شاید وہ واش روم میں ہو گی اس لیے میں نے تھوڑا انتظار کیا۔ اس کے بعد دستک دینے کے علاوہ میں نے ڈوربیل بھی بجائی ہے لیکن اندر مکمل خاموشی ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں سر!" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "باجی اپنے اپارٹمنٹ کے اندر ہی ہیں۔ میں انہیں انٹرکام کرتا ہوں۔"

"اس کے بعد میں نے انٹرکام کے ذریعے اپارٹمنٹ نمبر تین سو دو سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دوسری طرف گھنٹی تو بج رہی تھی لیکن باجی کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں۔ اس صورت حال نے مجھے بھی فکرمند کر دیا اور میں نے ڈاکٹر جنید صاحب سے رابطہ کیا......"

"کون ڈاکٹر جنید؟" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال کر دیا۔

شکایت

گارڈ نے ریلوے کے اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔ "سر! ایک دیہاتی ہماری پسنجر ٹرین کے بارے میں شکایت لے کر آیا ہے۔"

"اس بیوقوف کی گائے یا بھینس ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی ہو گی اور اب وہ ریلوے کے محکمے سے کچھ ہرجانہ وصول کرنے کی فکر میں ہو گا۔ اس گدھے کو بتا دو کہ ریلوے کا محکمہ اس قسم کے حادثوں پر ہرجانہ ادا نہیں کرتا۔ غلطی ان بیوقوفوں کی اپنی ہوتی ہے۔ گائے بھینسوں کو آوارہ کتوں کی طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔" اسٹیشن ماسٹر صاحب غصے میں کہتے چلے گئے۔

ممکن تھا ان کی تقریر جاری رہتی مگر گارڈ ان کی بات کاٹ کر بولا۔ "سر! مسئلہ یہ نہیں ہے، مسئلہ کچھ اور ہے۔ دیہاتی کا کہنا ہے کہ ہماری ٹرین اس کے کھیتوں کے قریب سے گزرتی ہے تو مسافر اتر کر اس کی گائے بھینسوں کا دودھ نکال کر دوبارہ ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں۔ وہ درخواست کر رہا ہے کہ ٹرین کی رفتار کچھ بڑھائی جائے۔"

(مرسلہ: پرویز سیال، میرپور خاص)

بے جا شکایت

ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ایک صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر شکایت کی۔ "کمرے میں موٹی موٹی چھپکلیاں نظر آ رہی ہیں۔"

کلرک نے بے نیازی سے کہا۔ "دو سو روپے روز کا کمرا لے کر کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے کمرے میں دبلی پتلی اور اسمارٹ چھپکلیاں نظر آئیں؟"

(مرسلہ: خرم شاہد، ملتان)

اندازہ

"اگر آپ نئی کار خرید لیں تو آپ کی بیوی کیا کہے گی؟"

"کیا آپ کو سگنل نظر نہیں آ رہا؟ بریک آہستہ لگایا کریں...... موڑ آہستہ کاٹا کریں...... یہ آج آپ اندھوں کی طرح گاڑی کیوں چلا رہے ہیں؟ وہ دیکھیں سامنے سے بس آ رہی ہے...... وغیرہ وغیرہ۔"

(مرسلہ: آمنہ نوید، چنیوٹ)

"ڈاکٹر صاحب ہماری بلڈنگ کمیٹی کے صدر ہیں۔" گواہ نے جواب دیا۔ "وہ گراؤنڈ فلور کے اپارٹمنٹ "جی۔ون" میں رہتے ہیں۔"

"اوکے......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ ڈاکٹر جنید نے اس معاملے میں کیا کردار ادا کیا تھا؟"

ڈاکٹر جنید اور صغیر حسین کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل تھا۔ میں نے ان دونوں حضرات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر رکھی تھیں اور ان کے حوالے سے میں مطمئن تھا۔

سیکیورٹی گارڈ علی رضا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ، انکل افضل اور ڈاکٹر جنید ایک ساتھ مقتولہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچے۔ متعدد بار کی دستک کے بعد بھی جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو سب تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ڈاکٹر جنید نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔

"علی رضا! مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ تم کسی طرح دروازہ کھولنے کی کوشش کرو......!"

"میں نے جب اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کا ہینڈل گھمایا تو......!" علی رضا نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ باجی شازلین نے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا......!"

میں نے ایک بار پھر قطع کلامی کی اور تجسس آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"ہم تینوں باجی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے اور ہم نے دیکھا، باجی شازلین اپنے بیڈ پر بے ہوش پڑی تھیں۔" گواہ نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ "انکل افضل نے متعدد بار باجی کو پکارا لیکن وہ بے حس و حرکت پڑی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اعلان کرنے والے انداز میں ہمیں بتایا کہ باجی اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں......!" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک افسردہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فون کر کے پولیس کو بلا لیا۔ اس واقعے نے ہماری بلڈنگ میں ہلچل مچا دی تھی۔ پولیس آئی، سب کے بیانات لے گئے اور جب پولیس کو پتا چلا کہ موت سے پہلے باجی سے آخری ملاقات ملزم نے کی تھی تو صغیر صاحب کی مدد سے ملزم کے گھر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اسے گرفتار کر لیا گیا۔"

"جنابِ عالی......!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

اس کے بعد، یکے بعد دیگرے استغاثہ کی جانب سے ڈاکٹر جنید اور صغیر حسین کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ وکیل استغاثہ نے ان پر مختصر سی جرح کی جس کا لب لباب مقتولہ شازلین کی لاش کی دریافت اور ملزم عدیل احسان کی گرفتاری تک محدود تھا یعنی اس میں کوئی بھی اہم یا نئی بات نہیں تھی۔ یہ تمام تر تفصیلات سیکیورٹی گارڈ علی رضا کے توسط سے عدالت کے ریکارڈ کا حصہ بن چکی تھیں۔

ڈاکٹر جنید نہایت ہی سلجھا ہوا اور سمجھ دار انسان تھا۔ اپنی باری پر میں نے دو چار سوالات کر کے اسے فارغ کر دیا البتہ صغیر حسین پر میں نے محدود اور مفید جرح ضروری جانی۔

"صغیر صاحب! آپ ملزم کی گرفتاری کے حوالے سے پولیس کی نظر میں ایک اہم کردار ہیں۔" میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "اپنی سروس فراہم کر کے آپ نے استغاثہ کا کام آسان کر دیا تھا۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟"

"ایک لحاظ سے آپ درست فرما رہے ہیں وکیل صاحب!" اس نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ایک لحاظ سے کیوں......؟" میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ "کیا آپ کے اس تعاون کا کوئی دوسرا پہلو بھی ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ پولیس میری مدد ہی سے عدیل احسان کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس تمام تر کارروائی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ تو ایک اتفاق ہے کہ وقوعہ کی شام اچانک ملزم سے میرا سامنا ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں ڈائمنڈ اپارٹمنٹس میں رہتا ہوں اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ وہاں کس سے ملنے آیا تھا۔ جب پولیس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تو میں نے ان سے تعاون کر کے ایک ذمے دار شہری ہونے کا فرض نبھایا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے......!"

"یہ بہت بڑی اور قابلِ ستائش بات ہے صغیر صاحب!" میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ "لوگ عموماً پرائے پھڈے میں اپنی ٹانگ پھنسانے سے گریز کرتے ہیں۔ آپ نے واقعتاً ایک ذمے دار اور فرض شناس شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔"

"شکریہ وکیل صاحب......!" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

"صغیر صاحب! آپ کب سے ملزم کو جانتے ہیں؟"

...نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"سالہا سال سے......!" اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "ڈائمنڈ اپارٹمنٹس میں شفٹ ہوئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس سے پہلے میں بھی چاندنی چوک، گارڈن ایسٹ ہی میں رہتا تھا بلکہ میری ساری زندگی اسی علاقے میں گزری ہے۔ میں ملزم اور اس کی فیملی کو اچھے سے جانتا ہوں۔"

"کیا کبھی آپ نے اس دوران میں عدیل کو کسی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث پایا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ مرکوز کر کے ایک اہم سوال کیا۔

"نہیں......!" اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "کبھی نہیں......!"

"دیٹس آل یور آنر!" میں نے جرح موقوف کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

"جناب عالی! اگر کسی شخص نے پہلے کبھی کوئی جرم نہیں کیا تو اس بات کی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ آئندہ بھی کبھی کسی مجرمانہ فعل کا ارتکاب نہیں کرے گا۔" وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ وقوعہ کی شام ملزم کی آمد سے پہلے مقتولہ شازلین اپنے اپارٹمنٹ کے اندر زندہ اور سلامت تھی اور ملزم کے جانے کے بعد اسے مردہ پایا گیا ہے۔ یہ تمام حقائق ایک ہی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتولہ کی موت کا ذمے دار صرف اور صرف ملزم ہی ہے کیونکہ اس دوران میں کوئی اور شخص مقتولہ کے اپارٹمنٹ کے اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ علاوہ ازیں......" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"مقتولہ کے اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ یہ امر بھی اسی سچائی پر دلالت کرتا ہے کہ جب ملزم جائے وقوعہ سے رخصت ہوا تو اس وقت تک مقتولہ شازلین اپنی زندگی کی بازی ہار چکی تھی ورنہ وہ دروازے کو یوں کھلا نہ چھوڑتی۔"

"یور آنر! میرے فاضل دوست کو تھوڑا صبر سے کام لینا چاہیے۔" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ یہ کیس جلد از جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے لیکن اس سلسلے میں قانونی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"کون سے قانونی تقاضے؟" وکیل استغاثہ نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ سب کچھ کھل کر سامنے آ چکا ہے۔"

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اپریل 2026ء
کی جھلکیاں

ولی ہند
اس ولی کامل کی داستان جسے
خواجہ معین الدین چشتی نے خطاب
سے نوازا نظام الدین اولیاؒ نے پابوسی کی

دریچہ ماضی
ایک معروف قلمکار
کی کہانی خود اسی کی زبانی

سیمی
یورپ سے درآمد ایک
پراسراریت بھرا واقعہ

ڈائن
وہ خصلت سے ڈائن تھی اور بھول گئی تھی کہ
کراماً کاتبین ہر ایک کا فعل لکھ لیتے ہیں

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے،
تاریخی واقعات، جنہیں آپ پڑھنا
چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

"میرے فاضل دوست!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر آپ کے سمجھ لینے سے کوئی کیس حل ہو جاتا تو پھر کورٹ روم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ذرا دھیرج رکھیں، ابھی پکچر باقی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟" وہ جھنجلا کر رہ گیا۔

میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں یور آنر کہ پچھلے چار ماہ سے اس عدالت میں "شازلین مرڈر کیس" کی جو فلم چل رہی ہے، اس کے آخری دو سین ابھی باقی ہیں۔" پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بہ آوازِ بلند ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"جنابِ عالی! ابھی استغاثہ کے دو گواہوں کا بیان باقی ہے۔ اس سے پہلے یعنی ان اہم گواہوں کو سنے بغیر معزز عدالت کسی حتمی فیصلے پر بھلا کیسے پہنچ سکتی ہے۔ میرا اشارہ ملزم کے باس رمضان بھائی اور مقتولہ کے انکل افضل کی جانب ہے۔ ان دونوں افراد کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود ہے۔"

"پراسیکیوشن!" جج نے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ان دونوں گواہوں کو اگلی پیشی پر عدالت میں لا سکتے ہیں؟"

"شیور سر!" وکیلِ استغاثہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از ایڈجارنڈ!"

میں نے ایک لحاظ سے استغاثہ کی تدفین کے لیے اپنی جمع سے ایک تنگ و تاریک تابوت تیار کر دیا تھا اور اس میں کیلیں ٹھونکنے کا عمل بھی وقفے وقفے سے جاری تھا۔ بس، چند ایک آخری کیلیں ٹھونکنا باقی تھا۔

☆☆☆

عصر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں "بھائی ٹریڈرز" کا مالک رمضان بھائی کھڑا تھا۔ رمضان بھائی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک فربہ اندام شخص تھا۔ اس کے چہرے پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا جس کے گلاسز خاصے موٹے تھے، بالکل کسی عدسے کے مانند۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی دور کی نگاہ کافی کمزور ہے۔ اس کے سر کے بال بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسے "فارغ البال" کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

رمضان بھائی سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور ملزم کی جانب اشارہ کرنے کے بعد اس نے اپنے گواہ سے پوچھا۔

"رمضان بھائی! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

"اس نمک حرام کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔" وہ نفرت بھری نظر سے میرے موکل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بدذات دو سال تک "بھائی ٹریڈرز" میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے۔ شروع میں تو سب ٹھیک تھا لیکن آخری چند مہینوں میں اس نے گڑبڑ کا آغاز کر دیا تھا۔"

رمضان بھائی، ملزم کے لیے اپنے دل میں بے پناہ بغض اور معاندت رکھتا تھا اور میں اپنی تحقیق کے نتیجے میں اس دشمنی کا سبب جان چکا تھا۔

"مثلاً......؟" وکیلِ استغاثہ نے اس سے پوچھا۔ "کیسی گڑبڑ؟"

"یہ کمینہ میرے کلائنٹس کو میرے ہی خلاف بھڑکانے لگا تھا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "جس کی تازہ ترین مثال مقتولہ شازلین کی ہے۔ میں نے اس کو کئی بار سمجھایا تھا کہ وہ مقتولہ سے دور رہے لیکن میری نصیحت کا اس ڈھیٹ پر ایک ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مقتولہ بہت ہی خوش اخلاق اور ملنسار خاتون تھی۔ ہر ایک کے ساتھ وہ بڑی شائستگی سے پیش آتی تھی۔ ملزم نے اس کی نرم دلی اور مروت کا غلط مطلب نکال لیا اور یہ گدھا اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہو گیا کہ مقتولہ اس پر مرتی ہے۔ وہ درحقیقت مقتولہ کی شرافت اور انسان دوستی کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔"

"کیسا فائدہ؟" وکیلِ استغاثہ نے زور دے کر پوچھا۔

"ملزم کو پیسوں کی ضرورت تھی اور مقتولہ کو اس نے ایک موٹی مرغی سمجھ لیا تھا۔" رمضان بھائی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "ایک لحاظ سے ملزم کا اندازہ بالکل درست تھا۔ میرا مطلب ہے مقتولہ ایک صاحبِ حیثیت خاتون تھی۔ سو، ملزم نے ایک مالدار بیوہ سے پیسا نکلوانے کے لیے ایک گھناؤنا منصوبہ بنایا۔ ایک طرف یہ کمبخت مقتولہ کو اپنی محبت کے دام میں لانے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری جانب یہ مقتولہ کے دل و دماغ میں میرے خلاف منفی خیالات بھر رہا تھا۔ اس نے مقتولہ کو بتایا کہ میں لوگوں سے فراڈ کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں ملزم نے مقتولہ کو اسٹاک

urdunovels.com

پہنچنے والی من گھڑت کہانی بھی سنادی تھی۔ یہ مقتولہ کی نظر میں معتبر بن کر اسے چونا لگانا چاہتا تھا۔ اس نے کسی طرح یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ مقتولہ کے گھر میں پانچ لاکھ روپے کیش کی شکل میں رکھے ہیں۔ سو، وقوعہ کی شام یہ مقتولہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔"

رمضان بھائی نے اپنا بیان مکمل کیا تو وکیلِ استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ "وقوعہ کے روز مقتولہ کے اپارٹمنٹ پر جو افسوسناک واقعہ پیش آیا وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے لیکن معزز عدالت یہ جاننے میں گہری دلچسپی رکھتی ہے کہ ملزم بیٹھے بٹھائے اچانک آپ کے خلاف کیوں کمربستہ ہوگیا تھا؟"

"اس کا ایک خاص سبب تھا۔" رمضان بھائی نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "وکیل صاحب! اس دنیا میں کچھ بھی بلاوجہ نہیں ہوتا۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں رمضان بھائی!" وکیلِ استغاثہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ اس خاص سبب کے بارے میں عدالت کو بتائیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"وکیل صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے شروع میں اس شخص کے لیے "نمک حرام" کے الفاظ استعمال کیے تھے؟" رمضان بھائی نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے اثبات میں جواب دیا۔

"اب آپ اس میں "احسان فراموش" کا اضافہ بھی کرلیں۔"

"کرلیا...... آگے بتائیں؟"

"اس واقعے سے چھ ماہ پہلے ملزم میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے دو لاکھ روپے ادھار مانگے۔" رمضان بھائی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سے پوچھا کہ اسے اتنی بڑی رقم کس لیے چاہیے تو اس نے جواب دیا۔ "سال کے دسویں مہینے میں میری چھوٹی بہن کی شادی ہے اور ابھی تک ہم نے کوئی تیاری نہیں کی۔ اگر آپ مجھے دو لاکھ روپے قرض دے دیں تو میں ہر ماہ ایک خاص اماؤنٹ اپنی تنخواہ میں سے کٹواتا رہوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم ماہانہ کتنی رقم واپس کرسکتے ہو؟"

"ایک ہزار روپے۔" اس نے جواب دیا۔

مجھے ہنسی آگئی اور میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا تم میرے ساتھ کوئی مذاق کررہے ہو؟"

"نہیں رمضان بھائی! میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ایک سال کے بعد میری بہن کی شادی ہے جس کے لیے مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھ پر مہربانی کریں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

"دیکھو عدیل!" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم ایک اچھے ورکر ہو۔ میں تمہارے کام کو پسند کرتا ہوں اسی لیے میں نے تمہاری تنخواہ بھی مناسب رکھی ہوئی ہے لیکن دو لاکھ روپے کوئی معمولی اماؤنٹ نہیں ہے۔ اگر تم ہر ماہ ایک ہزار روپے کے حساب سے کٹواؤ گے تو اس رقم کی واپسی میں پورے دو سو ماہ یعنی کم و بیش ساڑھے سولہ سال لگ جائیں گے۔"

اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے شاکی لہجے میں کہا۔ "میری کل تنخواہ چار ہزار روپے ہے۔ میں ایک ہزار روپے سے زیادہ نہیں کٹوا سکتا۔"

واضح رہے یہ کہ واقعہ آج سے نصف صدی پہلے کا ہے۔ اس زمانے کے چار ہزار آج کے ایک لاکھ یا کم از کم اسی ہزار روپے سمجھ لیں۔

"انسان کو اپنی چادر کے سائز کو دیکھتے ہوئے پاؤں پھیلانا چاہئیں۔" میں نے عدیل سے کہا۔ "اگر تمہیں دس بیس ہزار کی ضرورت ہے تو میں دے دیتا ہوں اور تم اس رقم کو واپس بھی نہیں کرنا مگر دو لاکھ روپے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رمضان بھائی نے وکیلِ استغاثہ کو بتایا۔

"پھر اس نے کیا کہا؟" وکیلِ استغاثہ نے سوال کیا۔

"وہی چھوٹے اور کم ظرف لوگوں والا رویہ۔" رمضان بھائی نے ناپسندیدہ نظر سے ملزم کو دیکھنے کے بعد جواب دیا۔ "یہ ایک دم غصے میں آگیا اور الٹا مجھے ہی باتیں سنانے لگا...... رمضان بھائی! میں نے آپ سے قرض مانگا ہے، بھیک نہیں...... وغیرہ!" وہ لمبی بھر کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وکیلِ استغاثہ کو بتایا۔

"بس، اس دن کے بعد سے اس کمبخت نے میرے خلاف زہر اگلنا شروع کردیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر میری کسی بھی نصیحت نے اس پر اثر نہیں کیا اور روز بروز اس کی سازشوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سچ پوچھیں تو میں اس کی گھٹیا حرکتوں سے تنگ آگیا تھا اور میں نے اسے نوکری سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن عمل اس کے کہ میں اس

urdunovels.com

حوالے سے کوئی عملی قدم اٹھاتا، وہ افسوسناک واقعہ پیش آگیا جس کے لیے آج ہم سب اس عدالت میں ہیں۔"

"دیٹس آل یور آنر!" رمضان بھائی کے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے جج سے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"یور وٹنس پلیز!"

"جنابِ عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پچھلی پیشی پر پراسیکیوشن نے معزز عدالت کو اس امر کا یقین دلایا تھا کہ اس پیشی پر میرے مؤکل کے خلاف رمضان بھائی اور مقتولہ کے انکل افضل کو ایک ساتھ گواہی کے لیے عدالت میں حاضر کیا جائے گا لیکن انکل افضل کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ معزز عدالت کو پراسیکیوشن کی اس غیر ذمے داری کا نوٹس لینا چاہیے۔"

جج نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔ "آپ کا دوسرا گواہ کہاں ہے؟"

"افضل صاحب عمرے پر گئے ہوئے ہیں۔" وکیل استغاثہ نے بتایا۔ "وہ چند روز کے بعد واپس آ جائیں گے۔"

"زمانۂ حج کے علاوہ مکہ معظمہ کی حاضری اور بیت اللہ کا طواف یعنی عمرہ کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔" میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ افضل صاحب کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ وہ دنوں کا ٹھیک سے حساب نہیں رکھ سکے اور حج سے پہلے عمرے پر چلے گئے ہیں۔"

وکیل استغاثہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ میرے معنی خیز الفاظ کو بہت دور تک سمجھ گیا ہو لیکن مجھے براہ راست کوئی سخت جواب دینے کے بجائے اس نے جج سے کہا۔

"یور آنر! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے دی جائے۔ استغاثہ کا گواہ افضل حسین چار روز کے بعد واپس آ جائے گا۔"

"وکیل صفائی! آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"نو آبجیکشن یور آنر!"

"آپ استغاثہ کے گواہ رمضان بھائی سے کچھ پوچھنا چاہیں گے؟" جج نے کہا۔ "آپ کی جرح ابھی باقی ہے۔"

"جنابِ عالی! میرے فاضل دوست نے رمضان بھائی کو اس قدر کنگال ڈالا ہے کہ میں اپنی جرح کے نام پر معزز عدالت کا مزید قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ میں ان سے صرف ایک سوال کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ یہ اس کا درست جواب نہیں دیں گے۔"

"ایسا کون سا سوال ہے؟" جج نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "عدالت وہ سوال اور اس پر استغاثہ کے گواہ کا ردعمل ضرور دیکھنا چاہے گی۔"

جج کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ پچھلے چند ماہ میں اس کیس کو لے کر میں نے تمام کرداروں کے حوالے سے اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی تھی۔ اس "نیک کام" میں عدیل کے چند دوستوں نے بھی میری مدد کی تھی اور میں نے اپنے ذرائع بھی استعمال کر کے مختلف نوعیت کی اہم معلومات حاصل کر لی تھیں چنانچہ میں استغاثہ کے سامنے اپنے پورے پیشہ ورانہ قد کے ساتھ مضبوط قدموں پر کھڑا تھا۔

"رمضان بھائی!" میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا آپ مقتولہ شازلین کے انکل افضل حسین کو جانتے ہیں؟"

"میں نے ان کا نام سنا ہے اور وہ بھی اس کیس کے حوالے سے۔" اس نے کھوکھلے لہجے میں جواب دیا۔ "مگر میں انہیں ذاتی طور پر بالکل نہیں جانتا۔"

"مگر افضل حسین تو آپ کو اچھے سے جانتے ہیں۔" میں نے تیز آواز میں کہا۔ "ذاتی اور غیر ذاتی...... دونوں اطوار پر۔"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب؟" وہ گڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے تو آج تک انہیں دیکھا بھی نہیں، جان پہچان کا کیا سوال؟"

"میں نے کہا نا، افضل حسین آپ کو جانتے ہیں۔" میں نے ان کے چہرے پر نگاہ جما کر چڑھائی کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ آپ سے کئی بار ملاقات بھی کر چکے ہیں اور وہ بھی خوشگوار دوستانہ فضا میں۔ اگر افضل حسین کو آپ کا "پارٹنر ان کرائم" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"

"آپ بکواس کر رہے ہیں۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "میرا کسی افضل حسین سے بھلا کیا لینا دینا۔"

"لینا بھی ہے اور دینا بھی۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور میں عدالت میں کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔"

بات کے اختتام پر میں نے دھمکی آمیز انداز میں اپنے بریف کیس کو تھپتھپایا تو رمضان بھائی نے گھبرا کر امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

UrduNovels.com

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی نعرے کے ساتھ گواہ کی مدد کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "ڈیفنس، استغاثہ کے معزز گواہ کو ناحق پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب گواہ دوسرے گواہ افضل حسین کو نہیں جانتا تو بس نہیں جانتا۔"

"ڈیفنس!" جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر استفسار کیا۔ "کیا آپ اپنے دعوے کو عدالت میں ثابت کر سکتے ہیں؟"

"ہنڈرڈ پرسینٹ یور آنر!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"آبجیکشن اوور رولڈ!" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ڈیفنس، پلیز پروسیڈ فردر!"

میں نے اپنے بریف کیس میں سے پوسٹ کارڈ سائز کی دو رنگین تصاویر نکال کر جج کے سامنے میز پر رکھ دیں اور پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"یور آنر! ان دونوں تصاویر میں آپ کو تین افراد خوشگوار ماحول میں بیٹھے نظر آ رہے ہیں جن میں ایک رمضان بھائی، دوسرے افضل حسین اور تیسرے ایک بدنامِ زمانہ وکیل اعجاز چودھری ہیں۔ اعجاز چودھری کی وجۂ بدنامی یہ ہے کہ وہ صرف آڑے ٹیڑھے اور الٹے کیسز ہی میں ہاتھ ڈالتے ہیں کیونکہ ایسے مجرمانہ کاموں میں زیادہ پیسا ملتا ہے۔ ان تصاویر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ مقتولہ شازلین کے اپارٹمنٹ اور دیگر منقولہ و غیر منقولہ اثاثوں کو ہتھیانے کی قانونی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ......"

لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"افضل حسین مقتولہ کا نہیں بلکہ اس کے شوہر مرحوم حسن علی کا بھتیجا ہے۔ اس رشتے کی بنا پر مقتولہ اسے افضل کہہ کر ہی پکارتی تھی۔ افضل کا خیال ہے کہ حسن علی کی چھوڑی ہوئی دولت اور جائیداد میں اس کا بھی حق ہے کیونکہ مرحوم حسن علی کے بزنس میں اس نے بھی پیسا لگایا تھا اور وہ رشتے میں اس کا بھتیجا بھی ہے لیکن حسن علی نے پہلے ہی اپنا سب کچھ مقتولہ کے نام کر دیا تھا چنانچہ مقتولہ کو راستے سے ہٹائے بغیر افضل حسین کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اعجاز چودھری، رمضان بھائی کا دوست ہے اور رمضان بھائی افضل حسین کا خیر خواہ۔ لہٰذا ان تینوں کی ملی بھگت سے مقتولہ شازلین کا قصہ تمام کر دیا گیا۔ شازلین کی موت میں کلیدی کردار ادا کرنے والے شخص کا نام ہے...... افضل حسین!"

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر رمضان بھائی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چکرا کر وٹنس باکس کے فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

افضل حسین کی واپسی پر اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پچھلی پیشی پر میں نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے تھے ان کی روشنی میں عدالت کے حکم پر پولیس نے رمضان بھائی کو حراست میں لے لیا تھا۔ گرفتاری کے بعد جب افضل حسین کو پتا چلا کہ وکیل صفائی نے ان کی سازش کو بے نقاب کر دیا ہے تو اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ پولیس کی کڑی تفتیش کے دوران میں افضل حسین نے اقبالِ جرم کر لیا تھا۔ اس کے بیان کا لب لباب یہ تھا۔

"میں سمجھتا ہوں حسن علی کے ترکے میں میرا بھی حصہ تھا کیونکہ اس دنیا میں شازلین کے علاوہ صرف ایک میں ہی اس کا رشتے دار تھا۔ اس ورثے پر میرا بھی قانونی حق بنتا تھا مگر حسن علی نے ناانصافی کی اور اپنا سب کچھ شازلین کو سونپ کر دنیا سے چلا گیا اور دکھ کی بات یہ ہے کہ شازلین کو بھی میرا خیال نہیں تھا چنانچہ اس کے ساتھ اچھے تعلقات اور میل جول برقرار رکھتے ہوئے میں نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔"

افضل حسین ایک معروف فارماسیوٹیکلز میں کام کرتا تھا لہٰذا پوٹاشیم سائنائیڈ کا حصول اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے پوٹاشیم سائنائیڈ کو ایک چاکلیٹ کے اندر "محفوظ" کیا اور وقوعہ کی شام مقتولہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ پھر وہ زہریلی چاکلیٹ شازلین کو کھلانے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ شازلین کی فوری موت کے بعد اس نے شازلین کی لاش کو اٹھا کر بیڈروم میں پہنچا دیا اور اس کی چائے والی خالی پیالی کے اندر بھی قلیل مقدار میں وہ سریع الاثر زہر ڈال دیا۔ شازلین کی زبانی افضل حسین کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے وہاں کون آیا تھا اور کس نے کس پیالی میں چائے پی تھی۔

[illegible] شازلین کی موت [illegible] کی کوشش کر کے پانچ لاکھ روپے کی رقم برآمد کر لی۔ اس نے نوٹوں کی پانچ گڈیوں کو اپنے کوٹ کی مختلف جیبوں میں "کھپایا" اور ڈرامہ کرنے سیکیورٹی گارڈ علی رضا کے پاس پہنچ گیا تاکہ شازلین کی موت کا ذمے دار بے چارے علی رضا کو سمجھا جائے اور علی رضا...... وہ بے چارہ بدقسمتی سے خواہ مخواہ اس جھمیلے میں آ گیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

برابری کا بوجھ

محمد عثمان ذوالفقار

جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے... مختلف ایجادات و تجربات سے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے جا رہے ہیں... زیرِ نظر کہانی بھی اسی چیز کا احاطہ کرتی ہے... ایک ایسی دنیا جہاں اب نہ کوئی کسی سے زیادہ ذہین تھا، نہ طاقتور، نہ ہی کوئی کسی سے زیادہ خوش تھا...... ہر کسی کو برابری کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی... اور اس سے انحراف جان لیوا تھا۔

ایک ایسی دنیا جہاں انفرادیت جرم تھی اور برتری گناہ

سنہ 2081ء میں بالآخر ہر شخص برابر ہو چکا تھا۔ اب ہر انسان صرف خدا اور قانون کی نظر میں ہی نہیں، بلکہ ہر لحاظ سے برابر تھا۔ کوئی بھی دوسرے سے زیادہ ذہین نہیں تھا، نہ کوئی دوسرے سے زیادہ خوش تھا۔ حتیٰ کہ کوئی انسان طاقت میں بھی دوسرے سے کمزور یا مضبوط نہیں تھا۔ یہ سب کچھ آئین میں کی گئی 211 ویں، 212 ویں اور 213 ویں ترامیم کے ساتھ ساتھ ریاست ہائے متحدہ کے "محتسب اعلیٰ برائے مساوات" کے ایجنٹوں کی مسلسل اور انتھک نگرانی اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود کچھ چیزیں اب بھی برابر نہیں تھیں، جیسے کہ اپریل کا موسم اب بھی لوگوں کو پہلے کی طرح دیوانہ بنا رہا تھا اور دھوپ بھی صرف گرمیوں میں نکل رہی تھی۔ اسی خوبصورت موسم کی ایک سہانی صبح محتسب اعلیٰ کے آدمی..... جارج اور ہیزل کے چودہ سالہ بیٹے ہیریسن کو پکڑ کر لے گئے جس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ عام لوگوں سے بہتر سوچ اور سمجھ رکھتا تھا۔

جارج اور ہیزل کے لیے یہ یقیناً ایک المیہ تھا لیکن وہ دونوں اس بارے میں زیادہ گہرائی سے سوچنے کے قابل نہیں تھے۔ ہیزل کی ذہانت تو بالکل اوسط درجے کی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی چیز کے متعلق صرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں سوچ سکتی تھی۔ جارج کی ذہانت البتہ معمول سے زیادہ تھی مگر اس کے کان کے ساتھ ایک چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسمیٹر لگا ہوا تھا اور وہ اسے ہر وقت لگائے رکھنے پر مجبور تھا۔ یہ ایک سرکاری ٹرانسمیٹر تھا جو حکومت کی طرف سے ایک مخصوص فریکوئنسی پر سیٹ کیا گیا تھا۔ یہ ٹرانسمیٹر ہر تھوڑی دیر بعد ہی

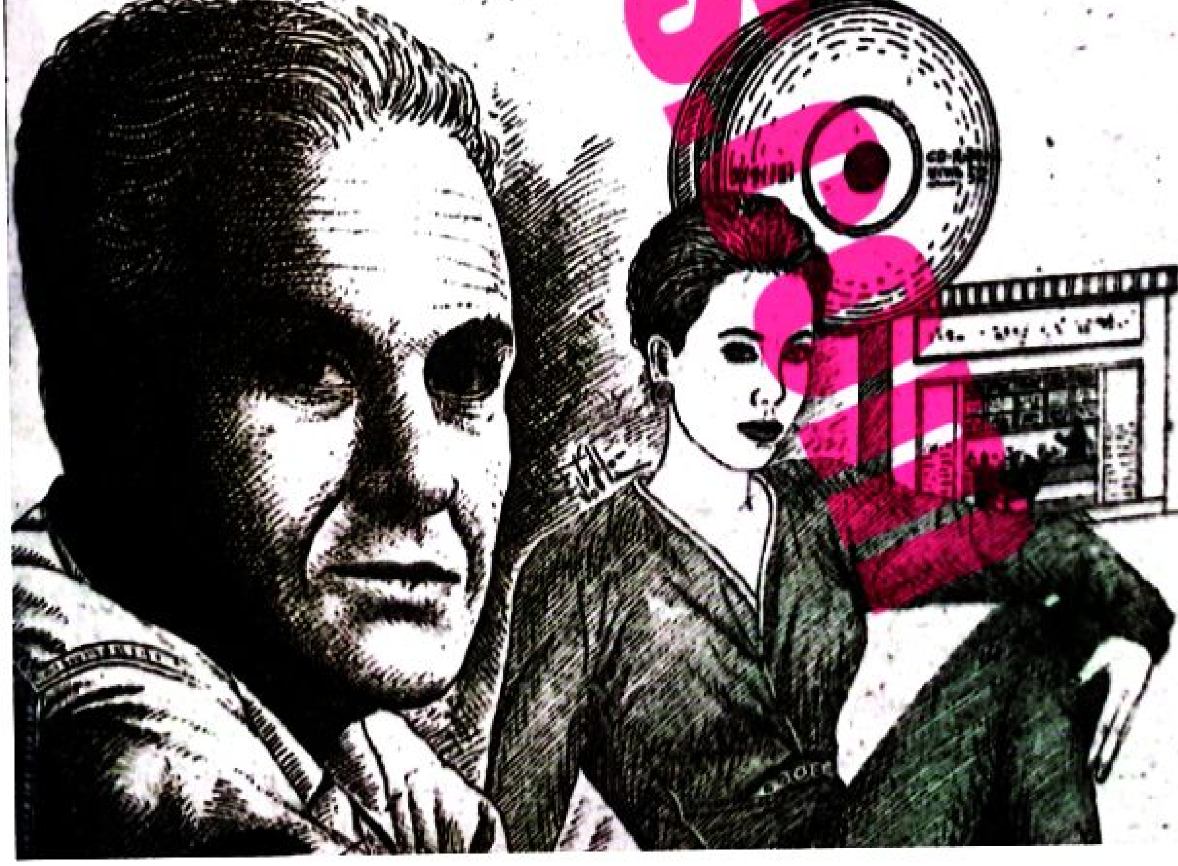

فریکوئنسی پر ایک کرخت آواز نشر کرتا جس کی وجہ سے جارج اس وقت جو بھی سوچ رہا ہوتا، اسے بھول جاتا یا پھر اس کی سوچ تھوڑی دیر کے لیے دھندلا جاتی۔

اس وقت وہ دونوں میاں بیوی ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ہیزل کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھول چکی تھی کہ یہ آنسو کس وجہ سے تھے۔ ٹی وی پر اس وقت کچھ رقاصائیں رقص میں مصروف تھیں۔ جارج کے کان میں وہی گھنٹی بجی اور اس کے خیالات ایسے بھاگے جیسے الارم بجنے پر کوئی چور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔

"یہ واقعی ایک خوبصورت رقص تھا۔" ہیزل نے رقص کے ختم ہونے پر تبصرہ کیا۔

"کیا......؟" جارج نے کہا۔

"یہ رقص اچھا تھا۔" ہیزل بولی۔

"ہاں، ہوگا۔" جارج نے جواب دیا اور رقاصاؤں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ حسین ہوں کیونکہ انہوں نے اپنے چہرے نقاب سے چھپائے ہوئے تھے تاکہ ان کی کسی خوبصورت ادا یا خوبصورت چہرے کو دیکھ کر کوئی خود کو حقیر یا گرے سے اٹھایا ہوا نہ سمجھے۔

جارج سوچنے لگا کہ کم از کم رقاصاؤں پر تو یہ پابندی نہیں ہونی چاہیے، لیکن ٹرانسمیٹر کی آواز نے اسے بھلا دیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ وہ تکلیف سے کراہا اور یہی کچھ ٹی وی میں موجود آٹھ میں سے دو رقاصاؤں کی حرکات سے محسوس ہوا۔

چونکہ ہیزل کے کان میں کوئی ٹرانسمیٹر نہیں تھا، تو اسے جارج سے پوچھنا پڑا کہ "کیا ہوا؟"

"ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی گول سر والے ہتھوڑے سے دودھ والی بوتل پر ضرب لگا رہا ہو۔" جارج نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ویسے میرے خیال میں طرح طرح کی آوازیں سننا بھی کوئی دلچسپ تجربہ ہوگا۔" ہیزل نے کہنا شروع کیا۔ "یہ سرکاری لوگ بھی پتا نہیں کیسی کیسی چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔"

"ہمم۔" جارج نے صرف اسی پر اکتفا کیا۔

"اگر میں محتسب اعلیٰ ہوتی تو پتا ہے میں کیا کرتی؟" ہیزل کہنے لگی، جو خود بھی محتسب اعلیٰ برائے مساوات ڈیانا مون گلیمپرز سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ "میں اتوار کو صرف گھنٹیاں بجواتی تاکہ مذہب کا احترام کیا جا سکے۔"

"میں سوچ سکتا ہوں، اگر ایسا ہو تو۔" جارج نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں ایک اچھی محتسب اعلیٰ بن سکتی ہوں۔"

"بالکل، اتنی ہی اچھی جتنی کوئی اور۔"

"مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ نارمل ہونا کیا ہوتا ہے۔" ہیزل نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" جارج نے جواب دیا اور جیل میں موجود اپنے بیٹے ہیریسن کے بارے میں سوچنے لگا ہی تھا کہ کانوں میں اکیس توپوں کی سلامی نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"ارے یہ تو غضب کا ہے۔" ہیزل نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا، جہاں آٹھ میں سے دو رقاصائیں اپنے سر تھامے فرش پر ڈھیر ہو چکی تھیں اور یہ واقعی غضب کا تھا کیونکہ جارج کا رنگ بھی سفید پڑ چکا تھا اور اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کے کناروں پر آنسو امڈ آئے تھے۔

"تم اچانک سے اتنے تھکے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟ تم صوفے پر لیٹ کیوں نہیں جاتے تاکہ تم تکیوں کی مدد سے اپنی اس وزنی تھیلی کو آرام دے سکو۔" ہیزل نے اس کی گردن کے گرد بندھی خاصی وزنی کینوس کی تھیلی کی طرف اشارہ کیا جس میں پرندوں کو مارنے والی چھوٹی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔

"اگر تم تھوڑی دیر کے لیے میرے برابر نہ بھی رہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ہیزل نے فکرمندی سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، اب تو یہ میرے وجود کا حصہ ہے۔" جارج نے اس جبری تھیلی کا وزن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم اس تھیلی کی نچلی طرف ایک چھوٹا سا سوراخ کردیں تو وزن میں کچھ کمی ہو جائے گی؟" ہیزل نے ایک تجویز پیش کی۔

"دو سال کی قید با مشقت اور دو ہزار ڈالرز جرمانہ ہر اس گولی کے لیے جو تھیلی سے کم ہوگی۔" جارج نے کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی اچھا سودا ہوگا۔"

"اگر ہم یہ صرف اس وقت کریں جب تم اپنے کام سے واپس گھر آؤ؟" ہیزل نے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ "میرا مطلب ہے کہ اس وقت تو تم اپنے آس پاس کے لوگوں سے برتر نہیں ہوگے نا، صرف تھوڑی دیر آرام کے لیے۔"

"اگر میں نے ایسی کوشش کی تو دوسرے لوگ بھی ایسا کرنا شروع ہو جائیں گے۔" جارج نے کہنا شروع کیا۔ "اور اگر سب نے ایسا کرنا شروع کر دیا تو ہم پھر اسی تاریک دور میں پہنچ جائیں گے جہاں ہر کوئی دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے مقابلہ بازی کرتا تھا۔ کیا تم اسے پسند کرو گی؟"

"مجھے اس سے نفرت ہے۔" ہیزل نے کہا۔

"اگر لوگ قانون کو دھوکا دینا شروع کر دیں تو تمہارا کیا

خیال ہے کہ ہمارے معاشرے کا کیا بنے گا؟" جارج نے ہیزل سے سوال کیا۔

اگر ہیزل فوراً اسے کوئی جواب دے بھی دیتی تو وہ اسے سمجھنے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اسی وقت ریڈیو ٹرانسمیٹر نے اس کی سوچ کو دھندلا دیا تھا۔

"اس طرح تو یہ انہدام کا شکار ہو جائے گا۔" ہیزل نے کہا۔

"کون؟" جارج نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"معاشرہ...... یہی تو کہا ہے نا ابھی تم نے؟" ہیزل نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" جارج نے کہا۔

ٹی وی پر چلتے ہوئے پروگرام میں اچانک ایک بریکنگ نیوز نے مداخلت کی، حالانکہ شروع میں وہ واضح نہیں تھی۔ اسکرین پر موجود اناؤنسر بہت پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے خواتین و حضرات کہنے کی کوشش کی لیکن شاید زیادہ جوش کی وجہ سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ آخر کار اس نے وہ خبرنامہ ایک رقاصہ کو پڑھنے کے لیے تھما دیا۔

"اس نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔" ہیزل نے اناؤنسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے خدا کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے اور اسے اس کوشش پر ضرور کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔"

"معزز خواتین و حضرات!" ایک رقاصہ نے بریکنگ نیوز کا آغاز کیا۔ وہ لامحالہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی کیونکہ اب اس کا نقاب چہرے سے غائب تھا۔ وہ تمام رقاصاؤں میں سب سے مضبوط اور پُروقار نظر آ رہی تھی، اس بات کا اندازہ اس کی وزنی تھیلی سے بہ آسانی لگایا جا سکتا تھا جس کا وزن کافی زیادہ لگ رہا تھا۔

"دخل اندازی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" رقاصہ نے معذرت خواہانہ انداز میں بات کا آغاز کیا۔ چہرے کے برعکس اس کی آواز بے وقت کی راگنی لگ رہی تھی۔

"ہیریسن برجرون، جس کی عمر چودہ سال ہے۔" رقاصہ نے بریکنگ نیوز کا آغاز کیا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے جیل سے فرار ہو گیا ہے، جہاں وہ سرکاری مساوات کی خلاف ورزی کے جرم میں رکھا گیا تھا۔ وہ ایک ذہین کھلاڑی ہے، اس لیے اسے عام عوام کے لیے انتہائی خطرناک قرار دیا جاتا ہے۔"

اس کے بعد اسکرین پر ہیریسن کی ان تصاویر کو مختلف زاویوں سے دکھایا گیا جو پولیس نے ایک مخصوص بیک گراؤنڈ میں اس وقت کھینچی تھیں جب اسے اوّل حراست میں لیا گیا تھا۔

اس کا قد پورے سات فٹ نظر آ رہا تھا، جو کہ ہم عصر میں بنے ہوئے لمبائی کے اسکیل کے مطابق تھا۔

ہیریسن کو بہت سخت انداز میں پابند سلاسل کیا گیا تھا کیونکہ وہ محتسب اعلیٰ کے کسی بھی کارکن سے زیادہ بہتر اور تیزی سے سوچ سکتا تھا۔ بقیہ لوگوں کی طرح اس کے کانوں میں ننھے ریڈیو کے بجائے ہیڈ فون لگائے گئے تھے اور ساتھ میں دھندلے شیشوں والی بھاری عینک بھی اس کے چہرے پر براجمان تھی، جس کی وجہ سے وہ نہ صرف آدھا اندھا ہو گیا تھا بلکہ عینک کے بھاری پن کی وجہ سے اکثر اس کے سر میں درد بھی رہتا تھا۔ اس کے چاروں طرف دھات کے فاضل ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ عام طور پر فوج کی طرف سے معینہ لوگوں کو ایسی صفائی کے ساتھ آلات معذوری جاری کیے جاتے تھے کہ وہ دوسروں کو برے نہیں لگتے تھے لیکن شاید ہیریسن کی بارے میں یہ سب نہیں کیا گیا تھا اور وہ چلتا پھرتا کباڑ خانہ لگ رہا تھا۔ اس کی گینڈوں کی تھیلی کو بھی خاصا وزنی کیا گیا تھا۔

ان سب کے بعد اس کی دلکش نظر آتی صورت کو برابر کرنے کے لیے اسے ہر وقت ناک پر جوکر والی لال گیند پہنے اور بھویں منڈوا کر رکھنے کی سخت ہدایت تھی۔

"اگر کوئی اس لڑکے کو دیکھے......" رقاصہ نے تصویر کے ساتھ ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ "تو ہرگز اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرے۔"

اچانک اسٹوڈیو میں ہلچل مچ گئی اور کئی لوگوں کے چیخنے کی آوازیں اُبھریں۔ اسکرین پر اُبھری ہوئی تصویر نے اِدھر اُدھر اچھلنا شروع کر دیا، جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو اور وہ زلزلہ خود ہیریسن برجرون تھا۔

"اوہ میرے خدا! یہ تو اپنا ہیریسن لگتا ہے۔" جارج نے کہا لیکن اسی وقت اس کے ذہن میں ایک ہلکا سا جھماکا ہوا اور یہ حقیقت جیسے بھاپ بن کر اڑ گئی۔

جب جارج نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اسکرین پر تصویر کے بجائے ہیریسن خود کھڑا ہوا تھا۔ ہیریسن ابھی تک دروازے کی کنڈی کو ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا اور وہاں موجود رقاصائیں، سازندے اور تکنیکی ماہرین اپنی متوقع موت کے خوف سے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔

"میں شہنشاہ ہوں۔" ہیریسن چلایا۔ "کیا تم لوگوں نے سنا؟ میں بادشاہ ہوں اور ہر کوئی صرف وہی کرے گا، جو میں کہوں گا۔" اس نے اپنے پاؤں کو زور سے فرش پر مارا تو ایک بار پھر پورا اسٹوڈیو کانپ کر رہ گیا۔

"جبکہ میں اس وقت یہاں کھڑا ہوں......" ہیریسن نے

UrduNovels.com

کہلانا چاہیے جس معذور ہوں یا بیمار، پھر بھی میں ہر اس شخص سے عظیم ہوں جو بھی زندہ رہا ہے۔ اب دیکھو کہ میں کیا ہوں اور کیا بنے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر ہیریسن نے اپنے آلاتِ معذوری کو ہانڈی ٹکڑوں کی طرح اتار کر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے استعمال کرتے ہوئے اس وزنی ہتھیلی کو اتار کر پھاڑ دیا جسے اس کی گردن کے گرد مضبوطی سے باندھا گیا تھا، پھر کانوں پر لگے ہوئے ہیڈ فون اور اس بھاری عینک کی باری آئی جس نے اسے اندھا اور بہرا کیا ہوا تھا۔

جب وہ ان سب سے آزاد ہوا تو اس کی شخصیت ایسی نکھر کر سامنے آئی کہ کوئی بھی اسے آسانی سے دیوتاؤں کا مقابل مان لے۔

"اب میں اپنے لیے ایک ملکہ کا انتخاب کروں گا۔" ہیریسن نے اپنے گھٹنوں پر جھکی ہوئی رقاصاؤں کو دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "تم میں سے کون ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر تخت و تاج کا دعویٰ کر سکے؟"

چند لمحوں بعد ایک رقاصہ اٹھی اور اس کی طرف بڑھی۔ ہیریسن نے اسے بھی سرکاری ٹرانسمیٹر اور دوسرے آلات سے آزاد کیا۔ جب اس نے رقاصہ کا نقاب اتارا تو اس کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تو پھر اب......" ہیریسن نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "لوگوں کو بتا دیں کہ اصل میں رقص کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ پھر شروع ہو جاؤ تم لوگ بھی۔" ہیریسن نے موسیقاروں کو بھی سرکاری آلات سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی سب سے بہترین موسیقی بجاؤ، میں تم لوگوں کو اپنا شیر اور جاگیردار بناؤں گا۔"

سازندے اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آغاز میں انہوں نے موسیقی کی طرز کو اسی عام نہج پر چلایا جس پر وہ پہلے چلا رہے تھے لیکن جب ہیریسن نے دو موسیقاروں کو ان کی کرسیوں سے اٹھا کر ہوا میں کسی استاد موسیقار کی طرح لہرایا تو انہوں نے اسے پہلے سے بہتر کیا اور موسیقی کو ایک نئے رنگ اور ترنگ میں ڈھالنے لگے۔

اس نئی ترنگ نے اس میں جوش بھر دیا اور وہ اپنی ملکہ کے ساتھ جھوم جھوم کر ناچنے لگا۔ اس نے اپنا بھاری ہاتھ اس کی نازک کمر کے گرد حمائل کیا اور جھومنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہر چیز سے آزاد ہو گیا ہو۔ بحر و بر کے ہر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ ہوا میں جھولنے لگے، جیسے انہوں نے بے وزن ہو کر زمین کی کششِ ثقل کو مات دے دی ہو۔ جیسے کوئی ہرن قلانچ بھر کر چاند کو چھونے کی خواہش رکھتا ہو۔ اسی کوشش میں آپس میں بوس و کنار بھی ہوئے۔

ہال کی چھت تقریباً تیس فٹ بلند تھی مگر انہوں نے خالص پیار اور ارادے سے اسے چھونے کی کوشش کی اور شاید اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے اگر وہ چڑیل محتسب اعلیٰ برائے مساوات یعنی ڈایانا موون گلیمپرز ان کی جنت میں دخل انداز نہ ہو جاتی۔

اس کے ہاتھ میں ایک شارٹ گن تھی جس کا رخ اس نے آتے ہی شہنشاہ اور اس کی ملکہ کی طرف کیا اور دو بار فائر کیا۔ جس کے نتیجے میں وہ دونوں فرش پر ڈھیر ہونے سے قبل ہی اگلے جہان سدھار چکے تھے۔ اس نے پھر گن کو دوبارہ لوڈ کیا اور موسیقاروں کی طرف رخ کر کے بولی۔

"اگر تم لوگوں نے دس سیکنڈز کے اندر اپنے آلاتِ معذوری دوبارہ نہ پہنے تو خود ذمے دار ہو گے۔"

اسی دوران بجرون گھرانے کے ٹی وی کی ٹیوب جل گئی اور اسکرین اندھیرے میں ڈوب گئی۔

ہیزل، جارج کی طرف مڑی تاکہ اس حوالے سے کوئی تبصرہ کر سکے مگر جارج تو کچن میں جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جارج بیئر کے ایک کین کے ساتھ واپس آیا اور چند لمحے رکا تاکہ وہ کرخت آواز ختم ہو جائے۔ اس کے بعد وہ بیٹھا اور ہیزل سے مخاطب ہوا۔

"تم ابھی رو رہی تھیں؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"کس لیے؟"

"شاید بھول گئی۔" وہ بولی۔ "لیکن ٹی وی پر واقعی کچھ ایسا ہوا ہے جس نے مجھے رلا دیا۔"

"کیا؟"

"پتا نہیں، لگتا ہے کہ جیسے میرے دماغ نے سب کچھ مکس کر دیا ہو۔"

"دکھی چیزوں کو بھول جاؤ۔" جارج نے کہا۔

"میں ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" جارج نے کہا اور ایک جھرجھری لی، جیسے اس کے ذہن میں بندوق کا دھماکا ہوا ہو۔

"میرا خیال ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی چیز تھی۔"

"ذرا دوبارہ سے یہ بات کہنا۔" جارج نے کہا۔

"ارے وہ کوئی غیر معمولی واقعہ تھا، جس نے مجھے رونے پر مجبور کیا، لیکن اب یاد نہیں کہ وہ کیا تھا۔" ہیزل نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

✱✱✱

urdunovels.com

محفل شعر و سخن

مقصود میمن.....کراچی

آگ میں پانی بھر کے لایا جاسکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جاسکتا ہے

شوکت امام.....ایبٹ آباد

بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزنِ زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی
اے موسمِ خوشبو کی طرح روٹھنے والے
پیغام ترا لے کر صبا کیوں نہیں آتی

تکلیم شیرازی.....فیصل آباد

تنہائی ہے، غربت ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے، کس کو پکاریے

خالد ہاشمی.....میانوالی

فراقِ یار میں، میں جس طرح مرتا تھا، مرتا ہوں
وہ روح وتن کی بیزاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

جاذبہ غزل.....گھوٹکی

وقت تو دو ہی کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

حرا اطہر.....کراچی

اپنے عیبوں کو زمانے سے چھپانے کے لیے
ہم ہر اک شخص پہ الزام لگا دیتے ہیں

نبیلہ فراز.....ٹنڈو جان محمد

نامِ وفا اور وہ بھی اس زمانے میں
یہاں تو بے وفائی بھی مول بکتی ہے

خرم خان.....سرگودھا

نہ گھبرا چار دن کے واسطے اے روح قالب میں
گیا جب اس مکاں سے پھر نہیں اس کا مکیں آیا

قاسم مجید.....لاڑکانہ

پاس رسوائی کا دونوں جانبوں سے شرط ہے
میں تمہیں، تم مجھ کو سمجھاؤ خدا کے واسطے

عائشہ اکبر.....کراچی

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

منصور احمد.....میرپور خاص

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

محمد ظفر اللہ ضیا.....کمالیہ ٹی

ان سے پوچھو کبھی چہرے بھی پڑھے ہیں تم نے
جو کتابوں کی کیا کرتے ہیں باتیں اکثر

حنیف خالد.....لاہور

موسم تھا بے قرار تمہیں سوچتے رہے
کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار تمہیں سوچتے رہے

نذر شیرازی.....شاہ پور

ہم زہر اسے دے کر گمنام مرے لیکن
وہ پی کے ہلاہل بھی کس شان سے زندہ ہے

● نعیم ثاقب...... جہلم

اس قدر درد سے مانوس ہوئے ہیں ہم لوگ
کوئی دشمن کو نہ چھیڑے تو گلہ کرتے ہیں

● مسرت جعفری...... ڈھڈیال

انا کی جنگ تھی جھکنے کا تو سوال نہ تھا
ورنہ اس کو منانا کوئی محال نہ تھا

● سمیرا ناز...... وہاڑی

جینے والوں سے کہو جان سے جانے کے لیے
کیا پڑتا ہے کئی زخم اٹھانے کے لیے

● قدرت اللہ...... پٹھان کوٹ

ویسے تو ہم وہی ہیں جو پہلے تھے دوستو
حالانکہ جیسے پہلے تھے ویسے نہیں رہے

● محمد عباس...... کاموکے

شام الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

● ملک عطااللہ...... سیالکوٹ

آج تو محفلِ یاراں پہ ہو مغرور بہت
جب کبھی ٹوٹ کے بکھرو گے تو یاد آؤں گا

● یامین راجپوت...... کنڈیارو

ٹوٹ گئے پیمانِ وفا اس دور میں کیسے کیسے لوگ
یہ مت سوچ قتیل کہ بس اک یار تیرا ہرجائی ہے

● مدثر حسین...... کمالیہ

ویسے اشعار کئی ہیں کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر آج اسی بے وفا کی بات کریں

● غفار خان...... گوجرانوالہ

تو جو ہے وہ لفظ میرے قصے کا
فراموش ہو نہیں سکتا

● زاہد حسین...... کوئٹہ

اپنی بستی میں ظفر کوئی رفوگر ہی نہیں
کس کے گھر آج یہ بوسیدہ قبا لے جاؤں

● عظمت علی...... ملتان

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

● عمران احمد...... حیدرآباد

ہم تو وہ دریا ہیں تجھے پار لگانے کے لیے
بیٹھے ہیں بھرتا ہوا گرداب اپنا

● نازیہ مبارک...... نوشہرہ

بکھرا ایسے نقش و نگار بنے کہ اپنی صورت رہی نہ اپنی
بڑے تحمل کے ساتھ دیکھا یہ حشر انقلاب ہم نے

● حکیم بواص...... ساہیوال

قسمت ہماری گیسوئے جاناں سے کم نہیں
چہرے سنوارتے گئے، اتنے ہی بل پڑے

● محمد علی اصغر...... مری

اب بھی گروں میں کمی آگئی ہو شاید
جو زخم سیا جائے ادھڑا ہی سیا جائے

● فرخ سیال...... فیصل آباد

ہاتھ اٹھے ہوئے رنجیر میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

● ارشد خان...... چنیوٹ

کہاں ایک ہے لیکن جدا ہیں واقعے اپنے
تمہیں محشر اٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے

● عامر ندیم...... جڑانوالہ

ورق ورق میری نظروں میں کائنات کا ہے
کہ دست غیب سے لکھی ہوئی کتاب ہوں میں

● اعجاز حسین...... ہری پور

میں تو سورج سے الجھنے کے لیے نکلا تھا
کون لایا ہے تہِ سایۂ دیوار مجھے

● سعید خالد...... خوشاب

گہری خموش جھیل کے پانی کو یوں نہ چھیڑ
چھینٹے اڑے تو تیری قبا پر بھی آئیں گے

● تبسم ناز...... روہڑی

منزل پہ جا کے کھو گیا کیوں کارواں نہ پوچھ
ہے ساتھ بھی طویل بھی یہ داستاں نہ پوچھ

● شاہینہ مہتاب...... چنیوٹ

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ہوئی وہاں اک دیا جلا چلے

● یاسمین کنول...... خانیوال

زندگی جس کے دم سے ہے ناصر
یاد اس کی عذاب جاں بھی ہے

● عرفان شیخ...... لاڑکانہ

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

❁ یونس مرزا......میرپور خاص

ایک لمحہ ہی مسرت کا بہت ہوتا ہے
لوگ جینے کا سلیقہ ہی کہاں رکھتے ہیں

❁ گلزار حسین......بی

جسے مانگا تھا میں نے ہر دعا میں
وہ بن مانگے کسی کو مل گیا ہے

❁ خورشید علوی......کراچی

وہ اچانک بچھڑ نہ جائے کہیں
اس تصور سے جان جاتی ہے

❁ مسرت جعفری......پنڈی گھیب

دلوں کی جگمگاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے پہلے

❁ قیوم عاصی......ملتان

کھنچا ہے کہاں تک تجھے بانہوں کی کمان میں
تو دل بچے لیے ہے تو میرے دل میں اتر بھی

❁ جمیل اعوان......سرگودھا

بند تھیں مسجد کی سب راہیں پہرا تھا بت خانے میں
تھک کر ہم نے ڈال دیا ہے ڈیرا اب مے خانے میں

❁ خواجہ رفیق......مظفر آباد

یہی مزاج ہے اپنا کسی کا دل نہ دکھے
جدائیوں کو بھی چاہا ہے قربتوں کی طرح

❁ جلیل عالم......اٹک

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تیری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

❁ راجا ناصر......چکوال

کوئی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فراز
امیر شہر بھی ہے اور خطیب شہر بھی ہے

❁ سعدیہ رفیع......سرگودھا

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا میرا مجبور ہو جانا

❁ انیلا رحمان......کراچی

چاہے اسے خلش کہو یا تیر نیم کش
رہتا ہے تم کو دل میں کسی نام سے رہو

❁ راشد حبیب......مظفرگڑھ

رعنائی ہویدا ہے مرے چہرے سے لیکن
خود اپنے ہی اشکوں سے یہ رخسار دھلے ہیں

❁ سخاوت علی......اوباڑہ

وہ ہی باذوق ہیں جہاں میں عدم
میں ہوا یا مرا رقیب ہوا

❁ ساجد عباس......میانوالی

ہم سے ایک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں مات اکثر

❁ رئیس روغانی......پشاور

جس کی نظروں میں ہم نہیں اچھے
کچھ تو وہ شخص بھی برا ہو گا

❁ تصور......شیخوپورہ

نہ نگاہ پھیر ساقی، نہ برت یہ بے نیازی
تیرے پاس آئے ہیں ہم کئی راستے بدل کر

❁ عبدالرشید......سوات

محبت میں مری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں
ترا آنا، ترا ملنا، ترا اٹھنا، ترا جانا

❁ احمد رضا......نواب شاہ

خستگی دیوار ہوں مجھے ہاتھ مت لگا
میں گر پڑوں گا دیکھ سہارا نہ دے مجھے

❁ ڈاکٹر فرحت محمود......ساہیوال

اپنی پلکوں پہ چراغوں کو سنبھالے ہوئے رکھنا
اس ہجر کے موسم کی ہوا تیز بہت ہے

❁ ندا نایاب......چکوال

وہ کب کا بھول چکا ہو گا پیار کا قصہ
بچھڑ کے کس کو کسی کا خیال رہتا ہے

❁ ظفر اقبال......گوجر خان

اب بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشان منزل
زندگی تو ہی بتا، کتنا سفر باقی ہے

❁ محبت خان......ہری پور

ہم تم سے چھین لیں گے مرے شاہ، بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے ہم سے غرور اپنا

کوپن برائے شمارہ مئی 2026

محفل شعر و سخن

نام:

پتہ:

urdunovels.com

زندگی میں جب رنگینیاں ہوں تو انسان بہک ہی جاتا ہے... چمکتی چیزیں اور شباب اسے اپنی جانب مائل کرتی ہیں... انہیں پانے کی چاہ اسے اندھا کر دیتی ہے... اور وہ بس کسی حسینہ کی زلفوں کی چھاؤں میں ہی سکون پاتا ہے... مگر کوئی انوکھا واقعہ اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل دیتا ہے۔

ایک بھٹکی ہوئی روح کی عیاش طبع نوجوان سے دل لگی

کھیل کھیل میں

ماہ وش طالب

موسم میں تبدیلی آرہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں ہڈیوں کے اندر تک گھسی گئیں اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وقت بے وقت کی بارشوں اور درختوں کی اجاڑ شاخوں نے پرندوں کو بھی بے آسرا سا کر دیا ہے۔ سڑکیں، گھر، دروازے، کھڑکیاں، میدان، ندی، نالے ہر جگہ برف کی تہیں جم گئی تھیں۔ گویا ہر کسی کی زندگی پر جمود طاری ہو گیا ہو۔

آسکر کی طبیعت ہمیشہ سے ہی رنگین رہی تھی۔ وہ عاشق مزاج سا بندہ نہ جانے اب تک کتنوں کے دلوں

سنبھل چکا تھا۔ بڑی بے باکی ہے اس میں تو۔ آسکر کو اب بھرپور لطف آنے لگا۔

"ہاں...... بس......" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی اور یوں اپنے سر پر خود ہی چپت لگائی جیسے وہ اس کے سامنے ہو۔

"کیا...... بس؟"

"میں سوچ رہا تھا، خوب بنے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" اس نے بات بنائی۔

"ہاں بالکل...... چلو بعد میں بات ہوگی، اب رکھتی ہوں فون۔"

اور اس دن کے بعد سے آسکر کو بے چینی سے اس کے اگلے فون کا انتظار رہنے لگا جو صد شکر کہ ہرگز زیادہ لمبا نہ تھا۔ اگلی شام اسی وقت پر اس نے کال کی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ ہمیشہ ایک مخصوص وقت پر فون کرتی تھی۔ آگے پیچھے کال کرنے سے اس نے آسکر کو منع کر رکھا تھا۔ اس کے استفسار پر اس نے بتایا۔ "کچھ مجبوریاں ہیں، تم نہیں سمجھو گے۔"

"کیوں، کیا کوئی اور بھی ہے؟" اس کے لبوں سے یہ سوال پھسلا جو اسے تپا گیا۔

"دکھا دی نا اپنی اصلیت...... تم مردوں کی گھٹیا ذہنیت بس یہیں تک سوچ سکتی ہے...... اپنا پتا نہیں کہ ایک وقت میں کتنوں کے دلوں سے کھیلتے ہو اور کتنی حسیناؤں کی زلفوں کو آلودہ کرتے ہو۔" اس کے کھرے تجزیے (طنز) پر ایک بار پھر آسکر بغلیں جھانکنے لگا۔

خود اس کے لیے یہ بات جہت حیران کن تھی کہ اس کی اس قدر بدزبانی اور صاف گوئی بھی آسکر کو بری نہیں لگتی تھی۔ تقریباً ہر روز ہی بات کرتے ہوئے بالواسطہ وہ مردوں کی اور بلاواسطہ اس کی ذات پر طنز کے تیر چلا دیتی، مگر پھر تو وہ خود چھیڑ کر کے سن لیتا، کچھ اس کے لہجے کی شیرینی اسے اس کی طرف کھینچتی ہی جاتی تھی کیونکہ وہ بڑے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کوئی نہ کوئی چبھتی بات کرنے کے بعد کوئی ایسا موضوع زیر بحث لے آتی جس کا پچھلی کہی گئی تلخ بات سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور پھر اپنی ہی باتوں کے سحر میں اسے بھی لے ڈوبتی۔

"تم مجھ سے ملتی کیوں نہیں؟" دو ماہ کی صرف فون تک محدود رہنے والی گفتگو اب اسے بیزار کرنے لگی تھی کہ خالی خولی چٹ چیٹ اس کے لیے وقت کا زیاں تھی۔ وہ تو ایک ہفتے کے اندر اندر لڑکیوں سے کیفے اور بارز میں تفصیلی ملاقات کر لینے کا عادی تھا۔

"میں تمہیں ملوں گی بھی نہیں جانِ من!" اف، اس کا یہ طرزِ تخاطب ہی تو اسے مار ڈالتا تھا کہ چاہ کر بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو پا رہا تھا۔

"شیلے...... کوئی نئی کی کوئی نہیں کہ آرام سے چلی جا سکے۔" اس بار اس کا موڈ بہت ابھا ہوا سا تھا۔

"تو کتنا وقت چاہیے تمہیں؟" وہ بھی ڈھٹائی پر اتر آیا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

"اس...... ؟" وہ الجھ گیا۔

"ہیلو...... ہیلو......!"

لائن کٹ چکی تھی۔ اس نے غصے میں سیل فون بستر پر پٹخا۔

اب اسے کل کا انتظار تھا کہ آر یا پار۔ اگر وہ اس سے ملاقات کر سکتی ہے تو ٹھیک، ورنہ وہ اپنا راستہ الگ کرے۔ جتنا وقت اس نے شیلے پر ضائع کر دیا تھا کر لیا۔ اسے عرصے میں تو وہ آرام سے اپنا وقت کسی اور کی صحبت میں مزید خوشگوار بنا سکتا تھا۔ خواہ مخواہ اس کے دیدار کی تڑپ میں اپنی مہکتی راتوں کو خزاں کی نذر کیا، مگر اب اور نہیں۔ اس قدر انتظار کرنے کی آسکر کی عادت جو نہ تھی۔ لہٰذا اگلی شام اس نے دوبارہ اس سے ملنے کی درخواست کی۔

"میرے پیچھے مت بھاگو...... مجھے بس محسوس کرو۔"

اس کی مدھری آواز اسے خوشگوار احساس سے بھگو گئی۔

"شیلے! تم سمجھتی کیوں نہیں۔ جتنا میں تمہیں محسوس کرتا ہوں، اتنی ہی تمہیں چھونے کی طلب بڑھتی ہے۔" اس نے بھی جذبات کی لہروں میں ڈوبتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ حیران ہوتا تھا کہ آخر اس احتراز کی وجہ کیا ہے؟ ان دونوں کو کوئی معاشرتی قید تو تھی نہیں۔ اس نے ایک بار شیلے سے اس کی فیملی کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ شاید ان کی طرف سے کوئی پابندی ہو یا وہ کسی سے دھوکا کھا کر اب اپنا دکھ بھلانے کے لیے آسکر کے ساتھ وقت گزاری کر رہی ہو، مگر ہمیشہ کی طرح اس نے پہلے آسکر کو منہ توڑ جواب دیا اور پھر بتایا کہ وہ اپنے والدین سے الگ ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔

"ہاں، مرد جو ہوئے تم۔ اس لیے ہر چمکتی شے کے پیچھے بھاگنا اپنا فرض ہی سمجھ لیتے ہو۔" وہ پھر سے اسے ذلیل کرنے لگی۔

"تمہیں مسئلہ کیا ہے سامنے آنے میں؟"

"تم بھاگ جاؤ گے...... جبکہ تمہیں تو لذت پیا کی پسند ہے۔" وہ سرگوشی کرنے والے انداز میں بولی۔

urdunovels.com

”اگر نیند کے خمار سے جاگنے کا نتیجہ تمہاری قربت کا حصول ہے تو ہزاروں نیندیں قربان۔“ وہ بھی یکدم ہی پرعزم ہوا۔

”تم حقیقت کا سامنا نہیں کر سکو گے۔“ اب کے اس نے پیچیدگی کی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ میں ایک سراب ہوں۔“ کہہ کر اس نے کال بند کر دی جبکہ وہ اس کی ذومعنی باتوں میں ہمیشہ کی طرح الجھ کر رہ گیا۔

اور پھر جب آسکر کو اس کے عروج شباب اور جلیبی کے مانند الجھی ہوئی میٹھی باتوں نے بالکل اپنا اسیر کر دیا کہ اس سے بات کیے بنا اب کوئی گزارہ نہیں تھا تو ایک رات اسے اس کے نمبر سے پیغام موصول ہوا جس میں شیلے سے ملاقات کا مکمل پتا درج تھا۔ اسے تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔

بہار ختم ہو چکی تھی اور گرمی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ لمبے دنوں کی لو دیتی دوپہریں...... گھر سے نکلنا دشوار لگتا تھا۔ اس موسم میں ہر کوئی دھڑا دھڑ ساحل سمندر کا رخ کرتا اور بیچ میں نہا کر اپنے اندر باہر کی گرمی کو تلف کرتا۔ آسکر کی بھی عادت تھی، گرمیاں شروع ہوتیں تو ہر ہفتے کبھی دوستوں اور کبھی لڑکیوں کے ساتھ بیچ پر جاتا، مگر اس بار تو یوں لگتا تھا جیسے شیلے نے اسے کوئی اور کام کرنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں ہے۔

اور اب ڈیڑھ گھنٹے تک اپنی اسپورٹس کار اس سنسان سی سڑک پر دوڑانے کے بعد اس نے بالآخر وہاں کھڑے اکلوتے ٹریفک آفیسر سے پتا پوچھا تو اس نے ایک نظر پہلے آسکر کو گھورا جس کی وجہ اسے بعد میں معلوم ہوئی۔

”ویسے یہ پتا نامکمل ہے مگر میں چونکہ یہاں قریب ہی رہتا ہوں اس لیے اندازہ لگا لیا۔ یہاں سے اگلا راؤنڈ اباؤٹ...... اور وہاں سے دائیں مڑ جانا۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی راہنمائی کی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جب شیلے کے بتائے گئے پتے پر پہنچا تو لرز کر رہ گیا۔ وہ تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی شمشان گھاٹ ہو...... پرانا سا...... صدیوں پرانا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اندر بڑھتا رہا۔ وہاں پر بہت سی قبریں تو اجڑی ہوئی لگتی تھیں۔ اسے گرمی میں بھی ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

چلتے چلتے وہ اچانک ایک قبر کے پاس آ کر رکا۔

ان قدرے خستہ حال قبر کے اوپر کتبہ نصب تھا جس پر جلی حروف میں درج تھا۔

شیلے جوزف

تاریخ پیدائش: 1878ء

وہ ٹھٹک گیا۔

صرف تاریخ پیدائش دیکھ کر نہیں، بلکہ تاریخ وفات کے نہ ہونے پر بھی۔

اور اس کتبے کے کونے پر لگی شیلے کی چھوٹی سی تصویر دیکھ کر۔

اسے یکدم محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے قدم جکڑ لیے ہیں۔ من من بھر کے قدم لیے کس مشکل سے وہ اس جگہ سے نکلا، یہ وہی جانتا تھا۔

مہینا بھر اسے شدید بخار چڑھا رہا۔ آنکھیں سرخ بتی کی چمکیلی روشنی کے مانند لال رہتیں اور حواس اکثر خلاؤں کے سفر پر نکلے ہوتے۔

پھر سوئے اتفاق کہ دو سال بعد ونچسٹر کے قلعے کے پاس سے اس کا گزر ہوا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی سرگوشی کرتی ہوا اور درختوں کی سرسراہٹ اسے بے حد اساں کر رہی تھی۔ قلعے کا بڑا سا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے گزر جانا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اور کیسے کسی احساس کے تحت اس نے نظر اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔

اِکا دُکا لڑکیاں کھلے سے صحن اور سیڑھیوں پر نظر آ گئی تھیں، پھر اچانک اس کی گاڑی رش میں پھنس گئی۔ یونہی دوبارہ عمارت کی اوپری منزل پر نظر ڈالی تو ایک تیکھے چہرے والی دوشیزہ اسے ہی تک رہی تھی۔ آسکر کا دل دھک سے رہ گیا اور دوبارہ اسے دیکھنے کی سنگین غلطی نہ کرنے کی خاطر وہ سرپٹ وہاں سے دوڑا۔

☆☆☆

اب یہ حال ہے کہ کسی لڑکی کا نام سن کر بھی اسے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ دوست یار نت نئی ترغیبیں دیتے ہیں مگر وہ غیر محسوس طریقے سے ان سے کنارہ کش ہوتا جا رہا ہے۔ وہ جو موج مستی کے نام پر کم عمر حسیناؤں کے جذبات اور جسموں سے کھیلنے کا عادی تھا، اسی کھیل کھیل میں ایک مری ہوئی دوشیزہ نے اس کی دل لگی کے سارے کھیل ختم کر دیے...... کہ وہ لڑکی جو سراب تھی، جو خود بھٹکی ہوئی روح تھی، اس نے حقیقتاً آسکر کی ذوقتی زندگی کی سمت بدل دی تھی۔

✱✱✱

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

آخری قسط

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عیرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی نیندیں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

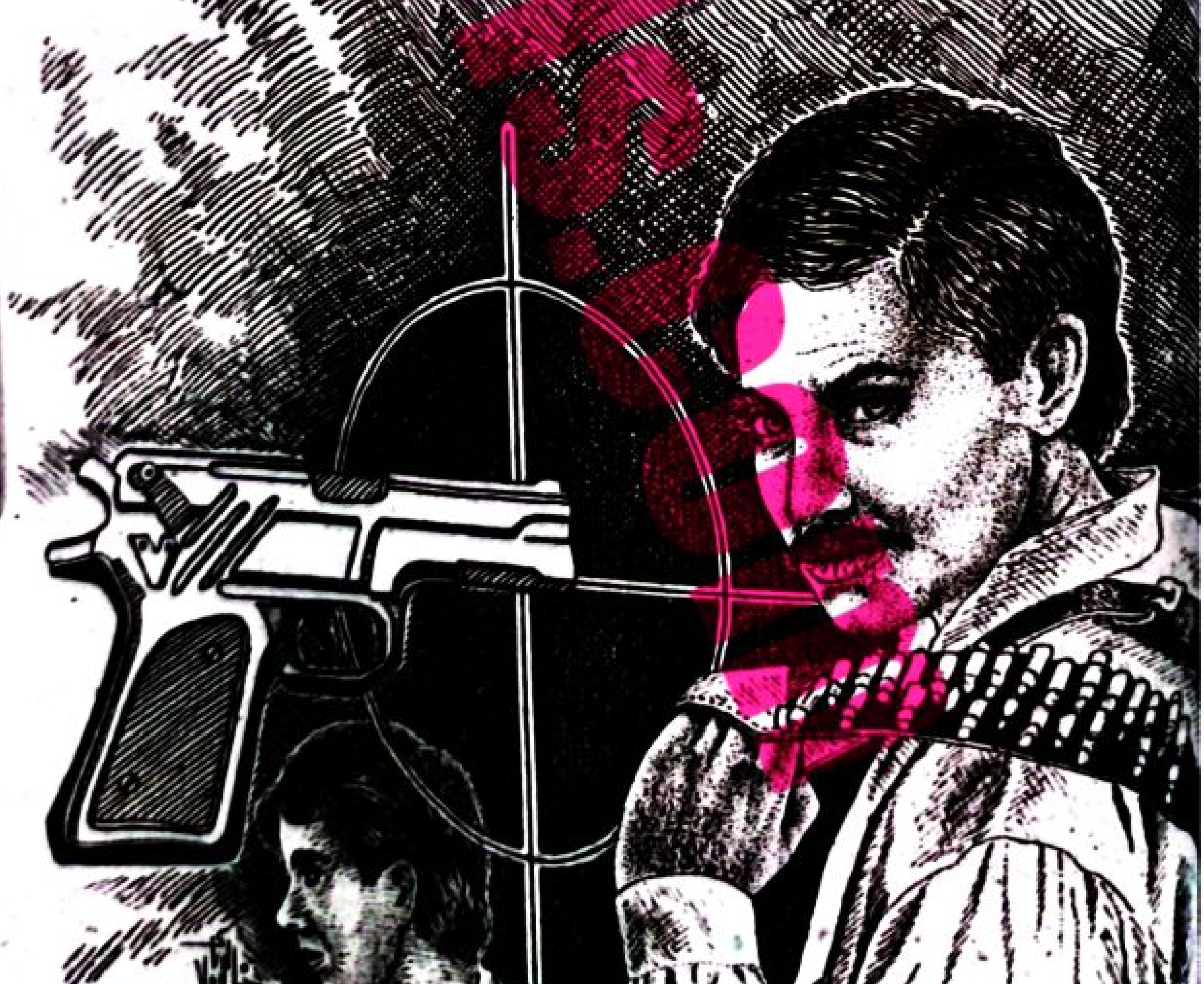

ماداموں شاریا چوڑی کے چھلانگ لگاتے ہی لامحالہ بائیک کو ایک جھٹکا سا لگا تھا لیکن میں اس کی حرکت ناکام جاتے ہی پہلے سے ہوشیار ہو چکا تھا۔ اسی سبب جب اس نے اپنی کوشش ناکام ہوتے دیکھی تو شاریا نے چھلانگ لگا دی۔ میں بھی پہلے ہی اس کی طرف سے محتاط ہو گیا تھا، لہٰذا اس کے چھلانگ لگاتے ہی میں نے بائیک کو یکدم بریک لگائے اور اسے گرتا چھوڑ کر میں بھی تیزی سے پلٹا۔

تاریکی میں، میں نے شاریا کو لڑکھڑاتے ہوئے ایک جانب بھاگتے دیکھا تو چیتے کی طرح جست بھر کر اسے جا دبوچا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ میرے بازوؤں کے شکنجے میں پھڑکنے لگی۔ اس نے کہنی کی ضرب میری پسلیوں میں مارنے کی کوشش کی لیکن کنپٹی پر پڑنے والے میرے ایک ہی مکے نے اسے بے حس و حرکت کر ڈالا۔

اس وقت اس ویران سے چھوٹے دیہات کا وہی مختصر سا تھانہ میرے لیے "بیس کیمپ" یا "تفتیش گاہ" بن چکا تھا جہاں کا انچارج سب انسپکٹر توقیق گویا میرا معتقد بن چکا تھا کیونکہ ایک تو میری مدد کرنے پر اس کی "ایفیشنسی" مارک اچھل بن چکی تھی، دوسرے محکمہ گیرائی سے تعاون کرنے پر اسے اپنی ترقی کے چانسز واضح نظر آنے لگے تھے۔ بہرکیف، میں چیتے جیسے شاریا کے بے سدھ وجود کو بائیک پر ڈال کر سیدھا ادھر ہی پہنچا۔

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ موجودہ حالات کے پیش نظر اب وہاں مجھے اردلی کے ساتھ دو سپاہی موجود ملے۔ انسپکٹر اپنے کوارٹر میں سونے کے لیے جا چکا تھا۔ چونکہ یہ تینوں مجھے جانتے تھے، اسی لیے دوبارہ یہاں ایک گوری لڑکی کے ساتھ دیکھ کر حیران سے ہوئے۔

اردلی نے میرے ایما پر فوراً جا کر انسپکٹر توقیق کو بلا لیا۔ وہ بیچارہ سونے والے سادہ لباس میں ہی سروس ریوالور کی پیٹی باندھے آن موجود ہوا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں خمار آلود تھیں۔

میں نے شاریا کو اسی تنگ سے کمرے میں لا کر چارپائی پر ڈال دیا جس پر چند گھنٹے پہلے وسیم کو لٹا کر میں اس سے تفتیش کر چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے توقیق سے پہلا سوال وسیم وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں جو اسے اس سلسلے میں ہدایات دے کر گیا تھا، اس نے وہی کیا تھا۔ کیونکہ میرے انسپکٹر شیراز کو فون کرنے کے بعد وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی یہاں آن پہنچا تھا۔

"اس جاپانی گڑیا کو کہاں سے پکڑ لائے ہو سہراب صاحب؟" (یہ جاپانی لڑکی کہاں سے پکڑ لائے ہو؟) توقیق نے چارپائی پر بے سدھ سی پڑی شاریا کو کچھ معنی خیز نظروں سے تکتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"یہ گڑیا نہیں ہے، پوری آفت کی پرکالا ہے۔" میں نے بتایا، پھر اس کے بارے میں اسے مختصراً آگاہ کر دیا۔ یہ سنتے ہی کہ یہ کسی خطرناک غیر ملکی کرمنل گروہ سے تعلق رکھتی ہے، توقیق یکدم الرٹ نظر آنے لگا۔ اسے اب یہ سب ایک کڑا امتحان ہی نظر آنے لگا تھا۔

"تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا انسپکٹر!" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یہاں تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر نالا ڈیک والے راستے کی ایک ویران گودام نما عمارت میں بڑی خونریزی ہو چکی ہے۔ فوراً چند سپاہیوں کو بھیج کر لاشیں قبضے میں کرواور اس عمارت کو سیل کر کے اس کے مالک کا پتا چلاؤ۔"

"سمجھ گیا جی، سمجھ گیا۔" وہ یکدم سر ہلا کر بولا۔

"ایک بات اور دھیان سے سنو۔" میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "یہ بات ذہن میں رکھنا کہ مبینہ طور پر وہ عمارت دو چودھری بھائیوں شالا جی اور وداب جی کی ملکیت بتائی گئی ہے۔ وسیم کا یہ بیان ریکارڈ پر موجود ہے، جس کی کیسٹ انسپکٹر شیراز کے پاس محفوظ ہے۔ باقی تم اپنی پوری تفتیش کر کے اس کی رپورٹ بھی فوراً محکمہ گیرائی والوں کو صبح تک دے دو۔"

"میں ابھی جاتا ہوں جی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ اس جاپانی گڑی...... میرا مطلب ہے، اس آفت کی پرکالا کا کیا کریں؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "تم اپنا کام نمٹاؤ، ایک سپاہی کو میرے پاس چھوڑ دو۔"

"بہت بہتر جناب! لگتا ہے بہت بڑی کھچڑی پک رہی ہے۔"

"کھچڑی نہیں، پوری دیگ کہو۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "اسی لیے بہت محتاط رہنا اور جو اہم کام دیا ہے تمہیں، وہ پوری ذمے داری اور ہوشمندی سے کرنا بلکہ اس معاملے میں کوئی ذرا سی بھی پیشرفت ہوتے دیکھو تو فوراً مجھے مطلع کرنا۔ میں تمہیں اپنا فون نمبر دے دیتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے اسے جوجی کے گھر کا نمبر دے دیا۔

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ ایک مراد نامی سپاہی اور اردلی میرے پاس رہے۔ اردلی کو تو میں نے باہر کھڑے رہنے کی تاکید کی جبکہ سپاہی کو میں نے پچھلی عمارت کے گیٹ پر متعین رہنے کو کہہ دیا۔

اب اندر میں اور شاریا تھے۔ کمرے میں ایک ہی ...نگ کا پھیکی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ شاریا کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر میں اسے ہوش میں لے آیا۔ اس کے زخم کی پٹی کر دی گئی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی وہ پہلے تو پریشان انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر مجھ پر نگاہ پڑی اور پھر شعلہ بار نگاہوں سے میری طرف گھور کر غرائی۔

"تم بہت پچھتاؤ گے۔ تم نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں۔ تم تو ایک عام سے کرمنل ہو گے، جن کی ہمارے پاس بازو اور شوفرز سے زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔"

میں زہریلے انداز میں مسکرا کر بولا۔ "ابھی تمہیں جلد ان ساری باتوں کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ ویسے حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک تمہیں اوقات کا پتا نہ چل سکا ورنہ تم اس بیچارگی کی حالت میں میرے سامنے کیوں ہوتیں۔"

"تم دھوکے باز ہو۔" وہ غرائی۔

"الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" میں نے اس کی بے بسی اور بیچارگی پر دانستہ حظ اٹھانے کے انداز میں کہا تاکہ اسے زیادہ تاؤ دلا سکوں۔ "تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ تمہاری اوقات اپنی اصلیت سمیت مجھ پر بالآخر ظاہر ہو چکی ہے۔ اسی لیے اب تم یہ رویّہ اپنائے ہوئے ہو۔" میں نے اس کی دکھتی رگ پر چوٹ کی۔

اس کا سرخ پڑتا چہرہ معمول پر آنے لگا۔ آنکھوں میں پریشانی دکھائی دینے لگی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، اس اکڑ بازی کے بجائے انسانوں والے سوال اور جواب ہمارے درمیان ہوتے رہیں گے تو معاملے کی بات آگے بڑھ سکے گی۔"

"تم مجھے میرے ہوٹل میرے ساتھیوں تک پہنچا دو، میں ان کی غیر موجودگی میں کسی بھی معاملے پہ بات نہیں کر سکتی۔" وہ مکاری سے بولی۔

"مجھے منظور ہے، لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ انہیں تم فون کر کے ادھر ہی بلا لو؟" میں نے چالاکی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں یکلخت ایک نامعلوم سی امید کی چمک ابھری، بولی۔

"وہ ابھی ہوٹل میں نہیں ہوں گے۔"

"پھر کیسے ان کا پتا چلے گا کہ وہ کہاں ہیں؟" میرا وہ ...جھنی کی حد تک درست ہونے لگا تھا جس کا میں موقع محل ...معاملات سے ادراک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یعنی اس اندازے کے چودھری کو بھی نہ ہو پایا تھا۔ وہ وسیم پر ہی اس خونریزی اور جھگڑے کے چوری ہو جانے کا شبہ کیے ہوئے تھا جبکہ میرے قیاس کے مطابق یہ ساری کارستانی انہی لوگوں (مسٹر اور مسز ولیم وغیرہ) کی تھی۔ کسی سبب ان کے درمیان کوئی معرکہ آرائی ہوئی ہوگی جس کے سبب ان لوگوں نے فوراً قدم اٹھایا ہوگا، لیکن ایک راز ابھی تک سمجھ نہیں آیا تھا کہ چودھری کو ان پر شبہ کیوں نہیں ہوا تھا۔ وہ وسیم یا مجھ پہ ہی فضول الزام کیوں کر رہے تھے؟ تاہم میں شاریا چودھری کے منہ سے یہ اگلوانے میں کامیاب تو ہوا تھا کہ ہوٹل کے علاوہ بھی ان کا کوئی اور ٹھکانا تھا، کوئی خفیہ ٹھکانا۔

"وہ کہیں بھی ہوں، ہوٹل کا رخ ضرور کریں گے۔" شاریا چہک کر بولی۔ "میں وہاں موجود رہوں گی تو ان سے رابطہ بھی ہو جائے گا۔" اس کی بات نے میرے شبے کی تصدیق کر دی۔ میں نے کہا۔

"لیکن وہ تو تمہیں مردہ سمجھ چکے ہیں اور کیا خبر اب انہوں نے وہ ہوٹل بھی چھوڑ دیا ہو اور اپنے خفیہ ٹھکانے کا رخ کر لیا ہو۔ جیسا کہ تم نے ابھی کہا کہ وہ ہوٹل کا رخ کر سکتے ہیں۔"

میری بات پر شاریا کے چہرے کے آثار بدلے۔ یوں لگا جیسے اسے اپنی کسی غلطی کا احساس ہوا ہو۔ پھر وہ بات بنانے کی غرض سے بولی۔

"میں نے یہ کب کہا کہ وہ کسی خفیہ ٹھکانے میں ہو سکتے ہیں؟ میرا خیال تھا، یہ ہو سکتا ہے وہ ہوٹل میں ہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے ہوٹل کا نام بتاؤ اور کمرا نمبر بھی۔ میں یہاں سے فون کر کے تصدیق کر لیتا ہوں یا پھر تم ہوٹل کے استقبالیہ سے فون پر خود ہی بات کر لو۔" میں نے ایک اور چال چلی۔

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی پھر بولی۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ میرا گھر ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ اگر میں اسے پولیس تھانہ بتاتا تو وہ بدک جاتی، اسی لیے میں نے کسی وردی پوش سپاہی کو اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔

"فون کدھر ہے؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"دوسرے کمرے میں پڑا ہے، وہاں میرے بیوی بچے سو رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم فون کرنا چاہتی ہو تو میں فون سیٹ ادھر ہی اٹھا لاتا ہوں۔"

وہ کچھ سوچنے لگی پھر بولی۔ "تم ہو کون ـــ کیا کرتے ہو؟"

میں اس کی بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرایا، بولا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اب تک میرے بارے میں اندازہ قائم کر چکی ہو گی، جیسا کہ میں تمہارے بارے میں

urdunovels.com

کر چکا ہوں۔"

"ہاں، لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"میں بھی موقع پرست آدمی ہوں، دولت اور عورت میری ہمیشہ سے ضرورت رہے ہیں۔ اس کے حصول کے لیے میں ہر حد سے گزر جاتا ہوں۔"

میری بات پر وہ دلکش انداز میں مسکرائی اور لبھانے والے انداز میں اترا کر بولی۔ "لیکن میری جیسی خوبصورت لڑکی کو تو تم نے یوں باندھ رکھا ہے، ابھی تک کوئی رومانس تو نہیں کیا۔"

"حالات ہی ایسے رہے۔" میں نے ایک دم آنکھوں میں معنی خیز چمک لاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"فون لاؤ۔" وہ بولی۔ "لیکن میں فون کیسے کروں گی؟ تم نے میرے دونوں ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے پلٹ گیا۔ کمرے سے باہر نکلا، دوسرے کمرے سے ٹیلی فون سیٹ اٹھایا، اس کی وائر درست کی۔ سپاہی اور اردلی وہاں موجود تھے، وہ خاموشی سے مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھ رہے تھے۔

میں نے ان سے کہا۔ "جب تک میں نہ بلاؤں، اندر کوئی نہ آئے۔" دونوں نے اپنے سر کو بیک وقت اثباتی جنبش دی۔

میں ٹیلی فون لیے دوبارہ اندر آ گیا۔ وہ چارپائی پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ میں اس کے سامنے موجود کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ کرسی میں نے اس کی چارپائی کی طرف تھوڑی مزید کھسکا لی۔

"ہوٹل کا نمبر بتاؤ اور نام بھی۔"

"ویسے یہ طریقہ درست نہیں ہے۔" وہ ایک دم سرد لہجے میں بولی۔

"تو تم نے اب تک مجھے دو بار دھوکا دیا، وہ طریقہ درست تھا؟" میں نے بھی طنزیہ کہا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، پھر اس نے ہوٹل کا نام بتایا۔ میں چونک پڑا۔ یہ ہوٹل اقبال اسکوائر کے قریب ہی واقع تھا، گھر کی طرف جاتے ہوئے یہ راستے ہی میں پڑتا تھا۔ پھر اس نے نمبر بتایا، میں نے ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جانے لگی تو میں نے آگے جھک کر ریسیور اس کے کان سے لگا دیا۔

"یس، ہوٹل النور ریسپشن؟" دوسری طرف سے رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ اگرچہ دوسری جانب سے بھی پروفیشنل انداز میں پہلے ہی کہا گیا ہوگا۔

"روم نمبر تھری ناین ون سے مسٹر ڈورل یا چنگ جنگ سے بات کروا دو۔" اس نے ماؤتھ پیس پر کہا، پھر دوسری جانب سے کچھ سنتی رہی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اس کے بعد اس نے "اوکے" کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے ریسیور اس کے کان سے ہٹا کر کریڈل پر رکھ دیا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ دونوں وہاں نہیں ہوں گے۔" اس نے کہا۔ "اس خونی واقعے کے بعد اور مجھے مردہ جان کر دونوں نے ہوٹل فوری طور پر چھوڑ دیا ہوگا۔"

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اب انہیں کیسے ڈھونڈا جائے؟"

"میں کیا جانوں؟" وہ الجھ کر بولی۔ بات اس کی بھی غلط نہیں تھی۔ اس کے دونوں ساتھی بہرحال اسے مردہ سمجھ کر جا چکے تھے...... کہاں؟ یہ تلاشنا میرا کام تھا۔

"تم لوگ کس طرح یہاں پہنچے تھے اور پہلے کہاں قیام کیا تھا؟"

"ہم لاہور ائرپورٹ پر اترے تھے، وہاں سے کرائے کی گاڑی لی اور ہوٹل النور پہنچے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا واقعی تمہیں نہیں پتا کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہو سکتے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہنہ۔" میں نے کہا اور ایک گہری سانس لے کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کہاں چل دیے؟" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے خود ہی ڈھونڈنا پڑے گا۔"

"اور میں......؟"

"جب تک تمہارے دونوں ساتھیوں کا سراغ نہیں مل جاتا، تم ادھر ہی رہو گی۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ پھر ایک دم بھڑک اٹھی۔ "تم مجھے یہاں قید میں رکھو گے؟"

"مجبوری ہے۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ تمہارے دونوں ساتھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اب یومبورنگا کے مجسمے سمیت یہاں سے نکلنے کی کوشش میں ہوں گے۔" بالآخر میں نے اپنے

ہی کا اظہار کر دیا۔ چند ثانیے کے لیے اس کی آنکھوں میں
چمک پیدا ہوئی پھر وہ بولی۔

"یہ بھلا تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟"

"خوش قسمتی سے میرے تو بے شمار اندازے درست نکلتے ہیں۔"

"اور جو ہمارے درمیان برابر کی حصے داری کی ڈیل ہوئی تھی، وہ......؟"

میں اس کی بات پر ہنسا۔ "ڈیل تو تب ہوتا جب کچھ معلوم ہو۔ یہاں تو ہم دونوں ہی لاعلم ہیں اور دوسری بات یہ کہ تم اصل حقیقت چھپا رہی ہو۔ وہاں کیا ہوا تھا، کس پارٹی نے شب خون مارا تھا یا پھر کیا پتا تم لوگوں نے ہی مجسمہ مفت میں ہتھیانے کے لیے یہ سب کیا ہو۔ جب تک مجھے اصل بات نہیں پتا چلے گی، میں اپنے طور پر ہی لائحہ عمل تیار کرنے پر مجبور ہوں۔" کہتے ہوئے میں جانے لگا۔

اس نے عقب سے مجھے آواز دی۔ "ٹھہرو......!"

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ میرا نفسیاتی حربہ کامیاب گیا تھا۔ میں رک کر اس کی جانب پلٹا مگر وہیں دروازے پر ہی رکا رہا۔

"کیا ہے؟" میں نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"ادھر آؤ۔" اس نے بلایا۔ میں کندھے اچکاتا اس کی چارپائی کے قریب آ گیا۔

"ہاں، بولو کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ مجھے گھورتی رہی، پھر بولی۔ "میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی لیکن پہلے مجھے یہاں سے لے چلو۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اب تمہیں کوئی دھوکا نہیں دوں گی کیونکہ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ اب تمہارے بغیر ہماری دال نہیں گل سکتی۔"

مجھے اس کی مکاری پر غصہ تو بہت آیا مگر میں پی گیا اور بولا۔ "بس تم سے دو بار دھوکا کھا چکا، اب مجھے تمہارے کسی وعدے پر بھروسا نہیں رہا، جب تک تم مجھے اپنا اعتماد نہ دو۔ کیونکہ اب مجھے اعتماد میں لینے کی تمہاری باری ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں بھلا کہاں لے جا سکتا ہوں؟ تم یہاں سے کہاں جانا چاہتی ہو......اپنے ہوٹل......؟" کہتے ہوئے میں اپنی نظریں سکیڑ کر اس کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔

اس نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی۔ "ایک جگہ ہے، وہاں چلیں گے۔"

اس کی بات سن کر میرے اندر جھماکا ہوا۔ وہ شاید ہماری طرف آنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "کون سی جگہ؟"

"پہلے یہاں سے تو نکلو۔"

"پھر وہی فضول تکرار۔" میں نے بیزاری سے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔

"سنو......" اس نے پھر عقب سے پکارا۔

"میں بتاتی ہوں۔ وہ جگہ ہے [illegible] کے ایک بنگلے میں۔"

پھر اس [illegible]

اور پھر [illegible] اس کے بعد [illegible] میں باقاعدہ طریقے سے آیا تھا۔ [illegible] کی حقیقت [illegible] رہی [illegible] کیونکہ میرے خیال کے مطابق [illegible] ان لوگوں نے [illegible] کے وہ دونوں مذکورہ ساتھی وہاں کیسے ہو سکتے تھے؟ اگر میرا اندازہ [illegible] تو پھر اس کی بات جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

میں اس کے قریب آیا اور کرسی پر [illegible] پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"دیکھو...... یہ باتیں [illegible] سب سے پہلے مجھے اس خونریز واقعے کی حقیقت بتاؤ کہ وہاں ہوا کیا تھا اور اس ڈیل کے دوران کون کون لوگ وہاں موجود تھے؟"

[illegible] نے ایک گہری سانس لی اور بتانے لگی۔

"یہ سچ ہے کہ ہم بھی لوگ وہاں موجود تھے جن کے بارے میں تمہیں پہلے ہی سے علم ہے۔ [illegible] اور لوگ تھے اور وہ [illegible] پر قبضہ کرنے گئے [illegible] تم نے جس نقاب پوش کو ہلاک کیا تھا...... [illegible] کیونکہ جن لوگوں نے [illegible] تھا، وہ بھی اسی کی شکل وصورت اور وضع قطع کے افراد تھے۔ لہٰذا جب میں نے اس کی لاش وہاں دیکھی، جو تمہارے ہاتھوں [illegible] ہلاک ہوا تھا تو [illegible] شدید قسم کے [illegible] میں مبتلا ہوئی کہ جب وہ لوگ [illegible] پر قبضہ کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے تو [illegible] تھا یا کیوں آیا تھا؟ کیا تم اس بارے میں [illegible] کیونکہ یہ سوال میرے لیے [illegible] مسلسل ایک [illegible] ہوا ہے۔" یہ کہنے کے بعد وہ [illegible] منتظر نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

یہ ایک بات تھی کہ خود میں بھی اس معاملے میں [illegible] [illegible]

"پھر [illegible] تم جھوٹ بول [illegible]"

urdunovels.com

بتایا ہے۔

"میں نے جھوٹ نہیں بولا۔" وہ بولی۔ "اسی لیے یہ بات تو مجھے بھی کھٹک رہی ہے۔" اچانک وہ رکی، یوں جیسے اس کے ذہن میں کوئی خیال بجلی کی سی تیزی سے چمکا ہو، بولی۔ "ہاں، ایک بات ذہن میں آئی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہ بھی مجسمے کی تلاش کے ہی سلسلے میں وہاں آئے تھے۔ شاید انہیں کوئی خبر ملی ہو، کیونکہ انہوں نے سجاد بیگ سے ہی مجسمے کے بارے میں پوچھا تھا، جس کا مطلب ہے کہ انہیں بھی پتا چل چکا تھا کہ وہ مجسمہ اسی کے پاس ہے لیکن جب سجاد بیگ نے بتانے سے انکار کیا تو وہ اسے ہی اٹھا کر ساتھ لے گئے۔ باقی لوگ حملے کے دوران وہاں سے جان بچا کر یا ان کا مقابلہ کرتے ہوئے بھاگ گئے تھے۔ اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیا خبر انہی لوگوں نے ہی اپنا ایک ساتھی مخبری کے لیے وہاں چھوڑ دیا ہو کہ جو لوگ وہاں سے جان بچا کر لڑتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے، وہ اسی جگہ پر دوبارہ لوٹیں اور آپس میں مجسمے کے سلسلے میں کوئی گفتگو کریں تو انہیں کچھ اندازہ ہو سکے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ میرا ذہن اس کی باتوں کے تناظر میں پیش آمدہ حالات کا تجزیہ کرنے لگا۔ حالات ایسے تھے کہ مجھے کسی نہ کسی کی بات پر آنکھیں بند کر کے نہ سہی، بھروسا کر کے کوئی قدم تو اٹھانا تھا۔ یوبوزگا کا مجسمہ حاصل کر کے اسے ہمیشہ کے لیے تلف کرنا میری زندگی کا جیسے اب آخری اور اہم ترین مقصد بن چکا تھا۔

یہ وہ منحوس شے تھی جس کے لیے نہ جانے کتنے بہادر انسانوں نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کر دی تھی۔ اب جیسے یہ ذمے داری میرے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ خواہ اب مجھے جان کا ہی کیوں نہ رسک لینا پڑتا، اسے حاصل کرنا تھا۔ اگر یہ مخالف دشمن قوتوں کے ہتھے چڑھ گیا اور بعد میں اس کے تباہ کن اثرات بنی نوع انسان پر پڑے تو ان کے ساتھ میں بھی روزِ حشر مجرموں کی قطار میں موجود ہو سکتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میرا مقصدِ حیات، سوچ اور توجہ کا مرکز صرف اور صرف یہی ایک "کاز" بن چکا تھا کہ مجسمے کو کسی بھی دشمن قوت کے ہاتھ نہ لگنے دوں۔ اب یہ میرا فرضِ اوّلین تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" مجھے خاموش دیکھ کر شاریا چوگی بولی۔ میں نے ہونٹ بھینچے پھر بولا۔

"تم نے اقبال اسکوائر والے بنگلے کا ذکر کیا تھا، وہ تو سجاد بیگ کی ملکیت ہے۔ کیا تم پہلے ہوٹل کے بجائے وہیں

تھیم تھے؟"

"پہلے نہیں، بعد کے صرف ایک دن...... میں، مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ مجسمے اور رقم سے متعلق معاملہ طے کرنے گئے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "بعد میں آخری ڈیلنگ، جب ہم نے رقم سجاد بیگ کے اور سجاد بیگ نے مجسمہ ہمارے حوالے کرنا تھا تو ہم نالا ڈیک والی جگہ آئے تھے۔ یہاں ہماری آخری ڈیل اور ملاقات تھی۔"

"تو کیا وہ رقم بھی ساتھ لے گئے تھے؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہیڈم بی اور ان کے ساتھیوں سے ہے۔"

"ہاں، ان کے بارے میں ہمیں سجاد بیگ نے ہی بتایا تھا۔ اسے انہی لوگوں سے زیادہ خدشہ تھا، جبکہ ایک وسیم نامی آدمی کا بھی ذکر آیا تھا۔ اس سے البتہ سجاد بیگ کو زیادہ خطرہ نہ تھا۔"

"اب تمہارا خیال ہے کہ مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ اقبال اسکوائر (چوک) والے بنگلے میں ہمیں مل سکتے ہیں؟"

"یقین سے نہیں کہہ سکتی، ایک اندازہ ہے۔"

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور شاریا کی بھی یہی حالت تھی۔ ہم نے چند گھنٹے آرام کیا مگر اس سے پہلے میں نے گھر فون کر کے مختصراً اپنی خیریت کی اطلاع دے دی۔ فون فوزیہ نے ہی ریسیو کیا تھا، وہ جاگ رہی تھی اور میری طرف سے خاصی متفکر تھی۔ مجھ سے بات کر کے وہ مطمئن ہو گئی، تاہم اس نے بتایا کہ استاد جیجی اور چنبیلی بھی جاگ رہے تھے۔ اب وہ انہیں میری خیریت سے مطلع کر دے گی تاکہ وہ بھی اب آرام کر لیں۔

بہرکیف، اس کے بعد میں توفیق کے کوارٹر کے ایک کمرے میں آ کر سو گیا، تاہم توفیق سے کہہ دیا کہ وہ مجھے تین چار گھنٹوں بعد جگا دے۔ شاریا چوگی کو اسی کمرے میں رکھا گیا تھا، البتہ ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول کر صرف ایک ٹانگ لوہے کے پائے والی چارپائی سے باندھ کر اسے بھی آرام کرنے کا موقع دیا گیا۔

جب توفیق نے مجھے جگایا تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ آرام کرنے کے بعد میں خود کو کافی چاق و چوبند محسوس کرنے لگا۔ ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد میں شاریا چوگی کو اپنی ہانگ پر لے کر روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

شاریا چوگی کی ہتھکڑی کھول دی گئی اور اب وہ آزاد تھی۔ ٹخنے کا زخم ابھی ہرا تھا۔ وہ ہنوز لنگڑا رہی تھی۔

میں جب اسے لے کر تھانے کے احاطے میں کھڑی اپنی ہانگ کی طرف آیا تو وہ پیچھے مڑ کر عمارت کو دیکھنے لگی، پھر

...رے ایما پر بائیک پر سوار ہوگئی۔ میں نے بائیک کو کک ...رکر اسٹارٹ کیا اور جیسے ہی باہر نکلا اشاریا نے پیچھے سے کہا۔

"تو تم پولیس کے آدمی ہو؟"

"میں ان کے لیے مخبری کرتا ہوں مگر ضرورتاً ان سے ...دی بھی لے لیتا ہوں۔"

"ہمارے ہاں بھی بعض کرپٹ قسم کے پولیس شیرف ...ہوتے ہیں۔" وہ طنزیہ بولی۔

ہم مین روڈ پر آ گئے، بائیک کی رفتار میں نے بڑھا دی ...تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ وہ مجھے کرپٹ افسر بھی سمجھی، مجھے ...میں جتلا نہیں ہوئی تھی۔ تاہم میں نے اس کا شک مزید تھوڑا ...بہت دور کرنے کے لیے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ جب ایک عام پولیس افسر ...کا صرف معمولی سی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا تو بھلا مجھ غریب ...کا کیا ہوگا، جس کی تنخواہ بھی نہیں ہوتی۔ وہ تو صرف ...جاسوسیاں کر کے ہوائی روزی کما لیتا ہے۔"

"مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔" وہ بولی۔ "کہیں تم ...ابھی کسی قسم کی مخبری تو نہیں کر رہے ہو؟"

"مخبری کر رہا ہوتا تو تم اس وقت ملک کے ایک دور ...دراز دیہات کے چھوٹے سے تھانے کے بجائے کسی بڑے ادارے کی قید میں ہوتیں اور تمہارے سامنے پولیس نہیں بلکہ ملکی انجنسی کے وردی پوش اہلکار کھڑے تم سے سخت قسم کی تفتیش کر رہے ہوتے۔"

"ہاں، اسی بات نے تو میرا شبہ دور کر دیا تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں نے طمانیت کی سانس لی۔

"اب تم تیسری بار وہی حرکت مت کرنا۔ پستول میں نے جیکٹ کے اندر اب سامنے کی جیب میں رکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے ہنس کر بات ٹال دی، بولی۔

"اب کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا اس حرکت کا۔ جیتے کے حصول کے لیے ہم مل کر کام کریں گے۔"

"بشرطیکہ تمہارے وہ دونوں ساتھی ہمیں بیچ پر نہ لے جائیں اور میری بات مان لیں۔" میں نے کہا۔

"نہ لے جب بھی ہم انہیں تلاش کر ہی لیں گے۔" وہ بولی۔ "لیکن فکر نہ کرو، وہ بھی اچھی طرح یہ حقیقت سمجھ جائیں گے کہ ہم ایک ہی کشتی کے سوار بن چکے ہیں۔"

"انہیں کنوینس کرنا تمہارا کام ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ظاہر ہے۔"

میں بائیک دوڑاتا رہا۔ صبح کا وقت ہو چلا تھا اور شہر میں اجالا شروع ہوگیا تھا۔ ایک چوراہے سے ہم موڑ کاٹ کر اقبال...

ایک سادہ طبع نوجوان کی کہانی..... جو نامساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا۔

وادی مہران کے ایک دور دراز خطے سے جس کا تعلق تھا.....

ایک پراسرار واقعے نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا

جانگلی

...سوداوتوں کے دہکتے انگارے بھی۔

اسکوائر پہنچے اور وہاں سے سیدھے مطلوبہ بنگلے کا رخ کیا۔ بنگلے پر ویرانی مسلط تھی۔ مجھے یاد تھا، یہاں راشد ہوا کرتا تھا، وہ یہاں کا ملازم تھا اور سجاد بیگ کا خاص آدمی بھی۔ وہاں مجھے کوئی گاڑی بھی کھڑی نظر نہ آئی۔

بائیک میں نے سامنے فٹ پاتھ پر ایک درخت کے نیچے کھڑی کر دی، پھر شاریا کے ساتھ چلتا ہوا بنگلے کے دروازے پر پہنچا لیکن وہاں بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں اور شاریا ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" اس نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے لے کر واپس بائیک کے پاس درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا۔

"اب ان دونوں کو کہاں تلاش کیا جائے؟" بالآخر میں نے شاریا چوئی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ سوچنے لگی پھر گوموں سے انداز میں بولی۔

"میں کیا جانوں، یہ دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں؟"

"ٹھیک ہے، بیٹھو بائیک پر۔" میں نے بائیک سنبھالی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے پھر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میری تیز نظروں نے اس کے چہرے پر الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات تاڑ لیے تھے۔

"کک...... کچھ نہیں...... لیکن اب ہم کہاں چلیں گے؟" اس نے سوال کیا۔

"میرے گھر۔" میں نے کہا۔

"تمہارے گھر...... لیکن کیوں؟"

"کیوں کا کیا سوال ہے؟" میں نے اسے گھورا۔ "تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے، ہم مل کر جیسے کو تلاش کریں گے اور تمہارے دونوں ساتھیوں کو بھی۔ وہیں آرام سے بیٹھ کر اس بارے میں کچھ پلان کریں گے۔"

"ہم...... ٹھیک ہے، لیکن پہلے میں ہوٹل جانا چاہوں گی۔ وہاں میرا ضروری سامان پڑا ہوگا۔" اس نے کہا۔

"لیکن مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ تو ہوٹل چھوڑ چکے ہیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "اور یقیناً وہ تمہارا سامان بھی ساتھ ہی لے گئے ہوں گے، کیونکہ ان کے خیال میں تو اب تم مر چکی ہو، بھلا پھر وہ تمہارا سامان کیوں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑیں گے؟" میں نے اسے گھیرا۔ مجھے کچھ جھوٹ کی بو آنے لگی تھی۔

وہ الجھ گئی، بولی۔ "دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، کیا خبر انہیں ہوٹل پہنچنے کا موقع ہی نہ مل سکا ہو۔"

میرے ذہن میں جھما کا ہوا، کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ شاریا یقیناً مسلسل مجھے کسی دھوکے میں رکھنے کی کوشش میں تھی لیکن اسے موقع نہیں مل پا رہا تھا۔ میں نے بھی گویا جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ کندھے اچکا کر بولا۔

"چلو، ٹھیک ہے، یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ آؤ، بیٹھو بائیک پر۔"

وہ کسمساتی ہوئی جیسے چار و ناچار بائیک پر بیٹھ گئی۔ میں اب اس کی طرف سے چوکنا ہو گیا تھا۔ میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا، اگر اس نے پھر تیسری بار مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں اس سے دوسرے طریقے سے نمٹوں گا۔

ہم ہوٹل النور پہنچ گئے۔ پارکنگ ایریا میں کاروں کے علاوہ ایک جانب بائیک کھڑی کرنے کی بھی پارکنگ تھی۔ وہ اتری، پھر میں نے بائیک کو سائڈ اسٹینڈ پر لگایا تو وہ بولی۔

"تم ادھر ہی رکو، پہلے میں اندر جا کر کنفرم کرتی ہوں۔"

"نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں مصر رہا۔

وہ ہونٹ چبانے لگی، پھر بولی۔ "اچھا ٹھیک ہے، آؤ۔" ہم دونوں ساتھ ہو لیے۔ میں نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر اس نے منع کر دیا۔ وہ لنگڑا کر چلنے لگی۔ میں محتاط ہو گیا۔

ہوٹل میں داخل ہوتے سے میرا دل کچھ بے چینی کا شکار ہونے لگا۔ شاریا چوئی ہنوز میرے لیے پراسرار بنی ہوئی تھی۔ میں ریسیپشن تک اس کے ہمراہ بڑھتے ہوئے اس فون کے بارے میں سوچنے لگا جو اس نے میرے ایما پر ہوٹل والوں کو کیا تھا اور بقول شاریا چوئی کے، انہوں نے اسے یہ اطلاع دی تھی کہ مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ ہوٹل چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

اگرچہ فون نمبر میں نے ہی ملا کر دیا تھا تاہم بات شاریا چوئی نے کی تھی۔ یہ اس کا کہنا تھا مگر کیا وہ سچ تھا؟ یعنی کیا ریسیپشن سے اسے یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ دونوں مذکورہ افراد جا چکے ہیں یا پھر شاریا نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟

ریسیپشن پر آ کر اس نے ڈیسک گرل سے کچھ کہنے کے بجائے اپنے روم کی چابی لی اور زینے کی طرف لنگڑاتے ہوئے بڑھنے لگی۔ میں نے دیکھا، ریسیپشنسٹ اسے عجیب سی نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ میرے سینے میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔

چابی لینے کا ایک مطلب تھا کہ کمرا ابھی تک ان کے حوالے تھا۔ شاریا چوئی کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کے

urdunovels.com

دونوں ساتھی ہوٹل چھوڑ کر کہیں اور نکل گئے ہیں۔

مجھے بے حد غصہ آیا۔ وہ مسلسل مجھے فریب میں رکھے ہوئے تھی۔ زینے کے بعد مطلوبہ فلور پر آتے ہی میں نے تڑاخ سے کہا۔

"تم مجھے مسلسل فریب دیے جا رہی ہو۔"

اس نے کوئی پروا نہ کی اور اسی طرح بے نیازانہ انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے بولی۔ "تم نے بھی مجھے کب اپنا اعتماد دیا ہے؟"

"اب تک بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ اس وقت کیا کمرے میں مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ موجود ہیں؟" میں پرتشویش لہجے میں بولا تو وہ ایک دم رک گئی، پھر میری جانب گھور کر دیکھتے ہوئے وہ بھی زخمی ناگن کی طرح پھنکار کر بولی۔

"میں تمہاری غلام نہیں ہوں، ذرا تمیز سے بات کرو، اب میں تمہارے قبضے میں نہیں ہوں۔ شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر سکتی ہوں، پولیس بھی بلوا سکتی ہوں۔ ہم قانونی طریقے سے اس ملک میں داخل ہوئے ہیں۔ سمجھے تم؟"

میں اس کی چالاکی سمجھ گیا۔ بے بسی سے ہونٹ بھینچے اور ایک گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کیا اور کہا۔

"کیا چاہتی ہو، میں لوٹ جاؤں؟" یہ میرا نفسیاتی وار تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ اس کی مترنم ہنسی کی صورت میں برآمد ہوا، بولی۔

"بس، معاہدہ ختم...... اتنی ہی ہمت تھی؟"

"مجھے تمہاری سمجھ نہیں آ رہی۔" میں بھی ہنس دیا۔ مصلحت یہی تھی، اس کے ساتھ دوستانہ رویہ روا رکھا جائے۔

وہ چل دی اور ساتھ ہی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کمرے میں چلو، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔"

ناچار میں اس کے ساتھ چلتا ہوا ایک روم کے دروازے کے سامنے جا پہنچا۔ اس نے چابی گھمائی اور دروازہ کھولا۔ پہلے خود داخل ہوئی اس کے بعد میں۔

اندر کوئی نہ تھا لیکن کمرے کی حالت سے صاف لگتا تھا کہ یہ ابھی تک خالی نہیں کیا گیا۔ یعنی مسٹر ڈورل اور چنگ ہنگ ابھی تک یہاں رہائش پذیر تھے۔

"کہاں گئے دونوں؟" میں نے پوچھا۔ وہ بھی کمرا خالی دیکھ کر کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔

"بیٹھ جاؤ، میں ان سے رابطہ کرتی ہوں۔" میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بیڈ کے نیچے جھکی اور ایک چار بائی چھ انچ کا باکس نکال لیا، پھر اسے لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے باکس کھولا، اس کے اندر سے کوئی وائرلیس قسم کی شے نکالی۔

وہ وائرلیس کا سیٹ گود میں لے کر اس کی کوئی فریکوئنسی سیٹ کرنے لگی۔ اس کے بعد ایک بٹن پش کر کے چھوٹا سا مائیک اپنے منہ کے قریب کر لیا۔ کمرے میں ہلکی بھنبھناہٹ کی آواز ابھری اور پھر بند ہو گئی۔ اب وہ کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

جلد ہی دوسری جانب سے بھاری مردانہ آواز میں کوڈ دہرایا گیا۔ اس آواز کے بعد شاریا چولی بولی۔

"مسٹر ڈورل! میں شاریا بول رہی ہوں...... یقیناً تمہیں مجھے زندہ دیکھ کر حیرانی ہوئی ہوگی۔ افسوس، تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا...... لیکن کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرا ساتھی چنگ ہنگ زندہ ہے یا اسے بھی تم لوگوں نے ہلاک کر دیا ہے؟ اوور۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ شاریا چولی سمیت یہ "تیسری پارٹی" میرے لیے ایک معما ہی بن گئی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ دوسری جانب سے وہی بھاری آواز یعنی ڈورل کی قہقہہ لگاتی طنزیہ آواز ابھری جس میں فاتحانہ جھلک بھی تھی۔

"نئی زندگی مبارک ہو لیکن چنگ ہنگ کو بھول جاؤ۔ جس طرح میں تم لوگوں کو بھول گیا ہوں۔ ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم زندہ کیسے بچ گئیں؟ اوور۔"

"تم نے غداری کر کے اچھا نہیں کیا ڈورل! ہمارا تمہارا ساتھ نیا نہیں تھا۔" شاریا چولی بولی تو اس کے لہجے میں نفرت و انتقام کی چنگاریاں بھی تھیں، اس میں تاسف بھی پایا جاتا تھا، آگے بولی۔ "اب بھی تم نے جن لوگوں کی خاطر راج میں آ کر ہم سے غداری کی ہے، وہ بھی تمہیں کتنا حصہ دے دیں گے؟ کچھ زیادہ، مگر کیا تمہیں ان پر بھروسا ہے؟ اوور۔"

"بے بی! اب تمہارا نوچنے کے سوا...... اوہ...... نہیں......"

"آہ......" اچانک دوسری جانب سے ڈورل کی کراہتی آواز ابھری۔ شاریا چولی چونک گئی اور مسلسل "ڈورل...... ڈورل...... اوور......" کہتی رہی، وہ دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن دوبارہ اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں سے انگارے سے برستے محسوس ہوئے۔

"کیا ہوا؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دوبارہ ایک بٹن دبا کر وائرلیس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

"لگتا ہے شاہ چنگ ہنگ کو اسی کمینے ڈورل نے ہلاک

کر دیا ہے لیکن خود بھی ان کے دھوکے میں آ کر مارا گیا، ڈویل!"

اس نے شاید دوسری بار چنگ ہنگ سے رابطہ کیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس نے سب سے پہلے ڈورول کے بجائے چنگ ہنگ سے ہی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، ناکامی کی صورت میں ہی اس نے ڈورل سے رابطہ کیا تھا۔

وہ دانت پیس کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولی۔

"مجھے اور چنگ ہنگ کو پہلے ہی شبہ تھا کہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ مجھے بہت پریشان اور الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں تو کافی حد تک معاملہ سمجھ رہا تھا۔ شاکی ہو کر بولا۔

"کیا تمہارے ساتھی ڈورل نے کوئی غداری کی تھی؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔ "ہاں۔"

"ناممکن سی بات لگتی ہے۔" میں نے کندھے اچکا کر کہا۔ "تم ہانگ کانگ کی پارٹی اور یہ لوگ یہاں، اصل پارٹی...... یعنی جمی وغیرہ، انڈین...... سجاد بیگ پاکستانی...... یہ بات حلق سے نہیں اترتی۔"

"ڈورل بھی ہمارا ساتھی نہیں رہا۔ یہ بہرحال ایک لمبی کہانی ہے۔ اسے چھوڑو، مجھے تو چنگ ہنگ کی فکر ستا رہی ہے۔ مجھے لگتا ایسا ہی ہے کہ وہ لوگ مجسمہ لے کر نکلنے کی کوشش میں ہیں۔" پھر لمحہ بھر کو متوقف ہو کر بولی۔

"ٹھہرو...... میں ذرا فریکوئنسی کی لوکیشن چیک کر لوں۔" کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر اسی ڈیوائس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہی، اس کے بعد اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

"وہ لوگ جموں کے بارڈر کے قریب کسی دیہاتی مضافات میں مقیم ہیں۔ ہمیں فوراً ان کے تعاقب میں نکلنا ہوگا، اسی وقت۔"

اس کی بات سنتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، بولا۔ "تمہارا مطلب ہے جمی اور اس کے ساتھی پومورگا کا مجسمہ...... اوہ...... اگر یہ سچ ہے تو بہت برا ہوا۔" مجھے تشویش ہو گئی۔ "اگر ان لوگوں نے جموں کا بارڈر کراس کر لیا تو ہمارے لیے دوبارہ ان پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں لوکیشن ٹریس کر چکی ہوں، تمہارے پاس گاڑی ہے؟" شاریا چوئی نے پوچھا۔

"گاڑی ہے لیکن گھر پر ہے۔" میں نے کہا۔

"گھر سے گاڑی لینے کا وقت بالکل نہیں ہے، تمہاری بائیک کام آ جائے گی اور جن راستوں پر ہم نے جانا ہے، وہاں بائیک ہی زیادہ بہتر رہے گی۔"

میں نے غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی، لیکن اس خطرناک مہم پر نکلنے سے پہلے میں کم از کم استاد جوجی کو مطلع کر دینا ضروری سمجھتا تھا کہ بعد میں موقع ملے نہ ملے اور وہ سب بالخصوص نوزیہ میری طرف سے پریشانی اور فکر میں مبتلا رہیں۔

"میں نکلنے سے پہلے اپنی بیوی کو فون پر مطلع کرنا چاہوں گا۔" میں نے شاریا سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں جب تک اپنی ضروری تیاری کرتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ تلملاتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ میں سوچتا ہوا ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا مگر یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں ایکسٹینشن پر ہوٹل کا کوئی آدمی میری گفتگو کا کوئی اور مطلب نہ لے، مگر مجبوری تھی، سوچا اشاروں کنایوں میں ہی بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اردو کا سہارا میں نہیں لینا چاہتا تھا کیونکہ میرے تجربے میں یہ بات تھی کہ مغربی کم ایشیائی تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی سی اردو سے واقف ہوتے ہی تھے، اسی لیے میں نے جب جوجی کے گھر کا نمبر ملایا اور دوسری جانب سے چنبیلی نے ریسیور اٹھایا تو میں نے اس سے ٹھیٹ پنجابی میں ہی جوجی کے بارے میں پوچھا۔

وہ مجھے اس قدر ٹھیٹ پنجابی بولتا سن کر پہلے تو ہنسی، اس کے بعد کوئی مزاحیہ جملہ کہنے ہی والی تھی کہ میں غرا کر بولا۔

"اس وقت ایمرجنسی ہے، جوجی کو فون دو جلدی۔"

چنبیلی بیچاری ڈر گئی اور اس نے فوراً ہاتھ میں ریسیور پکڑے پکڑے ہی جوجی کو آواز دے ڈالی، پھر تھوڑی دیر بعد جوجی کی دوسری جانب سے جیسے ہی "آئی شاوشے" ابھری، میں نے بلا تکان بولنا شروع کر دیا اور کافی حد تک اشاروں کنایوں میں اسے موجودہ صورت حال کی نزاکت کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

"اوہ...... تو اس کا مطلب ہے زبیر اور راحیلہ نے گڑھ مولا سے اس شام واپسی پر درست خبر دی تھی۔" جوجی سب سننے کے بعد بولا تو میں بری طرح چونک گیا کیونکہ مجھے یاد تھا کہ سجاد بیگ وغیرہ کی تلاش میں جب میں گھر سے نکلا تھا تو اس سے پہلے میں زبیر اور راحیلہ کو گڑھ مولا روانہ کر چکا تھا جو بھانڈیل سائیں کی ریکی کر کے ہمیں مطلع کرنے والے تھے۔

"کیسی خبر، جوجی؟ جلدی بولو، میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے دھڑکتے دل سے کہا تو جوجی عجیب لہجے میں بولا۔

"وقت تو شاید اب کسی کے پاس بھی نہیں رہا سمراب!"

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

urdunovels.com

"۰۰ آئی شاد شے...! اسٹا جاب۔" اس نے کہا۔
اس کے بعد جوجی نے مجھے جو کچھ بتایا، اسے سن کر میں
...ے میں آ گیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا۔
تھوڑی دیر قبل میں نے راحیلہ اور
...ابھی روانگی سے بھانڈیل سائیں کی ریکی وغیرہ کے
...کو گروہ مولا کی طرف... مجھے اس پر کامل شبہ تھا کہ وسیم کی غداری
...پھیلا تھا۔ کیونکہ... دھوکا دہی کے بعد بھانڈیل سائیں جو
...اپنی پچھی وغیرہ سے... خود بھی تنہا مجسمے کی بھاری قیمت لگانے
...اندرون خانہ... جستجو میں تھا۔ اس کے روابط بلیک کیٹس اور
...وں کی طرح کسی تیسری پارٹی سے ہو سکتے تھے۔
...ڈ فاکس یا پھر... زبیر نے بھی پتا چلا یا تھا۔ جب وہ اس کی
راحیلہ اور زبیر... اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھے تو
...لی کے آس پاس موجود...
...یلی میں دو نامعلوم افراد کو حویلی میں داخل ہوتے دیکھ
...ک جیپ میں...
...ر زبیر اور راحیلہ بھی نقب لگا کر اندر داخل ہو گئے۔
دونوں ہی ان (راحیلہ اور زبیر) کے لیے غیر شناسا
تھے۔ بعد میں گفتگو کے دوران ان دونوں کے نام الیاس
اور جابر معلوم ہوئے۔ مزید یہ بھی کہ وہ دونوں ہی بھانڈیل
سائیں کے آدمی تھے، جنہیں اس نے وسیم اور سجاد بیگ کے
پیچھے لگا رکھا تھا۔ اب وہ دونوں اسے یہ اطلاع دینے کے
لیے آئے تھے کہ مجسمہ سجاد بیگ کے ہاتھ لگ چکا ہے اور وہ
عنقریب صادق آباد کے دو چودھری بھائیوں جو "چودھری
برادران" کے نام سے مشہور ہیں، کی مدد سے کسی غیر ملکی
پارٹی سے مجسمے کی فروخت کے لیے خفیہ ڈیل کرنے والا
ہے۔ یہ میٹنگ ان کی تالا ڈیک والے ایک دور دراز
ٹھکانے پر ہونے والی ہے جو چودھری برادران ہی کی
ملکیت ہے۔
اس اطلاع پر بھانڈیل سائیں جو کہ صاحب فراش
حالت میں تھا، اس کی پروا کیے بغیر اپنے دو مسلح ساتھیوں
الیاس اور جابر کے ساتھ بڑی سی گاڑی میں اسی وقت روانہ
ہو گیا۔ رات بہت ہو چلی تھی، زبیر اور راحیلہ نے بھی سوچا
کہ گھر چلا جائے اور جوجی یا مجھے اس اہم واقعے کی فوری
رپورٹ دیں تاکہ جو کچھ کرنا ہو، جلد کیا جائے لیکن جوجی
میری آمد کا منتظر تھا اور جب میں نے باقی کا حال سنایا تو اس
نے بھی وہی اپنا کامل شبہ مجھ پر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ
بالآخر میڈم جمی اور اس کے کنگ پوش (گر بھدواس وغیرہ) نے
بالا مار لیا ہے۔ یہ خونریزی انہی لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہوگی
جس کے بارے میں، میں نے اشاروں کنایوں میں جوجی کو
مطلع کیا تھا۔ لہٰذا جب میں نے شار پاچوڑی کی بھی بات سے
اسے آگاہ کیا تو ان سارے شبہات کی تصدیق بھی ہو گئی۔
چنانچہ اب میرا میڈم جمی وغیرہ کے تعاقب میں نکلنے
سے پہلے گھر کا ایک چکر لگانا از بس ضروری ہو گیا تھا۔
یہاں شار پاچوڑی نے... کا جو اندازہ لگایا تھا وہ
رنگ... کے اطراف کا...
سوال اور اس کے... تھا۔
شار پاچوڑی... سامان سمیٹ کر ایک
کٹ... تھی۔... لیکن میں نے
اسے ابھی... روانگی کے... آرام
میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی ہے۔
تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بائیک پر سوار تھے۔
آندھی طوفان کی طرح... بائیک اڑاتا ہوا... گھر پہنچا تو
شار پاچوڑی... وہ مجھ سے سوال کرتی رہی لیکن میں اسے بازو
سے دبوچ کر گھر کے اندر لے آیا۔
شار پاچوڑی اب میرے لیے بیکار ہو چکی تھی۔ میں
نے اسے عارف اور پہروچ کے حوالے کر دیا اور ہدایت دی
کہ اسے تہ خانے میں ڈال دو۔ فوراً اسے کڑی نگرانی میں رکھا
جائے جب تک انسپکٹر شیراز یہاں تک نہ پہنچ جائے اور اسے اس
کے حوالے کر دیا جائے۔
انسپکٹر شیراز کو مطلع کرنے کی ذمے داری میں نے
چیلی کو دے دی۔ شار پاچوڑی چیخ چلاتی رہی اور مجھے
خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دیتی رہی مگر میں نے اس
کی... عارف اور پہروچ نے اس کی... کی پروا کیے بغیر
اسے دبوچ کر تہ خانے میں لے گئے۔
"سلیم کی طبیعت اب کیسی ہے، وہ ٹھیک تو ہے نا؟"
اچانک میں نے اس کی کمی کو محسوس کرتے اس کی خیریت
چاہی کیونکہ گھت اور کبیر دونوں... تھے۔ سلیم
بھی اسی روز والے واقعے کے بعد... بستر پر تھا۔
... ایک بھری آواز سنائی
دی۔ "میں ادھر ہوں۔" ہم سب نے چونک کر دیکھا۔ جو کراہتے آرام کے
لیے دے رکھا تھا، وہ اسی کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔
ہم سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سر سے پاؤں
تک اسے تکتے چلے گئے۔
سلیم بھائی شاید اندر خاموش بیٹھا سب کچھ سن چکا تھا
... اس کے جسم
پہ چست جینز شرٹ تھی... کے لیے ذہن
... جس کے جلو میں مجھ سے
... آنکھیں اختیار ضرور
سونے...

چھپے ہوئے تھے۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔

"یہ...... کہاں کی تیاری ہے؟" میں نے حیران نظروں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"جس طرح بوبورگا کے مجسمے کا حصول تمہاری زندگی کا مقصد بن چکا ہے، اسی طرح اب وہ میرا بھی ایک اہم مشن بن گیا ہے۔" سلیم چھمالیا نے گویا ایک عزم صمیم سے کہا۔ "یاد کرو سہراب! جب تم نے میرے ضمیر کو جگاتے ہوئے یہ سب کہا تھا کہ وہ منحوس مجسمہ صرف ایک پتھر نہیں بلکہ بے گناہ اور معصوم لوگوں سمیت پوری مسلم اُمّہ کے لیے ایک خطرناک زہر قاتل ہے، جسے بیرونی دشمن حاصل کر کے پھر بم یا اور بنانا چاہتے ہیں، تب سے میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ اس مشن میں اب میں تمہارا سایہ بن کر رہوں گا۔"

وہ ایک جذبے سے کہتا چلا گیا۔ اس کی گمبھیر آواز گونج رہی تھی۔ جوجی، میں، راحیلہ اور زبیر ایک ٹک اسے تکے جا رہے تھے۔

"لیکن...... تمہاری حالت......!"

"میری حالت کو کچھ نہیں ہوا۔" اس نے یکدم میری بات کاٹ دی۔ "میں سب سن چکا ہوں۔ بدقسمتی سے وہ مجسمہ دوبارہ بگھی جیسی شیطان عورت کے ہاتھ لگ چکا ہے اور وہ انڈین بارڈر کے قریب پہنچنے کے لیے اپنے خطرناک ساتھیوں کے ایک گروہ سمیت روانہ ہو چکی ہے اور کئی پارٹیاں ان کے تعاقب میں ہیں۔"

میں نے دیکھا، سلیم کے چہرے، لہجے اور آنکھوں سے عزم کے علاوہ کچھ اور بھی جھلک رہا تھا۔ اس شے کو میری اندر کی آنکھ ہی محسوس کر رہی تھی مگر کوئی عنوان دینے سے قاصر تھی۔ بس، ایسا ہی لگا جیسے اس کے عزم کے پردے میں ایک اور جذبہ بھی چھپا ہو۔ وہ جذبہ تھا یا پھر کوئی احساس...... ایسا احساس جو سر سے کفن باندھنے پر مجبور کر دیتا ہے یا پھر کچھ اور...... یہی "کچھ اور" مجھے اندر سے کھٹک رہا تھا۔

حقیقت یہی تھی کہ سلیم ماضی سے ہی میرے لیے مشکل شخصیت رہا تھا۔ اس کے مثبت پہلو چند ایک ہی میرے سامنے آئے تھے، وہ بھی شاید راحیلہ کو حاصل کرنے کے لالچ میں ہو لیکن اس کا خمیر فطرت سے جرم کی طرف مائل ہوا تھا۔ فطرت تو میں نے بھی وہی پائی تھی، میں بھی غیر دانستہ سہی، جرم کی طرف مائل ہوا تھا لیکن میں نے اپنے ضمیر کو مرنے نہیں دیا تھا اور اسی نے مجھے سنبھال بھی لیا تھا لیکن راجو بدری، ماجد عرف ماجا اور سلیم عرف چھمالیا نے اپنی مجرمانہ روش کبھی نہیں بدلی تھی۔ ماجد اور راجو تو اپنے جرائم کی پاداش میں دنیا سے کب کے رخصت ہو چکے تھے، چھمالیا نے یاروں میں ایک سلیم بچا تھا، مگر میں نے کبھی اسے سیدھی راہ پہ گامزن ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں، اب کے حالات کچھ یوں ہو گئے تھے کہ وہ مجبوراً سہی، تائب ضرور ہو چکا تھا، مگر اس میں بھی اس کی کوئی غرض پنہاں تھی، پھر جب اس کا تازہ ترین کارنامہ جو اس نے ان تینوں خطرناک ایجنٹوں کی موجودگی میں انجام دیا تھا، وہ بھی ناقابل فراموش ہی تھا۔ کیا پھر یہ بھی اس نے مجھے یا راحیلہ کو متاثر کرنے کے لیے کیا ہو؟ محبت تو بڑے بڑے کارناموں پر اکساتی ہی رہتی ہے۔

میرے اندر کی کھٹک شاید اس کی کسی ایسی ہی متوقع یا غیر متوقع دھوکا دہی پر بھی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی تک میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ بوبورگا کا مجسمہ نہایت قیمتی تھا۔ وہ جس کے قبضے میں جاتا، وہ دنیا کا دولت مند انسان ہی کہلائے جانے کا مستحق بنتا۔ حرام، حلال کا تصور کیے بغیر، نسلوں تک ایسے انسان کی زندگی آرام و عیش کا ضامن بن سکتی تھی اور سلیم کے جرم کی دنیا میں قدم رکھنے اور طویل عرصے تک اسی راہ پر چلنے کا اب تک یہی تو مقصد رہا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ میری نصیحتیں، میرے سلوک سے تائب ہونے کی کوشش کر رہا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک وجہ اس کی راحیلہ بھی ہو، کیونکہ وہ بہرحال راحیلہ کو پسند کرتا تھا جس کا اظہار وہ شاید راحیلہ اور یقینی طور پر مجھ سے بھی کر چکا تھا۔

بہرکیف، یہ سب سوچتے ہوئے نہ جانے کیا ہوا، جیسے اس "نامعلوم" سے احساس نے مجھے خود بخود جگایا تو میری نظریں بے اختیار سب کے ساتھ وہاں موجود کھڑی راحیلہ پر جا ٹکیں اور میرے "اندر" کو کچھ لگا کہ اس کے چہرے اور آنکھوں سے بھی اسی "نامعلوم" سے احساس کا پرتو ہلکورے لے رہا ہے۔ حیرت کی بات تھی کہ مجھے پھر بھی کچھ اندازہ نہ ہو سکا، یہ کیا تھا؟ راحیلہ جن معنی خیز نگاہوں اور ہونٹوں پر رقصاں موہوم سی مسکراہٹ تلے اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی میرے لیے ایک "پہیلی" ہی تھی۔ نہ جانے اب راحیلہ کا کیا "معاملہ" تھا، میں اس کا تصور نہ کر پایا۔

"آئی شاو شے۔" معاً ہی استاد جوجی بھی اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "یہ مہم ہی اتنی خاص اور فیصلہ کن ہے کہ خود میں نے بھی سہراب کی تنہا اس خطرناک مشن پر جانے کی ضد ٹال دی۔ شاید سہراب کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ کم از کم اس حساس اور نازک ترین معاملے میں کسی قسم کا رسک نہ لے۔" اتنا کہہ کر جوجی نے چند ثانیے کے لیے توقف کیا پھر

urdunovels.com

... میں ... تیاری باندھ لو، ہم
صرف ...
... یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

☆☆☆

... چلی تھی، فضا میں جاتی سردیوں کی خوشگوار
... پھر ہو چلی تھی۔ سنہری دھوپ کی کرنیں کھیتوں اور
... رچی ہوئی تھی۔ ... گزرتی جموں روڈ پر الوداعی بوسے
... کے درمیان سے ...
... رہی تھیں۔
... پاکستان کی حدود میں بھی جموں روڈ آگے
... ہے، پاکستان میں سیالکوٹ روڈ کہلاتی ہے۔ ہم پانچوں اس
... کے بارڈر پار سیالکوٹ ... ایک سرحدی دیہات سے تقریباً تین چار کلومیٹر دوری
... ایک چھوٹی سی بہتی نہر کنارے "مختصر مدتی" پڑاؤ ڈالے
ہوئے تھے۔

ہم دانستہ ایک دیہاتی آبادی کو پیچھے چھوڑ آئے تھے
اور اب ایک نیم جنگلاتی علاقے میں سڑک کنارے فروکش
ہوگئے۔ بلکہ فروکش کیا ہوئے، بس ذرا کار سے نیچے اتر کر
اور تھوڑا چل پھر کر جسم کو وارم اپ کرنے لگے۔
اس کے بعد چھوٹے بچے ... کی صورت ساتھ آن
کھڑے ہوئے۔ جوجی کے تنومند جسم پر چست پینٹ تھی اور
بیک کٹ میں اس کا من چاہا دستی ہتھیار "نن چکو" تھا اور دیگر
اسی قسم کے ہتھیار تھے۔ ایک بھرا ہوا پستول بھی اس نے
لباس کے اندر چھپا رکھا تھا، بعین اسی تیاری کے ساتھ ہم
چاروں بھی تھے۔

یہاں بھی ایک نامعلوم سے احساس تلے مجھے لگا کہ
سلیم، راحیلہ سے کھنچا کھنچا ہی نظر آیا، حالانکہ اس سے پہلے
ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب ہم اکٹھے ہوتے تو سلیم اور راحیلہ
پاس ہی نظر آتے، بلکہ ماضی میں تو کئی بار راحیلہ مجھ سے کسی
بات پر ناراض ہو کر سلیم ہی کی طرف کا رخ کرتی اور سلیم خواہ
کتنا بھی برا سہی، لیکن وہ اس اصل حقیقت کو جانتا تھا کہ میں
راحیلہ کو اپنی سگی بہن ہی سمجھتا ہوں، اسی لیے اس نے کبھی
اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ کی تھی۔
لیکن اب میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور دور
ہی دیکھ رہا تھا۔ کیا یہی وہ نامعلوم سا احساس تھا جو مجھے بے
چین کیے ہوئے تھا؟ میں سر دست اس کی کوئی توجیہہ نہ
پا سکا، گر ان کے بیچ کچھ "طے شدہ" تھا تو پھر یہ دوری کیسی؟
جوجی نے ایک کاغذی نقشہ زبیر کو کسی اخبار کی طرح
تھمایا ہوا تھا اور ہم تینوں اس پر جھکے ہوئے تھے۔ سلیم اور
راحیلہ گرد و پیش پر نظریں دوڑائے الگ الگ چہل قدمی میں
مصروف تھے۔

"میرا اندازہ درست نکلا۔" معاً ہی زبیر نے جوش
بھری آواز میں کہا اور میں نے دیکھا راحیلہ فوراً اس کی
آواز کی جانب متوجہ ہوئی اور اس کے قریب آن کھڑی
ہوئی۔ سلیم جو پاس کے گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف
منہ کیے سگریٹ سلگائے ہوئے تھا، گردن موڑ کر زبیر اور
راحیلہ کی طرف عجیب سی نظروں سے تکنے لگا۔
یکایک میرے اندر پھر وہی نامعلوم سا احساس
جاگنے لگا، جسے میں ابھی تک کوئی نام دینے سے قاصر تھا ... اس
کی کوئی توجیہہ میرے ذہن میں آ سکی تھی، لیکن اب بھی مجھے
ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سلیم کی شخصیت ... پراسرار
ہونے لگی ہو۔
"ہم پونچھ ... اور ... کے درمیان موجود ہیں۔"
زبیر کی جوش بھری آواز دوبارہ سنائی دی۔
"اس کا مطلب ہے ہم انڈین بارڈر سے صرف آٹھ
دس کلومیٹر دوری پر ہیں۔" جوجی نے بھی لقمہ دیا، پھر میری
جانب دیکھا۔ "آئی ... شہزادے ... تو ادھر کن
سوچوں میں گم ہو؟"
میں چونکا اور ان کی طرف بڑھ گیا، پھر میں نے بھی
اس نقشے پر سر جھکایا۔
"ہم ... ہم ... کے تو قریب ہیں لیکن ... تو
ابھی تک ہم سے نہیں ٹکرایا؟" میں نے کہا۔
"وہ ہم سے نہیں، ہم نے ان سے ٹکرانا ہے۔" معاً
سلیم کی دور سے آواز آئی۔ ہم اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ
سگریٹ کا آخری کش لے کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا
ہمارے قریب آ گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جم
گئیں۔ ایسے ہی وقت میں راحیلہ اور سلیم کی نظریں ملیں اور
... گئیں۔
سلیم نے اخبار ... نگاہیں جما لیں۔
"ایسا تو نہیں وہ سرحد پار کر گئے ہوں؟" راحیلہ
کے لہجے میں تشویش تھی۔
"اتنی جلدی یہاں کے لیے ممکن نہیں۔" جوجی بولا۔
"تمہیں اس بات کا کیسے یقین ہے؟" میں نے
منتظرانہ نظروں سے جوجی کی طرف دیکھا۔
"استاد کی بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔" زبیر نقشہ رول
کرتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ ان کے پاس کوئی معمولی شے
نہیں، یہ ... کا بجٹ ہے، پھر وہ لوگ تھوڑی تعداد میں نہیں
ہوں گے، کم از کم آٹھ دس تو ہوں گے ہی۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے کندھے
اچکائے۔ "ہم نے سیالکوٹ سے آتے ہوئے راستے میں آنے

دشمن گروپ بھی ہو سکتا ہے۔ شاریا چولی کے ... ے گا۔ وہ انہیں اس کے بارے میں بتا چکا تھا۔ ... ساتھی بھی۔

"تب پھر ہم دونوں چلتے ہیں۔" سلیم یکدم بولا۔

"تم تینوں سامنے آئے بغیر ہمیں کور کرو گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا اور ان کا جواب سنے بغیر میں دوبارہ ... اٹھ آیا۔ زبیر میرے ساتھ تھا، ہم دونوں اسی سمت بڑھ گئے جدھر سلیم کے مطابق کوئی غیر ملکی شکاری ٹیم موجود تھی۔

وہاں گھاس کے مختصر سے قطعے پر ایک خیمہ نظر آیا۔ الاؤ بجھا دیا گیا تھا اور اس پر دو تین خرگوشوں کے سرخ سرخ بالم پچھور بھون کر ایک طرف رکھے تھے۔ وہ تعداد میں چار افراد تھے، ایک کی جسامت بھینسے جیسی تھی، دوسرا لمبا اور چھریرا تھا، باقی دو درمیانے قدوقامت کے نظر آئے۔ ان کے قریب شکاری بندوقیں پڑی تھیں۔ میں قریب چلا گیا، زبیر ساتھ رہا۔ کچھ ہلکی روشنی تھی، وہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ مجھے اور زبیر کو آتا دیکھ کر وہ ہماری طرف دیکھنے لگے۔

میں ایک ہی نگاہ میں بغور ان چاروں کی صورتیں دیکھ چکا تھا۔ تین گورے محسوس ہوئے جبکہ چوتھا جو چھریری جسامت کا تھا، وہ مجھے وسط ایشیائی لگا، جیسا کہ شاریا چولی تھی۔ گورے امریکی ہوں یا دوسرے ملک کے، ایک جیسے ہی محسوس ہوتے ہیں لیکن ہانگ کانگ، چینی یا اسی طرح کے فلپائنی اور کورین الگ وضع قطع کے حامل ہوتے ہیں۔ ان چاروں نے خاکی چست پینٹس اور پیروں میں لانگ بوٹ چڑھا رکھے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے ان سے ہائے ہیلو کرنے کے بعد سیدھا سجاؤ اسی مذکورہ آدمی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے پوچھ لیا۔

"تم چینگ ہنگ ہو؟"

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی جیب سے پستول نکال لیا، حالانکہ شکاری گنیں ان کے قریب موجود تھیں۔ پستول نکال لینا اس بات کی تصدیق تھی کہ میرا اپنے مطلوبہ آدمی کو پہچان لینا غلط نہ تھا۔ گویا اس کی ساتھی شاریا چولی نے جو اس کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ غدار ساتھی مسٹر ڈورل کے ہاتھوں مر چکا ہے، غلط تھا۔ کسی طرح یہ بچ گیا ہوگا۔ جب شاریا چولی سے فلپ اسپیر گفتگو کی بات کرتے ہوئے ان کا غدار ساتھی ڈورل اس سے گفتگو کر رہا تھا اور اسی دوران وہ بھی اپنی غداری کا انجام بھگت بیٹھا تھا۔

"کون ہو تم لوگ، کس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟" وہ غرایا۔ اس کا لہجہ بھی وسط ایشیائی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

میں اطمینان سے مسکرایا اور بولا۔ "ہم بھی شکاری ہیں۔ شاید تمہارا کسی گروپ سے راہ میں کوئی تنازع ہوا ہے۔ وہی لوگ ہم سے راستے میں ٹکرائے تھے اور تمہارا نام لے کر تم لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن انہوں نے کسی لڑکی کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ تو ہمیں نظر نہیں آرہی، شاید تم وہ نہیں ہو جن کی انہیں تلاش تھی۔"

میرا اشارہ شاریا چولی کی طرف تھا۔ یوں میرا پھینکا تیر کام کر گیا۔ اس میں میرے اطمینان اور بے خوفی کا بھی عمل دخل تھا۔ دوسرے میرا اپ جگہ کے حالات کو بھانپتے ہوئے تکا بھی یہی تھا کہ ان لوگوں نے بھی جواد کے ساتھ دھوکا کیا تھا مگر چور کو مور پڑنے کے مصداق ڈیک والے بچنے کے بجائے اور اس کے لگی چولی درندہ صفت ساتھیوں نے خود غرضی سے کام لیا اور ... بول دیا۔

"میں ہی چینگ ہنگ ہوں۔" بالآخر اس نے کہتے ہوئے پستول دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور مصافحے کے لیے مسکراتے ہوئے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

"آؤ، ہمارے ساتھ کچھ کھاؤ پیو۔" اس نے دعوت دی۔ مجھے اس کا اخلاق بہت ہی اچھا لگا۔ باقیوں نے بھی مجھ سے اور زبیر سے مسکرا کر مصافحہ کیا۔

مجھے وہاں قریب میں ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ پرانے ماڈل کی یہ جیپ کسی سمندری جہاز کے ذریعے امپورٹ کی ہوئی تھی جو یقیناً ان کی ملکیت ہو سکتی تھی۔ جیپ خاصی بڑی اور ایڈونچرز وغیرہ کے لیے ہی نظر آئی۔ اس کی چھت پر بہت سا سامان لدا ہوا تھا۔ کچھ سامان اتارا گیا تھا جیسے چھ فولڈنگ چیئرز اور دو تین چھوٹی قسم کی میزیں، کھانے کا سامان، پانی اور اسی طرح کی اور بہت سی اشیاء۔

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے، چینگ ہنگ بھی ہمارے سامنے کی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ باقی اس کے تین ساتھی زمین پر بچھی دری پر بیٹھ گئے اور ایک ساتھی چاقو سے خرگوش کے بھنے ہوئے گوشت کے پارچے بنانے میں لگ گیا۔ اس کے تینوں ساتھی مجھے چینگ ہنگ کے ملازم ٹائپ ساتھی ہی لگے تھے۔

میں شاریا چولی کی معلومات کے مطابق دل میں تجزیہ کرنے لگا۔ چینگ ہنگ کو جہاں ہونا چاہیے تھا، وہاں اس کے تین ساتھی کہاں سے نمودار ہوئے؟ ممکن تھا کہ شاریا نے جھوٹ بولا ہو۔

urdunovels.com

”ہاں، دوست! کیا تم ان لوگوں کے بارے میں مزید کچھ بتا سکتے ہو جو تمہیں راستے میں ملے تھے اور کتنی دور تھے وہ یہاں سے؟“ چنگ ہنگ نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا اور ساتھ ہی جیب سے ولایتی سگریٹ کی ایک ڈبیا نکالی۔ ہمارے درمیان مختصراً تعارف ہوا تھا۔ میں نے اپنا نام غلط اور زبیر کا درست بتایا تھا۔

”جس طرح میں یہاں تم لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوں، اسی طرح میری ان لوگوں کے ساتھ بھی ہلکی پھلکی گپ شپ ہوئی تھی۔“ میں نے اپنے جیوٹ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ایک شاید کوئی ساجد یا سجاد نامی شخص تھا، جو تمہارے بارے میں زیادہ پوچھے جا رہا تھا۔“ میں نے اسے چونکانے کے لیے کہا۔ ”کافی دوری پر تھے، میرا خیال ہے وہ اس راستے پر نہیں ہیں۔“

”ہم......!“ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

”ویسے معاملہ کیا ہے؟ کیا کوئی خطرناک جھگڑا ہوا تھا آپ لوگوں کا؟“ میں نے کہا۔

”آں...... ہاں، کچھ خاص تو نہیں۔ وہ بھی شکاری ٹیم ہی تھی، ایسے حالات میں ہو جاتے ہیں چھوٹے موٹے جھگڑے۔“ اس نے جیسے بات آئی گئی کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری منزل کون سی ہے؟“ میں نے سوال کر ڈالا۔

”ہماری منزل......“ چنگ ہنگ کہتے ہوئے رکا۔ سگریٹ کی ڈبیا ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی دبی رہی، پھر اسے یاد آیا اور کھول کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے شکریہ کہہ کر ایک سگریٹ نکال لیا جبکہ زبیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دوسرا سگریٹ اپنے ہونٹوں میں داب کر اس نے لائٹر روشن کر کے میری جانب بڑھایا اور پھر اپنا سگریٹ سلگا لیا۔

”ہماری بھلا کیا منزل ہوگی؟ ہم تو شکاری ہیں، جہاں اچھا شکار مل جائے۔ ویسے تم کہاں کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، کیا تمہارے اور بھی ساتھی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، ہم دونوں ہی ہیں اور ہمیں کچھ مخصوص نسل کے سانپوں کی تلاش ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ، بہت دلچسپ۔“ چنگ ہنگ بولا۔

جب ان کا ایک ساتھی ہماری جانب گوشت کے پارچوں کی پلیٹیں بڑھانے لگا تو میں شکریہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ زبیر نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی۔

”ہمیں اجازت دیں، رات ہو رہی ہے اور ہمارا کام کچھ ایسا ہی ہے کہ کسی وقت ہمیں سوٹ کرتا ہے۔“ میں نے وہاں سے کھسکنے کا فوری بہانہ تراشا۔

القصہ ہم دونوں پلٹ گئے۔

”آگی شاو شے!“ پلٹتے ہی ہمارے ساتھی گھرائے تو جرجی کے منہ سے نکلا۔ ”یہ تو ہمارا شکار ہیں۔ کیا خیال ہے، ہلا بول دیں؟“

”نہیں جرجی! انہیں اندھیرے میں بھٹکنے دو۔ ہماری منزل آگے ہے اور یہ فی الحال ہمارے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا اور ہم سب کار کی جانب بڑھ گئے۔

اچانک جنگل کی ساکت اور ٹھہری ٹھہری فضا گولی چلنے کی آواز سے گونج اٹھی۔ ہم بری طرح ٹھٹک گئے اور یکدم گنیں نکال لیں۔ ہم سمجھے تھے شاید چنگ ہنگ کے شکاری کیمپ سے کسی نے ہم پر فائر مارا ہو۔ اسی لیے غیر ارادی طور پر فائر کی آواز سنتے ہی ہم جھک گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہوا۔

اب خاموشی چھا گئی لیکن اگلے ہی لمحے دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ چنگ ہنگ اور اس کے تینوں ساتھی بندوقیں سنبھالے عقب سے نمودار ہوئے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ چونکے۔ پھر چنگ ہنگ نے ہم سے پوچھا۔

”یہ فائر تم لوگوں نے کیے تھے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ باقی تین کون ہیں...... تمہارے ساتھی؟ مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تم صرف دو ہو؟“ چنگ ہنگ شاکی نظر آنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”یہ کوئی اور شکاری ٹیم ہے، ہم سے آن ملے تھے۔“

”میرا خیال ہے ہمیں گولیاں چلانے والوں کو تلاش کرنا چاہیے۔“ چنگ ہنگ کا ایک ساتھی بولا۔ دوسرے فائر کے بعد میں آواز کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ میں کار کی جانب دوڑا، باقی سب بھی میری تقلید میں ہو لیے۔

کار سے ابھی ہم چند قدم کی دوری پر تھے کہ میں ٹھٹک گیا۔ ایک اور کار ہماری گاڑی کے قریب کھڑی تھی اور اس میں جو تین مسلح افراد کھڑے تھے، ان میں سے دو میرے شناسا تھے۔ ایک سجاد بیگ تھا اور دوسرا لگا چودھری یعنی دراب جی، تیسرا ان کا کوئی ملازم ساتھی تھا۔ سجاد بیگ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور ہماری کار کے دو ٹائر برسٹ کیے جا چکے تھے۔ تین مخالف پارٹیوں کا یکدم آمنا سامنا کسی زبردست خونریزی کا متقاضی نظر آنے لگا۔

”او شاوا بھئی شاوا۔“ معاً ہی ہمیں دیکھ کر پہچان کر چودھری دراب جی نے ایک قہقہہ مار کر کہا۔ ”لیکن سہراب! جن لوگوں نے ہمیں دھوکا دیا، وہ بھلا تمہارے ساتھ کیا وفا

کریں گے۔“ کہتے ہوئے وراب جی نے اپنی گن سیدھی کی ہی تھی کہ اچانک چنگ ہنگ کے ایک ساتھی نے بجلی کی سی تیزی سے پستول نکال کر اس پر فائر کر دیا۔

گولی وراب جی کے کہیں لگی تھی جس کے سبب اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی مگر اس کے ساتھ کھڑے ساتھی نے اپنی گن کا منہ اس کی طرف کھول دیا۔ گولیوں کی ہیبت ناک تڑتڑاہٹ ابھری اور چنگ ہنگ کے دو ساتھی چیخیں مار کر خاک چاٹنے لگے۔ باقی ہم بڑی پھرتی کے ساتھ ادھر ادھر جھاڑیوں کی آڑ میں جا گھسے۔

اسی طرح سجاد بیگ نے بھی پھرتی سے اپنی کار کی آڑ لی تھی جبکہ وراب جی کا ساتھی اسے جھک کر کار کی طرف لے جانے لگا تھا کہ چنگ ہنگ کے کسی ساتھی نے دوبارہ فائر کیا۔ گولی وراب جی کے دائیں شانے میں گھس گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، جبکہ سجاد بیگ نے ان پر فائر کھول دیا۔

چنگ ہنگ کے دو ساتھیوں کی چیخیں ابھریں۔ سجاد بیگ نے بہادری دکھائی اور کسی طرح جان پر کھیل کر اس نے زخمی پڑے وراب جی کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

چنگ ہنگ نے اس پر فائر داغا تھا کہ سلیم نے اس پر گولی چلا دی جو اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ کریہہ انداز میں چیخ مار کر گرا۔ میں غصے سے دانت بھینچ کر سلیم کی جانب لپکا اور اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اسے گولی مارنے کی؟“ میں چلایا۔

”وہ کمینے چودھری اور سجاد بیگ پر گولی چلا دیتا۔“

سلیم نے وجہ پیش کی تو میرے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ گویا یہ اب بھی ان دونوں کا دم بھر رہا تھا، پھر اس سے پہلے کہ میں مزید اسے کچھ کہتا، جوجی نے کہا۔

”آئی شاو شے...... سہراب! اس معاملے کو بعد میں دیکھ لیں گے، دشمن سر پر ہے۔“

میں سجاد بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کار کے عقب سے ہم پر فائرنگ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا لیکن زبیر وقفے وقفے سے اس پر گولی چلا رہا تھا۔

”فائر بند کرو۔“ دفعتاً میں نے چلا کر زبیر سے کہا۔

وہ رک گیا، اس کے بعد میں نے سجاد بیگ کو للکارا۔

”سجاد بیگ! تم بیکار ہو چکے ہو، بہتر ہے کہ سامنے آجاؤ ورنہ میرے ساتھی تمہیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔“

سجاد بیگ میری آواز سن کر ٹھٹھر گیا پھر اس کی بھی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سہراب! میں تنہا بھی تم اور تمہارے ساتھیوں سے نمٹنے کے لیے کافی ہوں۔“ اس کی جوش بھری غصیلی آواز میں وہ دم خم نہ تھا جو کبھی اس کا خاصہ رہا تھا۔

”بیوقوفانہ باتیں چھوڑو اور گن پھینک کر سامنے آجاؤ۔“

”گن تم اور تمہارے ساتھی پھینکیں گے، میں نہیں۔“

”تم نے ہماری کار کے ٹائر کیوں برسٹ کیے؟“

”میں گاڑی پہچان چکا تھا۔ یہ تمہارے جگری دوست استاد جوجی کی ہے، جس کے بارے میں سلیم اور وسیم مجھے کئی بار بتا چکے ہیں۔“ وہ قہقہہ مار کر بولا۔ ”مگر وسیم نے تم سے غداری کی، سلیم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، تم کیا سمجھتے تھے کہ اب وہ جگہ تمہارے قبضے میں چلی جائے گی؟“

لالچ اور دولت کے حصول کے جنون نے اسے نفسیاتی طور پر پاگل کر دیا تھا۔ وہ مجھے بھی اپنے جیسا لالچی سمجھے ہوئے تھا۔

”ٹھہرو، میں بات کرتا ہوں اس کمینے سے۔“ سلیم نے کہا، پھر چیخ کر سجاد بیگ کو مخاطب کر کے بولا۔

”سجاد...... میں سلیم تم سے مخاطب ہوں۔ کیا تم مجھے سن رہے ہو؟“

دوسری جانب سے پھر سجاد بیگ کا ایک طنزیہ قہقہہ ابھرا اور اسی انداز میں بولا۔ ”تم دھوبی کے کتے...... نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ تم کیا بات کرو گے؟“

”پھر تمہاری شامت آئی ہے، تمہیں تو اپنی تعلیم والے نہیں پوچھتے ہیں، تم بھی پاس اقبال کے مرنے کے بعد دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے رہتے ہو۔ مجھے بدتر کتے کی مثال تم پر صادق آتی ہے کمینے آدمی!“ سلیم کو بھی طیش آگیا۔ دونوں ایک دوسرے کی اوقات جانتے تھے۔

یکایک مجھے لگا جیسے جوجی اور زبیر غائب ہیں۔ ابھی میں ان کے ”غیاب“ کی وجہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے سجاد بیگ کے زور سے کراہنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی فضا میں جنگ انداز کی ”آئی شاو شے“ ابھری۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سلیم ہونق بن گیا۔ میں نے دانت پیس کر سلیم سے کہا۔ ”الو...... جوجی اور زبیر نے میدان مار لیا ہے۔“

ہم تینوں جھاڑیوں سے نکل کر ان کی طرف بڑھے۔ سجاد بیگ کو جوجی نے ایک ہاتھ سے کسی لاوارث بچے کی طرح دبوچ رکھا تھا اور زبیر کے ہاتھ میں اس کی رائفل تھی جو مجھے اپنی ”ٹیک“ کی وجہ سے وہ مار گئی۔

چودھری وراب جی ابھی تک بھربھری مٹی والی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کے دائیں شانے

سے عاری رہے جا رہا تھا۔ سلیم اسے سنبھالنے کو بڑھا، راحیلہ نے بھی اس کی مدد کی۔ میں غور سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

سجاد بیگ ہانپتے ہوئے کراہ کر بولا۔ ”تم لوگ بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکو گے، نہیں جانتے تم کہ...... وہ منحوس مجسمہ اب اپنے اصل مالکوں کے ہاتھے چڑھ چکا ہے جو ہم سے اب تک کوسوں دور نکل چکے ہیں۔“

”آئی شاؤ شے!“ جوجی کے منہ سے پھر نکلا۔ ”تم اپنی خیر مناؤ، چوہے کی اولاد! ہم تو ایک میدان مار چکے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اب ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟“

”انہیں اسی حالت میں ادھر ہی چھوڑ دو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ میری نظریں سجاد بیگ کے ستے پڑے چہرے پر مرکوز رہیں۔ ”اگر ان لوگوں نے ہمارے پیچھے آنے یا ہمارا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی تو ہم دوبارہ بھی ان سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔“

”آئی شاؤ شے!“ اپنے مخصوص لہجے میں کہتے ہوئے جوجی نے سجاد بیگ کی گردن چھوڑ دی۔ وہ اپنی پشت سہلانے لگا۔ جوجی نے ادھر ہی شاید اسے چوٹ دی تھی۔

”تت...... تم سہراب...... انہیں بچو گے۔“ زمین پر خاک چاٹتے ہوئے چودھری نے کراہتے ہوئے مجھے گیدڑ بھبکی دی تو میں غرا کر اس سے بولا۔

”اپنی خیر مناؤ چودھری! تم اس خطرناک معاملے میں کیوں کود پڑے تھے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ معاملہ کس قدر حساس اور نازک ہے۔ ملک کے حساس ادارے اس میں شامل ہیں، انسپکٹر شیراز کو تم بھول گئے؟ تم لوگ بھی ملک دشمن عناصر کا ساتھ دینے کے الزام میں لمبی قید میں جا سکتے ہو۔“

میری تنبیہ نے خاطر خواہ اثر کیا تھا کیونکہ انہیں میری ”حیثیت“ کے بارے میں اب تک علم ہو ہی چکا تھا۔ تب ہی وہ رعونت چھوڑ کر منت پر اتر آیا، بولا۔

”کم از کم میری مرہم پٹی تو کر دو۔“

”یہ کام بعد میں سجاد بیگ بخوبی کر دے گا...... اور ہاں، ہم اب تمہاری گاڑی لے جائیں گے کیونکہ تم نے ہماری کار کے ٹائر برسٹ کروا دیے ہیں۔“

دونوں چیخنے چلانے لگے مگر ہم نے ان کی ایک نہ سنی۔ مرہم پٹی کا سامان ان کی جیپ میں موجود تھا، وہ ان کے حوالے کیا اور ہم ان کی جیپ میں ہی آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہو چکا، ہم مین جموں روڈ چھوڑ کر مضافاتی علاقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ رسول پور سے ہم ستوالی سے بھی آگے بڑھ گئے اور انڈین بارڈر کے بالکل قریب پہنچے تو ہمیں تشویش لاحق ہو گئی۔

”نکل گئے بدبخت!“ جوجی شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔

”بارڈر کراس کرنا اتنا آسان نہیں جوجی!“ میں نے کہا۔ ”چونکہ ہم ان کے روانہ ہوتے ہی تعاقب میں نکل چکے تھے، وہ زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ہاں، کہیں گھات لگائے چھپے بیٹھے، بارڈر کراس کرنے کا راستہ ضرور تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”آئی شاؤ شے! تو پھر اب ہم......“ کہتے کہتے جوجی رکا، شاید اس کے ذہن میں اچانک کوئی خیال آیا تھا، بولا۔ ”ہم ایسا کرتے ہیں کہ ادھر ہی اپنا چھوٹا اور عارضی بیس کیمپ قائم کر لیتے ہیں، پھر دو اور تین رکنی ٹیم بنا کر پیدل بارڈر کے قرب و جوار تک ان کی بو سونگھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”تم نے ٹھیک پلان کیا جوجی!“ میں نے تائیداً کہا۔ ”میں اور سلیم مغربی سمت جبکہ تم راحیلہ اور زبیر کو اپنے ساتھ لے کر جنوب مغربی سمت کی طرف نکل جاؤ۔ ایک بات کا خیال رہے، ان کا تھوڑا سا بھی سراغ ملتے ہی انہیں خبر ہوئے بغیر واپس الٹے پاؤں اسی جگہ لوٹ آنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی کوئی آخری ایکشن پلان تیار کریں گے۔“ اس پوری اہم مہم میں، میں سلیم چھالیا کو دانستہ اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

”اور اگر ہم دونوں میں سے کوئی ایک پارٹی ان سے الجھ پڑی تو دوسری پارٹی کو کیسے خبر ہوگی کہ اس کی مدد کو لپکے؟“ سلیم نے یہ سوال اٹھایا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ہمیں ایک دوسرے سے بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ایک پارٹی اگر بیس کیمپ پر آن پہنچی لیکن دوسری نہیں آئی تو پہلی والی پارٹی کو فوراً دوسری کی تلاش میں نکلنا ہوگا۔“

”ایک بات تو بتاؤ سہراب!“ معاً راحیلہ نے مجھ سے کہا۔ ”کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ لوگ اسی سمت پر ہیں؟ میرا مطلب ہے، کیا خبر وہ ابھی شہر میں ہی ہوں اور نکلنے کے لیے کوئی دوسرا پلان بنانے میں مصروف ہوں؟“

”میرے ذہن میں یہ بات تھی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن شاریا چرکی جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، اس لیے کہ اس کا اپنا مفاد بھی اس میں تھا۔“

"آرٹی شاد ہے!" جوجی نے راحیلہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ چنگ ہنگ اور سجاد بیگ وغیرہ کا ٹکراؤ ہم سے اسی جگہ ہوا، جس کا مطلب ہے کہ انہیں بھی پتا تھا کہ جمی اور ان کے نقاب پوش ساتھی اسی راستے پر نکل چکے ہیں۔"

راحیلہ چپ ہو رہی مگر پھر بھی مجھے اس کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہی دکھائی دیا تھا۔

کچھ ٹھہر کر ہم بہر حال اسی طرح الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ کر مذکورہ سمتوں کی جانب بڑھ گئے۔ رات گہری ہو چکی تھی، تاروں بھرا آسمان صاف تھا، ہلکی خنکی کا احساس ہوتا رہا۔ میں اور سلیم ویران اور کبھی جنگلاتی راستوں پر محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ہم نے گھنٹا بھر کا وقت متعین کر رکھا تھا۔

وہ ایک گھنٹا لاحاصل تلاشِ غنیم میں بیت گیا اور ہم دونوں اپنے کیمپ کی طرف پلٹ آئے۔ کیمپ خالی پڑا تھا، جس کا مطلب تھا جوجی، زبیر اور راحیلہ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔

"کیا ان لوگوں کا کوئی سراغ مل گیا ہے؟" معاً سلیم نے کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"کیا تم نے ان کی واپسی کی تاخیر سے یہ اندازہ لگایا ہے؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی ایک وجہ ہے میرے اس طرح سوچنے کی۔"

"تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں، پھر ہم طے شدہ پلان کے مطابق ان کے تعاقب میں نکل پڑیں گے۔"

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ میرا ارادہ چائے بنانے کا تھا لیکن سلیم نے منع کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہمیں دوسری پارٹی (جوجی وغیرہ) کی تلاش میں نکل جانا چاہیے۔ کیا خبر ان کا متوقع دشمنوں سے ٹکراؤ ہو گیا ہو۔

مجھے بھی یہی لگا تھا، اسی لیے میں نے روانگی کی ہامی بھر لی لیکن ابھی ہم نکلنے ہی والے تھے کہ زبیر جوش بھرے چہرے کے ساتھ لوٹ آیا۔ اسے یوں اکیلا لوٹتا دیکھ کر مجھے تشویش اور سلیم کو حیرت ہوئی۔

"خیریت ہے، زبیر؟ جوجی اور راحیلہ......!" ابھی میں اتنا ہی پوچھ سکا تھا کہ وہ اسی جوش کے ساتھ بولا۔

"وہ دونوں خیریت سے ہیں، دشمنوں کا سراغ مل گیا ہے۔ میں تمہیں لینے آیا تھا۔"

میں اور سلیم اس کی بات سن کر چونک پڑے اور پھر فوراً اس کے ساتھ ہو لیے۔ لگ بھگ کوئی دو سو میٹر پیدل چلنے کے بعد ہم تاروں بھری روشنی میں جنگل کے اس ویرانے میں داخل ہوئے جہاں خشک گھاس کے میدانوں میں خشک مٹی کے نیچے بھی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ اسی کی آڑ میں مجھے ایک انسانی سایہ سا کھڑا دکھائی دیا۔۔۔۔ وہ راحیلہ تھی۔

"جوجی کدھر گیا؟" میں نے راحیلہ سے سرگوشی میں پوچھا۔ اس کا جواب زبیر نے دیا۔

"استاد قریب کی ایک چھوٹی سی بستی کی طرف گیا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ تو استاد ہی آ کر بتا سکیں گے۔" یہ جواب زبیر نے دیا۔ "راحیلہ کو انہوں نے ادھر ہی موجود رہنے کی تاکید کی تھی اور مجھے تمہاری طرف بھیج دیا تھا۔"

ہم جوجی کی واپسی کے منتظر رہے۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی آ گیا۔ ہانپتی سی آواز میں وہ مجھ سے اور ہم سے کہنے لگا۔

"قریب ایک بستی کے آثار محسوس کر کے میں وہاں گیا تھا۔ میں نے کسی چھوٹے ٹرک کے ٹائروں کے نشان ٹارچ کی روشنی میں دیکھے تھے۔ وہ ٹرک مجھے ایک ڈیزل چکی کے قریب ذرا ہٹ کے مکان میں مل گیا۔ گاڑی کے جھٹکے والا یہ راکٹ ٹرک اللہ وسایا نامی شخص کا تھا۔ ٹرک کے ٹائروں کے نشان پر مجھے کچھ شبہ ہوا تھا کہ دشمن گروپ (جمی وغیرہ) کو جیسے گاڑی کی سواری کے لیے کسی ایسے ہی سواری کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔"

"اللہ وسایا نے ہی بتایا کہ ایک آدمی جو دیہاتی ہی لگتا تھا، اس نے خود کو قریبی آبادی کا باشندہ بتا کر اس سے کوئی بھاری شے کسی مکان پر پہنچانے کا کرایہ طے کیا اور اسے ٹرک سمیت لے گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوئی کینوس کپڑے سے ڈھکی ہوئی شے تھی، جس کے بارے میں انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ چکی کی موٹر کا انجن ہے۔ بہر حال وہ صرف تین ہی افراد تھے، لیکن شاید باقی چھپے ہوئے ہوں۔ جہاں انہوں نے وہ شے پہنچائی تھی، وہ زیادہ فاصلے پر نہ تھی، نہ ہی کوئی آبادی تھی۔ ایک ویران سی جگہ تھی جو یہاں سے چند ایک کوس کے فاصلے پر ہی ہے۔ پھر وہ ٹرک والا انہیں وہاں اس بھاری شے سمیت اتار کر لوٹ گیا۔"

جوجی کی یہ مختصر مگر جامع پلاننگ کارگر رہی۔ ہم بلا تاخیر اسی جانب کو چل دیے۔ اصل دشمنوں سے آخری اور فیصلہ کن ٹکراؤ اب قریب نظر آنے لگا۔ ابھی صرف سو ڈیڑھ سو میٹر مطلوبہ مقام کی دوری پر تھا اور یہاں جوجی نے نہایت محتاط انداز میں ٹارچ روشن کر کے ٹائروں اور کئی افراد کے قدموں کے نشان دیکھ لیے کہ ان کی سمت کو نہ پا سکے۔ اس بات نے ہم سب کو سخت

الجھن آمیز پریشانی میں مبتلا کردیا۔

"یہ تو بہت عجیب بات ہے۔" جوجی حیرت زدہ ہوا۔ "وہ سب لوگ بومبورگا کے مجسمے سمیت یہاں موجود تھے اور یہاں سے انہوں نے سرحدی پٹی پار کرنا تھی، پھر اچانک غائب ہوگئے، جیسے ان سب نے سلیمانی ٹوپی پہن لی ہو۔ نہ قدموں کے نشان، نہ اور کوئی آثار۔ اب کیا کریں؟"

جوجی نے باقاعدہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہم سب بھی گونگے سے ہوگئے، بھلا یکدم غائب ہوجانے والے افراد کو اب کیسے تلاش کیا جاتا یا ان کی سمت کا اندازہ کیسے ہوتا؟

"یوں لگتا ہے جیسے یہ لوگ یہاں آکر غائب ہوگئے ہوں۔" زبیر بھی حیرت آمیز تفکر سے بولا۔

"ایک منٹ...... تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش کھڑے رہو، میں دیکھتا ہوں۔" معاً ہی میرے تیزی سے سوچتے ذہن میں ایک خیال چمکا تھا جس کا ابھی میں نے کسی سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی کٹ سے چھوٹی ٹارچ نکالی، پھر زمین پر جھک گیا۔

مجھے یہاں ایک سے زائد افراد کے قدموں اور ٹرک کے ٹائروں کے نشان نظر آنے لگے، ساتھ ہی کسی وزنی شے کو زمین پر رکھنے کے آثار بھی ملے۔ اس کے بعد اتھاہ اندھیرا تھا۔ میں نے اچھی طرح ان نشانوں کے گرد تھوڑے تھوڑے قدموں کی دوری پر بھی جاکر مزید کوئی نشان تلاشنے کی کوشش کی مگر کچھ بھی نہ ملا۔ ناکامی اور شکست خوردگی کے ایک اذیت ناک احساس تلے بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

"بھی اور اس کے کئی پوش ساتھی ہماری سوچ سے بھی زیادہ مکار اور چالاک ثابت ہوئے، وہ ہمیں چکمہ دے گئے۔"

"آئی شاوشے!" بالکل غیر ارادی طور پر جوجی کے منہ سے نکلا اور میں نے ذرا سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے فوراً معذرت کی۔ اس ناکامی پر ہم سب کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔ راحیلہ نے اپنا سر پکڑ لیا، وہ مجھے زیادہ فکرمند اور پریشان لگی، جس پر مجھے حیرت تھی کیونکہ اسے بہر حال کسی بھی اس سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ تو محض ہمارا ساتھ نبھانے کی غرض سے چلی آئی تھی، اسی لیے مجھے اس کے اس قدر "پریشان" ہونے پر تھوڑی سی، مگر حیرت ہوئی تھی۔

"سب برباد ہوگیا۔" معاً ہی راحیلہ نے کہتے ہوئے اپنا سر تھام لیا اور شکست خوردہ انداز میں ٹیلے کی قدرے ڈھلانی سطح پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتی چلی گئی۔

تب ہی اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ راحیلہ گرتے ہی تقریباً نصف حد تک اندر کو دھنستی چلی گئی۔ اس افتاد پر وہ خود بھی بوکھلا گئی اور چیخ ماری۔ میں اور زبیر یکدم اسے سنبھالنے کو لپکے اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔

سلیم نے فوراً اپنی کٹ سے ٹارچ نکال کر اس مقام پر روشنی پھینکی جہاں وہ دھنسی تھی۔ ہم سب ششدر رہ گئے۔ بالکل ہی غیر متوقع اور اچانک میں دشمنوں کی راہ فرار کی وہ خفیہ "راہ گزر" ہماری پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے تھی۔

"ڈارک ٹنل......!" دفعتاً ہی زبیر کے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر زبیر کی طرف دیکھا، جس کی نظریں اسی اچانک پیدا ہونے والے اندھیرے گڑھے پر جمی تھیں۔

"وہ لوگ اسی ڈارک ٹنل سے سرحد پار کرگئے ہیں اور ہمیں وقت ضائع کیے بغیر اسی راستے سے نکلنا ہوگا۔"

زبیر نے جیسے ایک جوش جنون کے تحت مزید بتانا شروع کیا۔

"میں نے کچھ ملکی اور غیر ملکی جنگی تجربہ کار صحافیوں کے فیچرز مختلف اردو ڈائجسٹوں میں پڑھ رکھے تھے۔" کہتے ہوئے زبیر نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ہم سب سرتاپا سماعت بنے اسے سننے میں محو ہوگئے۔

"65ء کی دفاعی جنگ میں جب بھارت نے اپنی ازلی بزدلی دکھاتے ہوئے رات کی تاریکی میں وطن عزیز پر اچانک ہلا بولا، جس میں اسے منہ کی کھانی پڑی تھی، بعد کے عرصے میں چھپنے والے دیگر مضامین میں ان خفیہ ٹنلو کا ذکر بھی پڑھنے کو ملا، جسے "ڈارک ٹنلو" کا نام دیا گیا۔

"یوں دشمن نے اپنی سرحدی پٹی کے اندر سے اپنے گوریلے چھوڑنے کے لیے چند ایک ٹنلو بنانے کی کوشش کی تھی لیکن نصف بنا کر کسی وجہ کے سبب ادھوری چھوڑ دیں...... مجھے پورا یقین ہے کہ بھی کا وہ درندہ صفت لنگی پوش گروہ یعنی گربھ داس وغیرہ اسی راستے سے داخل ہوئے ہوں گے اور اپنا مقصد (مجسمہ) حاصل کرنے کے بعد اسی راستے سے واپس جانے کی پہلے سے منصوبہ بندی کی ہوگی۔"

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ہمارے گروپ میں مجھے شہ زوری کی پہچان دی گئی تھی تو زبیر کو دماغ کی حیثیت حاصل تھی اور استاد جوجی گروپ کا دل کہلاتا تھا۔

"لیکن یہ ٹنل تو ادھوری تھیں، جیسا کہ تم نے کہا...... تو پھر......" سلیم کچھ کہتے کہتے رکا تو جوجی نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کرڈالا۔

"جنگ کی بات تو پرانی ہوگئی، کیا جب تک یہ ٹنلو وقت گزرنے کے ساتھ دوبارہ نہ بھر گئی ہوں گی؟"

"آسان سی بات ہے۔" میں نے کہا، جو زبیر کی

بات کا اصل سمجھ رہا تھا۔ ”آثار نہیں ملتے، یہ ان لوگوں کے علم میں ہوگا۔ نہ بھی ہوا تو ان کی پہلے سے پلاننگ تو یہی رہی ہوگی نا۔ اب کھدائی کرنے کے دوران ایسی کوئی گم گشتہ نکل انہیں مل گئی ہوگی۔ باقی نصف کا کام ان کے لیے نمٹانا کیا مشکل ہوگا۔“

”مہراب نے میری بات کی درست توثیق کی ہے۔“ زبیر بولا۔ ”میری بات ضروری نہیں ہے کہ سو فیصد ہی درست ہو، ایک آئیڈیا تو ذہن میں یہی سوچ کر آتا ہے۔“

”تم لوگ فضول بحث میں الجھ رہے ہو۔“ راحیلہ ایک دم بولی، وہ اب پرجوش نظر آ رہی تھی۔ ”ہمیں بھی اسی راستے سے ان کے تعاقب میں جانا چاہیے۔“

”یہ فضول کی بحث نہیں ہے۔“ سلیم سنجیدگی سے بولا۔ ”ہمیں آپس میں گفتگو کر کے اچھی طرح تصدیق کر لینی چاہیے، کیونکہ اب ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہا۔ اگر یہ بھی ضائع ہو گیا تو پھر ہمیشہ کی ناکامی ہمارا مقدر ہوگی۔“

”تم کیا کہتے ہو دوستو؟“ جوجی نے جیسے بحث ختم کرنے کی غرض سے پوچھا۔

”اس راستے کو اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔“ میں نے کندھے اچکا دیے۔ اسی دوران زبیر کے ذہن میں ایک اور امید افزا خیال آیا، بولا۔

”میری بات کی تصدیق کے لیے یہی کافی ہوگا کہ یہ سُرنگ اگر تازہ کھودی گئی ہوگی تو ابھی اس کی مٹی نرم ہوگی۔ وہ لوگ ایک ساتھ تو نہیں البتہ کسی ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے لیٹ اور گھسٹ کر آگے بڑھتے گئے ہوں گے۔ مجسمہ بھی کسی ڈبے کی طرح آگے یا درمیان میں رکھ دیا ہوگا، اسے بھی کھسکاتے ہوئے ان چالاک لوگوں نے اپنا یہ سفر جاری رکھا اور یوں سب سے آخر والے کے ذمے اپنے پیچھے سرنگ کو بھرنے کا کام لگا دیا۔“ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔

”دوسری تصدیق کے لیے کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ ان لوگوں کے آثار اسی مقام پر پہنچ کر ایک دم پراسرار طور پر غائب ہو گئے ہیں۔“ زبیر کی ذہنی فراست عروج پر تھی، پھر ہم نے وقت ضائع نہیں کیا اور اسی مقام کی مٹی کو کھودنا شروع کیا تو وہ کسی بھربھری مٹی والے ٹیلے کی طرح کھوکھلی ہوتی چلی گئی۔

ابتدا میں کھودنے پر آشکار ہو گیا کہ کھدی ہوئی مٹی بھی باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پیش آ رہی تھی کیونکہ اتنی گنجائش چھوڑ دی گئی تھی کہ اپنی راہ بنانے کے ساتھ ساتھ کھدی ہوئی

شریفانہ طریقہ

ایک چڑیا نے دوسرے چڑیا سے پوچھا۔ ”آج کل حامد صاحب نظر نہیں آ رہے، وہ خیریت سے تو ہیں؟“

”آپ کو نہیں معلوم حامد صاحب کو تو کار چرانے کے الزام میں تین سال کی سزا ہو گئی ہے؟“ دوسرے چڑیا نے بتایا۔

”کمال ہے۔“ پہلے چڑیا نے حیرت سے کہا۔ ”یہ حامد صاحب بھی بڑے ہی بے وقوف آدمی ہیں۔ انہیں بھلا ایسی کیا آفت پڑی تھی کہ کار چرانے چل دیے۔ کار حاصل کرنے کے لیے وہ شریفانہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتے تھے؟ یعنی قسطوں پر کار لے لیتے اور قسطیں ادا نہ کرتے جیسا کہ زیادہ تر شریف لوگ کرتے ہیں۔“

(مرسلہ: خرم شاہد، ملتان)

یا راستے سے ہٹائی ہوئی مٹی کو ایک طرف کیا جاتا رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی زیر زمین رہنے والے جانور کیا کرتے ہیں۔ اب خواہ ایک ہی آدمی کی جگہ بچے جو آگے بڑھے تو اس کے عقب میں خالی جگہ پر دوسرا اور پھر تیسرا شخص اپنی راہ پر آگے بڑھتا رہے۔

شکر تھا کہ ہماری ایڈونچر کٹس میں اس طرح کے اوزار بھی موجود تھے۔ ہم جت گئے۔ سب سے آگے میں تھا، میرے بعد راحیلہ، سلیم، زبیر اور سب سے آخر میں جوجی۔

سرنگ اتنی آسان ثابت ہو رہی تھی کہ کہیں کہیں سے تو مٹی کھودنے کے بجائے صرف ہٹانے کی زحمت ہی درکار تھی۔ یہ بات ہمارے اس شبے کو مزید تقویت دے رہی تھی کہ وہ لوگ بھی اسی راستے نکلے ہیں۔ مزید پیش قدمی پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ آگے کا راستہ اور بھی کلیئر تھا، یعنی خلا...... مٹی غائب...... یقیناً ان لوگوں نے عجلت اور منزل پر جلدی پہنچ جانے کے لیے ایسا کیا ہوگا۔ یعنی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم ان کے تعاقب اور راہ فرار تک پہنچ جائیں گے۔

اب جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے، ہمارا جوش اور عزم بھی بڑھتا جاتا۔ بہت آگے جا کر سرنگ بالکل تاریک ہونے لگی تو درمیان میں زبیر نے ٹارچ روشن کر لی۔ ہماری رفتار بہت سست تھی، یوں جیسے چیونٹیوں کی لائن رک رک کر رینگ رہی ہو۔ سرنگ کی ساخت کہیں کھودی ہو جاتی، کہیں ڈھلائی، اس

کے بعد قدرے سیدھی چلتی رہتی۔

ایک مقام پر ہماری سانسیں پھول گئیں، گھٹن کا بھی احساس ہونے لگا۔ اگر ہم اپنے عقب میں خلا نہ چھوڑتے جاتے تو حبسِ دم کا شکار ہو کر مر ہی جاتے۔ ہم نے پانی کی بوتلیں ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ ٹھہر ٹھہر کر ہم آگے بڑھتے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو پکار کر خیریت وغیرہ بھی دریافت کرتے جاتے۔

ایک مقام پر میں اچانک رکا، پیچھے والے بھی رکے۔ مجھ سے پیچھے راحیلہ تھی، اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"یہاں سے سرنگ بائیں جانب گھوم رہی ہے اور دائیں طرف بھی، مجھے تھوڑا ٹھہر کر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس موڑ کو اختیار کیا جائے۔ باقی پیچھے والے ساتھیوں کو بھی یہ پیغام دے دو۔"

راحیلہ سے یہ کہنے کے بعد میں نے ٹارچ کی روشنی باری باری دونوں راستوں کی تاریکیوں میں پھینکی۔ شکر ہوا کہ زیادہ الجھنا نہ پڑا، بائیں طرف کا موڑ خالی اور دائیں جانب کا سخت مٹی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے پیغام دیا اور آگے سرکنا شروع کر دیا۔

لگ بھگ کوئی ڈیڑھ گھنٹا بیت چلا اور اس کے بعد میرا راستہ مٹی کے ڈھیر نے روک لیا۔ میرا دل یکبارگی مسرت سے دھڑکا۔ میں نے فوراً ساتھیوں کو پیغام دیا کہ ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں کیونکہ مٹی کے ڈھیر نے راستہ آگے روک لیا ہے جس کا مطلب ہے کہ سرنگ کا سرا دور نہیں۔ یہاں سے دشمن نکلنے کے بعد اسے بھر چکا ہے۔

میں نے مٹی ہٹانا شروع کر دی۔ ہمارا قیاس غلط نہ تھا، یہاں بھی مٹی تازہ اور نرم محسوس ہوئی تھی، جیسے ابھی ابھی سرنگ کا منہ بند کیا گیا ہو۔ ایک بات عجیب تھی، وہ یہ کہ مٹی کے ساتھ پتھر کے ٹکڑے بھی ان میں شامل تھے۔ سرنگ کی وضع قطع بھی یہاں پتھریلی سی ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سرنگ دشمن سرحد سے کسی پہاڑی مقام پر کھودی گئی تھی۔ یہ خیال ذہن میں فوری پیدا ہوا تھا کہ آخر دشمن یہاں سے اتنی جلدی اور سرنگ کے اس آخری پتھریلے حصے کو کاٹ کر کس طرح نکل گئے؟ لیکن جلد ہی اس کا جواب از خود مجھے مل گیا، جس کا ذکر زیر بھی تھوڑی دیر پہلے اپنی ذہنی فراست سے دے چکا تھا۔

بھی کا گھس پیٹھ گروہ چونکہ پہلے اسی چور راستے سے ملک میں داخل ہوا تھا اور یقیناً انہیں کچھ زیادہ وقت ہی لگا ہوگا لیکن واپسی میں ان کا اسی راستے سے واپس لوٹنے کا ارادہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی واپسی کے لیے اس خم سرنگ کو اندر سے نرم اور مزید "آدم گزار" بنالیا تھا، اسی سبب وہ واپسی کا راستہ ان کے لیے نسبتاً آسان اور کم محنت طلب ثابت ہوا۔ اسی طرح ہمارے حصے میں بھی کچھ آسانی اسی وجہ سے آگئی تھی۔

بہرکیف، یہاں سے بھی سخت پہاڑی پتھر وغیرہ ہٹا دیے گئے اور اس مشقت کے اختتام پر ایک روشنی کی کرن ابھری اور ایک بڑی سی کھوہ کے منہ کی صورت میں سامنے ہی مجھے چمکتی چاندنی میں برف پوش پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں کا مقدور بھر منظر دکھائی دے گیا۔

یہاں سے سرنگ کا منہ بہت وسیع ہوگیا۔ جو پہلے محض چٹانی تو اور کشادہ ہوا، اس قدر کہ ہم پانچوں آگے پیچھے اکڑوں بیٹھ کر سامنے اور قدرے ڈھلان کا جائزہ لے سکیں۔ ہماری آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ نظارہ بے شک سرحد پار دشمن ملک کا تھا مگر بہت ہی سحر انگیز اور عجیب سا لگا۔ چند لمحے ہم مبہوت سے رہے، اس کے بعد گرد و پیش کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ہم کسی نچلی سطح کے مختصر پہاڑی سلسلے کی عمودی ڈھلان پر تھے۔ ہم بڑی احتیاط سے باری باری باہر آئے اور بائیں جانب چٹانی دراڑ کی آڑ میں ہو گئے۔ یہاں سے بڑا سحر انگیز اور دلکش نظارہ دکھائی دیا۔ مست چاندنی میں ڈوبی وادی دکھائی دی، جہاں جابجا جنگل، جھاڑیاں، گھنے درخت اور ایک جگہ پر گھاس کا قطعہ اراضی بھی نظر آیا۔

اچانک میں چونکا۔ آخر الذکر مقام پر مجھے الاؤ دہکتا محسوس ہوا۔

"اس طرف ہو کر دھیرے دھیرے نیچے اترو، دشمن تھا ہمارا ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔" میرے اس جملے نے سب کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔

ہم مختصر سے دامن والی اس پہاڑی سے جلد ہی نچلی جنگلی سطح پر اتر آئے۔ بلاشبہ یہاں ہمیں انڈین بارڈر سیکیورٹی فورسز والوں کی طرف سے بھی خطرہ تھا مگر دشمن نے یہ راستہ اپنایا تھا چونکہ وہ خود بھی غیر قانونی طور پر اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنی اصل منزل تک پہنچنا چاہتے تھے اسی لیے ہماری طرح وہ بھی "چور" ہی تھے۔ اس سے یہی اندازہ ہوا کہ یہ مقام نسبتاً زیادہ محفوظ تھا۔ ابھی ہم پڑاؤ سے دور تھے، تصدیق کرنا باقی تھا کہ یہی لوگ ہمارا "شکار" تھے یا کوئی اور......

ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ میں سب سے

UrduNovels.com

ک گیا تھا اور میری غیر معمولی ابھری صلاحیتیں اس وقت عروج
پر تھیں لیکن جیسے ہی ہم خیموں کے قریب پہنچے تو میں ٹھٹک کر
رک گیا، باقی ساتھی بھی تھم گئے۔ خیموں سے باہر الاؤ کی
روشنی میں دور سے ہی مجھے دو لنگی پوش، پہرے داری کرتے
دکھائی دے گئے۔

"آئی شاو شے! کیا ہوا؟" جوجی نے دبی آواز میں پوچھا۔

"ہمارا شکار سامنے ہے۔" کہتے ہوئے میں جوش،
عزم تلے مرتعش سا ہونے لگا۔ باقی ساتھیوں کو بھی میں نے
اس کی خبر دی۔ تب میں نے اسی طرح دو ٹولیاں بنائیں۔
سلیم میرے ساتھ، باقی جوجی کے ہمراہ راحیلہ اور زبیر۔
دونوں سمتوں سے ہم نے سب سے پہلے ان پہرے دار لنگی
پوشوں پر ہلا بولنا تھا۔

قریب پہنچتے ہی ہم بیک وقت ان پر ٹوٹ پڑے۔
ہماری کوشش یہی تھی کہ ان کی آوازیں نہ نکلنے پائیں مگر
بدقسمتی سے ایک لنگی پوش کو چھرا نکالنے کا موقع مل گیا تو اس
نے تاک کر سلیم پر وار کرنا چاہا۔ شکر تھا کہ وہ محتاط رہا، یکدم
جھکائی دے کر بچ گیا مگر چھرا فضا میں تیرتی "شاپ"
کی سنسناتی آواز نکالتا خیمے کی دیوار کو چیرتا اندر گھس گیا۔

ایک چیخ اندر سے ابھری تھی اور پھر جیسے سب بیدار
ہو گئے۔ رن کھل گیا، میدان گرم ہو گیا، فیصلہ کن گھڑیاں سر
پر آ گئیں۔ تینوں خیموں سے لنگی پوش چھرے تانے برآمد
ہوئے، ان میں بڑے خیمے سے برآمد ہونے والے لنگی پوش
کو دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ گربھ
داس تھا۔ اس کے عقب میں آنکھیں ملتی ہوئی چھپی بھی نمودار
ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔

"حملہ......" میں چیخا، ساتھ ہی گولیوں کی تڑتڑاہٹ
ابھری۔ تین لنگی پوش کریہہ چیخیں مار کر زمین بوس ہو گئے،
باقی ادھر ادھر چھپنے لگے۔ مجھے ان کی تعداد آٹھ دس سے
زیادہ نہیں لگی۔

ادھر گربھ داس نے جوجی کو اپنے مہلک چھرے سے
نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اس پر گولی چلا دی جو
اس کے چھرے والے ہاتھ پر لگی، چھرا ہاتھ سے نکلا اور
اندھیرے میں جا گرا۔ دوسری گولی چلانے ہی والا تھا کہ چھپی
نے مجھ پر اپنے پستول سے فائر جھونک مارا۔ گولی میرے
پستول والے ہاتھ میں لگی اور وہ تاریکی میں دور جا پڑا۔

میں نہتا ہو گیا تو جوجی نے زبیر کو چلا کر میری مدد کا کہا
جو پہلے ہی ایک دو لنگی پوشوں کے چھروں کے حملوں سے بچنے
اور انھیں [illegible] جوجی کی آواز

سنتے ہی میری جانب کو لپکا تو جوجی نے اسے کور دیتے ہوئے
[illegible] دونوں لنگی پوشوں کا راستہ روکا۔

راحیلہ اور سلیم دوسرے لنگی پوشوں سے بڑی
بہادری کے ساتھ نبرد آزما تھے تب تک گربھ داس [illegible]
موت بنا میرے سامنے آن پہنچا [illegible] دوسرا چھرا اس نے اپنی
صدری کے نیچے سے نکال کر [illegible] زبیر نے اس پر گولی
چلائی، گربھ داس نے اپنے [illegible]
چھری سے جگہ بدلی اور [illegible] زبیر کی
جانب اچھال دیا۔ چھرا [illegible] کی طرح زبیر کی
جانب لپکا۔ زبیر نے [illegible]
چاہا مگر چھرا اس کے دائیں شانے [illegible]
میں پیوست ہو گیا۔

زبیر کے حلق سے دردناک چیخ ابھری اور وہ ڈگمگا
گیا۔ ابھی ہم [illegible] گولیاں برساتے جا رہے تھے۔ جوجی دو لنگی
پوشوں [illegible] کر کے چھپی کی طرف متوجہ تھا۔

گربھ داس پر میں نے چھلانگ لگا دی۔ اس نے بھی
بچنے کے بجائے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دیے جیسے
مجھے "جپھا" ڈال کر دبوچ لینا چاہتا ہو۔ قد و قامت میں ہم
دونوں تقریباً ایک ہی تھے، میں اس سے ٹکرایا اور وہ گر گیا۔
نتیجے میں ہم دونوں ہی زمین پر آ رہے۔

اس نے گرتے ہی گھٹنے کی ضرب میرے پیٹ پر
رسید کر دی، کوئی اور ہوتا تو یہ زوردار ضرب اسے دُہرا کر دینے
کے لیے کافی ہوتی۔ اگرچہ چند لمحوں کے لیے میں بھی بے
حال سا ہوا تھا مگر یہ جنگ آخری اور فیصلہ کن نوعیت کی
تھی...... آر یا پار...... اب سب کچھ سہہ کر لڑنا تھا۔

میں نے درد دبانے کے لیے اپنے ہونٹ بھینچ لیے
اور ایک لات چلا دی جو گربھ داس کے چہرے پر پڑی۔
وہ لڑکھڑا گیا لیکن دوبارہ پلٹ کر اٹھ کھڑا ہوا، تب تک میں
نے اچھل کر فلائنگ کک اسے رسید کر دی۔ وہ ایک [illegible]
ہوئے درخت کے نکیلے ٹھنٹھ پر جا گرا، تنے میں [illegible]
کی پشت میں گھس کر سینے کی جانب سے نکل آیا۔ گربھ داس
کے حلق سے بھیانک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ وہ گویا لکڑی
کے [illegible] میں پرو گیا تھا۔

اس کی آخری چیخیں سن کر باقی لنگی پوشوں کی ہمت اور
حواس جانے لگے، جو اب دو تین ہی باقی بچے تھے۔ زخمی
زبیر کو سلیم نے سنبھالا دے رکھا تھا۔ میں نے چلا کر جوجی
کو فائرنگ سے منع کر دیا تھا، اس خدشے کے سبب کہ کہیں
[illegible] کسی قریب میں [illegible]

urdunovels.com

ہوا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔

ادھر بچھی نے جب گر بھ داس کا میرے ہاتھوں یہ عبرتناک حشر دیکھا، جس پر اسے ناز اور بہت غرور تھا تو وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری اور ایک لمبے پھل والا چھرا لیے جنونی انداز میں چلاتی ہوئی میری جانب لپکی ہی تھی کہ راحیلہ نے دور ہی سے اس پر جست بھری اور اسے رگیدتی ہوئی پیچھے آ رہی۔ میں بھی ان کی طرف لپکا، وہ دونوں زمین پر گتھم گتھا تھیں۔ ایک موقع پر بچھی کو راحیلہ کی گردن پر چھرا پھیر دینے کا موقع مل گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے، راحیلہ کو اس کا اندازہ نہ ہو پایا۔ دفعتاً میں نے اپنے دائیں پاؤں کو زور سے حرکت دی اور جس روڑے پر میری نگاہ عین وقت پر پڑی تھی، جو میرے بوٹ کی ٹو کے ساتھ ہی لگا ہوا پڑا تھا، وہ گولی کی طرح نکل کر بچھی کی کنپٹی سے جا ٹکرایا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھرے کی دھار راحیلہ کی گردن سے محض ایک دو انچ کے فاصلے پر ہی رہ گئی اور وہ پلٹ کر دور جا پڑی۔

میں نے جھک کر اس کا وہی چھرا اٹھایا اور اس ناپاک اور رذیل درندہ صفت عورت کے سینے میں اتار دیا۔ اس کے حلق سے کسی بدروح جیسی کریہہ ناک چیخ ابھری اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

یہ سب دیکھ کر دو تین بچے کھچے لنگی پوشوں کو اپنا انجام نظر آنے لگا۔ انہوں نے فوراً راہ فرار اختیار کر لی۔ ہم سب اس فتح و کامرانی سے مسرور کشادہ خیمے میں داخل ہو گئے، بلکہ سلیم اور جوجی نے تو دشمنوں سے چھینے ہوئے چھروں کی مدد سے خیمہ ہی پھاڑ ڈالا۔

خیمے کے عین وسط میں یومبورگا کا وہ منحوس مجسمہ کسی خبیث بلا کی طرح رکھا دکھائی دیا۔ ہم سب یک ٹک مبہوت ہو کر اسے گھورنے لگے۔ زبیر ہنوز زخمی حالت میں تھا، جوجی نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اس کا شانہ بری طرح زخمی تھا جس پر ایک دشمن کی لنگی پھاڑ کر اس کے زخم پر باندھ دی گئی تھی تاکہ عارضی طور پر جریان خون بند ہو سکے۔

اچانک ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک گھگھناتی ہوئی آواز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"سکیورٹی فورسز!" دفعتاً ہی میرے منہ سے نکلا۔ سب چونک پڑے۔

"ابھی کوئی حملہ نہ کرے، دائیں بائیں چھپ جاؤ۔" میں نے کہا اور پھر یکلخت ہم پلٹے...... پھر جسے جہاں گھات ملی وہ وہاں جا پڑا۔ میں اور سلیم دائیں جانب کی تاریک

دور ایک جنگل سے ڈھکی پہاڑی ڈھلان کے درمیان میں روشنی سی آتی دکھائی دی۔ وہ کوئی گاڑی تھی، اس کی چھت پر سرچ لائٹ نصب تھی جو بعد میں روشن کر دی گئی تھی۔ روشنی کا ایک سیلاب سا اس قطعۂ ارضی کو نہلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ دور سے ہی انہیں یہاں ہونے والی خونریز لڑائی کا اندازہ ہو چکا ہو گا۔

گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ اس کی باڈی پر انڈین سکیورٹی فورسز کا مخصوص مونوگرام صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ گاڑی ایک چھوٹی سی ہڈ والی جیپ تھی، جس پر باڈی اکثر میں بکتر بند کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر ہی وہ سرچ لائٹ تھی جو کسی ہولڈ کی طرح چاروں طرف خودکار انداز میں ہولے ہولے گردش کر رہی تھی۔ باقی طرف کی چھت پر ایک فولادی دائرہ ابھا ہوا تھا جہاں سے ایک انڈین اہلکار کا نصف جسم دکھائی دیا جو ٹیلی اسکوپ گن لیے چوکس نظر آیا۔

گاڑی کا انجن بند ہوتے ہی سناٹا چھا گیا۔ یہ موت کا سناٹا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد اندر سے تین چار تنومند سے انڈین فوجی اترے، ان کے ہاتھوں میں خودکار گنیں دبی ہوئی تھیں۔ ان میں جو اپنی شخصیت کے لحاظ سے زیادہ تنومند اور لمبا تڑنگا دکھائی دیا، وہ ان کا گروپ انچارج لگا۔ اس کے بریسٹ پاکٹ پر ایک بڑے سے ایریل والا وائرلیس سیٹ جڑا ہوا تھا۔ اس نے چاروں طرف لومڑی جیسی نظروں سے دیکھا پھر خود کلامیہ بڑبڑایا۔

"لگتا ہے یہاں اسمگلروں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ ہوئی ہے۔"

"یس سر! بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے لیکن سر...... وہ کیا شے رکھی ہے؟" اچانک اس نے پھٹے ہوئے خیمے کی جانب اشارہ کر دیا جس پر جلدی میں، میں نے کپڑا ڈال دیا تھا مگر وہ ان کی نظروں سے بھلا کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔ اسی لیے ان سے بھی جنگ ناگزیر ہونے لگی تھی۔

وہ اس کی طرف بڑھے، تب ہی میں نے حملے کا کاشن دے دیا۔ جوجی اور سلیم نے ایک ساتھ ان پر فائرنگ کر ڈالی۔ راحیلہ اور میں نے جیپ کی چھت سے آدھا دھڑ باہر نکالے ہوئے ٹیلی اسکوپ گن والے کو نشانہ بنایا۔ وہ تو وہیں ڈھیر ہو گیا، باقی دو اہلکار خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے ہم نے مار گرائے جبکہ گروپ انچارج اور اس کے ساتھیوں نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور قریب کے ایک پہاڑی

urdunovels.com

سے لدے ٹیلے کی آڑ کی جانب چھلانگیں لگا دیں۔ مورچا سنبھالتے ہی ان دونوں نے ہم پر تابڑ توڑ گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

''انہیں جلد گھیرے میں لے کر ہلاک کر ڈالو ورنہ یہ کمک بلالیں گے۔'' میں نے ساتھیوں سے کہا اور پھر ہم دائیں بائیں اسی طرح دو کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ زبیر زخمی ہونے کے باوجود نہ رکا۔ مشن کو ادھورا چھوڑنا اب ہماری موت کے مترادف بن چکا تھا۔

فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا کہ اچانک فضا میں راحیلہ کی چیخ ابھری۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔ میں اور سلیم فوراً اس کی مدد کو لپکے۔ زبیر پریشان تھا، جوجی کو وہ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں راحیلہ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ برسٹ چلا، بس زندگی تھی کہ میں بال بال بچ گیا مگر میرے ہمراہ سلیم نے فوراً سمت کا اندازہ کرتے ہی اپنے پستول سے تلے اوپر دو فائر کر ڈالے۔ ایک چیخ ٹیلے کی جھاڑیوں سے ابھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔

معاً ہی اسی گروپ انچارج کی خرخراتی للکار ابھری۔

''تم لوگ ہتھیار ڈال دو، بہت جلد یہاں آرمی کی گاڑیاں پہنچنے والی ہیں۔ تم لوگ اب بچ نہیں سکتے۔''

''آئی شاوٹ!'' جوجی نے زیر لب کہتے ہوئے اس طرف دو گولیاں چلادیں مگر کوئی آواز نہ ابھری۔

''وقت نہیں رہا، اسے ہر ممکن طور پر تلاش کر کے ہلاک کرنا ہوگا۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا، گروپ انچارج نے اپنے وائرلیس پر مزید کمک منگوائی تھی۔ انڈین کمک آنے کا مقصد بوصبورکا کا مجسمہ ازخود بھارت کے حوالے کرنے کے مترادف ٹھہرتا، جس کے حصول کے لیے انہوں نے ''را'' کے ڈیلی ونگ بلیک کیٹس اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسی ''موساد'' کے ایڈوانس گروپ ریڈ فاکس کی مدد لی تھی۔ لہٰذا اب یہ معاملہ ہم سب کے لیے زندگی اور موت کا ہی نہیں، وطن کی سلامتی کا بھی ہو چلا تھا، جس کے حصول کے لیے سب نے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ دی تھیں۔

ایک موقع پر سلیم نے جان پر کھیل کر اس گروپ انچارج کے بہولے کو متحرک دیکھ لیا۔ وہ زبیر کو اپنی گن سے نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا کہ سلیم نے عین وقت پر اس پر چھلانگ لگا دی۔ گولی چلی ضرور مگر زبیر کے بجائے سلیم کے دائیں پہلو میں پیوست ہو گئی مگر سلیم نے اس قدر زخمی ہونے کے باوجود ہار نہ مانی اور اسی انڈین آفیسر کا پستول جھپٹ کر نال کا رخ اس کے سینے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور انڈین آفیسر کا سینہ شق ہو گیا۔ سلیم ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو کر ڈھیر ہو گیا۔

میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ سلیم کربناک چیخ کے ساتھ گرا۔ انڈین آفیسر بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم سب اس کی طرف لپکے، وہ ابھی سانسوں پر تھا، خواہ اکھڑی اکھڑی سی۔

''یار سلیم! تو نے میری خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال دی؟'' زبیر دکھ سے بولا۔ مجھ سے کچھ نہیں بولا جا رہا تھا۔ سلیم کی یہ قربانی دیکھ کر مجھے عجیب سی چپ لگ گئی تھی، میں اس کے بارے میں کیا سوچے ہوئے تھا اور وہ کیا ثابت کرنے لگا تھا۔

آسمان پر چاند پورے جوبن پر تھا، پہاڑی جنگل رات کے اس درمیانی پہر میں چپکے ہولے ہولے سانس لیتا محسوس ہونے لگا۔ پہاڑیوں کے برفیلے تاج چہار سو چھٹکی ہوئی چاندنی میں منعکس ہو کر روشنی کی سحر انگیزی کو اور سوا کر رہے تھے کہ اچانک ہماری سماعتوں سے ایک سے زائد گاڑیوں کے دوڑنے کی آوازیں ٹکرائیں اور بیک وقت ہم نے اس بل کھاتے راستے کی سمت دیکھا جو پہاڑیوں کے درمیان سے نیچے اسی قطعۂ اراضی کی طرف گھوم رہا تھا جہاں ہم سب موجود تھے۔ ان گاڑیوں کی تعداد کسی طرح بھی تین چار سے کم نہ تھی اور ان میں ایک بڑا سا ٹرک بھی تھا جو پورا انڈین آرمی سے بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''اب وقت بالکل نہیں رہا، کسی ایک کو قربانی دینا ہوگی، یوں بھی گولی مجھے اندر تک گھائل کر چکی ہے، شاید مشکل ہی سے بچ پاؤں میں......!'' معاً وہ ہماری آہ و بکا کو خاطر میں لائے بغیر بولا، پھر میری طرف دیکھا۔

''سہراب! ساتھیوں کی مدد سے مجسمہ ساتھ لے جاؤ اور اسی سرنگ کا رخ کرو۔ میں گن لیے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کروں گا۔ بس، مجھے کسی طرح اس جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دو۔''

سب کے چہرے دکھ سے نمناک ہو گئے۔ کچھ اور سوچنے یا پلان کرنے کا وقت واقعی نہیں تھا۔ ہم نے وہی کیا، سلیم کو سیٹ پر بٹھایا، اسی کے کہنے پر دشمنوں کی لاشوں سے اٹھائی ہوئی گنیں بھی اس کے حوالے کر دیں۔ ایک اس نے گود میں رکھی اور باقی ساتھ والی سیٹوں پر۔ میں نے سر اٹھا کر دور عمودی سمت کے تنگ پہاڑی راستے کو دیکھا۔ انڈین آرمی کا قافلہ رکا ہوا تھا، شاید وہ لوکیشن کا تعین کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ انہیں یہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

سلیم نے ایک آخری نگاہ ہم پر اور آخر میں جب راحیلہ کے افسردہ چہرے پر ڈالی تو راحیلہ نمناک لہجے میں بولی۔

"سلیم! مجھے معاف کر دینا۔"

اس قدر دکھ بھری گھڑیوں کے باوجود ہم سب چونک کر ان دونوں کو دیکھنے لگے۔

"نہیں، راحیلہ! تمہارا فیصلہ درست تھا۔ میری دعا ہے کہ تم اور زبیر ایک ساتھ تاعمر خوشیوں بھری زندگی گزارو...... خدا حافظ دوستو! دل مضبوط کرو...... خیال رہے میری قربانی ضائع نہ جائے۔" اس کے بعد اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

میں نے دیکھا، دور چاندنی میں انڈین آرمی نے ایکشن ٹریس کر لی تھی کیونکہ اب ان کی گاڑیاں اسی سمت کو دوبارہ متحرک ہو گئیں۔ جوجی اور میں نے مجسمے کو اٹھایا اور ہم سب سرنگ کی جانب دوڑے۔

زبیر اور راحیلہ آگے راستہ بناتے گئے۔ اسی وقت عقب میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے مڑ کر دیکھا، سلیم نے اپنی گاڑی درمیان میں آڑی ترچھی کر کے روک دی تھی اور اتر کر مختلف سمتوں سے ان پر گولیاں برسائے جا رہا تھا۔ انڈین آرمی کی تینوں گاڑیاں رک گئی تھیں اور وہ یہ سمجھے ہوئے تھے شاید ایک سے زائد افراد نے ان پر فائرنگ کر ڈالی ہے۔ وہ بھی مورچے سنبھالنے لگے۔ سلیم کی فراست قابل دید تھی۔

مگر میں ہی نہیں، سب ہی جانتے تھے کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا...... اور وہی ہوا، جیسے ہی ہم سب لوگ باری باری سرنگ میں داخل ہوئے، گولیوں کی ایک باڑ چلی، ساتھ ہی سلیم کی آخری چیخ پہاڑیوں میں گونج بن کر ابھری۔ یکایک مجھے یوں لگا جیسے پوری وادی رو پڑی ہو۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپکے اور سب سے آخر میں سرنگ میں داخل ہونے کے بعد میں تیزی سے سرنگ کا دہانہ بھرنے لگا، یہاں تک کہ وہ بالکل بند ہو گیا۔ ہم نے واپس سرکنا شروع کر دیا۔ وہ منحوس مجسمہ ہمارے درمیان ہی کہیں رکھا ہمارے زور کی مدد سے آگے کھسکتا رہا۔

☆☆☆

ہم نے جب بالآخر سرنگ پار کر کے وطن عزیز کی پاک دھرتی پر قدم رکھا تو پو پھٹنے لگی تھی۔ ہم فتح یاب ہوئے تھے مگر سلیم کی قربانی نے ہمارے دل دکھ سے بھر ڈالے تھے۔

چوکی والے ٹرک ڈرائیور سے رابطہ کر کے ہم مجسمے کو بحفاظت گھر لے آئے۔ اس کے بعد میں نے انسپکٹر شیراز کو فون کر کے ساری روداد بتائی۔ وہ حساس اداروں کے دو اعلیٰ آفیسروں کو ساتھ لے آیا اور ہم نے مجسمہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس عظیم مقصد اور ذمے داری سے عہدہ برآ ہوتے وقت شیراز اور ان مذکورہ دونوں آفیسروں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ مجسمے کو ایکسرا ایک کمپنی میں جلا کر خاک کر دیا جائے گا۔

فوزیہ کو سلیم کی قربانی پر بڑا دکھ ہوا۔ وہ بچاری رو پڑی اور بار بار یہی کہتی رہی کہ وہ میرے بھائی ماجد کا دوست تھا، میں اسے بھائی سمجھنے لگی تھی۔

آخر میں جوجی اور میں نے زبیر اور راحیلہ کی کلاس لے لی اور کہا کہ وہ ہمیں بتائیں کہ یہ "معاف" کر دینے والا کیا معاملہ تھا؟

راحیلہ نے بتایا کہ کچھ روز پہلے جب سلیم نے اس سے اظہار محبت کرتے ہوئے اس کا آخری جواب لینا چاہا تو راحیلہ نے سلیم سے صاف کہہ ڈالا تھا کہ وہ زبیر کو پسند کرتی ہے اور زبیر بھی اسے چاہتا ہے۔ اس دن کے بعد سلیم نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔

اب مجھے اپنے اندر کی اس نامعلوم بے چینی کا ادراک ہوا جو مجھے سلیم کی شخصیت سے پراسرار طور پر اور اچانک ہی محسوس ہونے لگی تھی مگر افسوس، میں اس کا غلط مطلب لیے ہوئے تھا۔ اپنی اس بدگمانی پر مجھے بہرحال شرمندگی تھی۔

"آئی شاؤ شے......!" جوجی نے ایک ایک ہاتھ سے زبیر اور راحیلہ کے کان پکڑتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"اس سرے کیرے نے تو اپنے حالِ دل سے ہمیں آگاہ کر دیا تھا مگر تم دونوں کیوں اب تک چھپے رستم نکلے؟ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔"

"استاد جی! اپنے دل کا حال تھوڑا ہی کوئی ہر کسی کو بتاتا ہے۔"

اس کے جواب پر ہم مسکرا دیے۔ راحیلہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد ہم سب نے سلیم کی اس بے مثال قربانی پر نماز پڑھ کر خدا سے اس کی مغفرت کی باجماعت دعا کی۔ سلیم کو یاد کر کے گھر کی فضا بوجھل سی ہونے لگی تھی۔

یہی حال باقی کے دنوں میں رہا لیکن ایک دن فوزیہ نے مجھے ایک خوشخبری کی اطلاع دیتے ہوئے اس بوجھل پن کو کسی حد تک کم ضرور کر دیا۔

آپ اندازہ کر ہی چکے ہوں گے کہ فوزیہ نے شرماتے ہوئے مجھے کون سی خوشخبری سنائی ہوگی؟

(ختم شد)

UrduPDFs.com

منصوبہ ساز

جاوید بسام

کوئی کام صحیح ہو یا غلط... اسے انجام دینے کے لیے سب سے اہم چیز پلاننگ ہے... بہتر منصوبہ بندی ہی کسی بھی کام کی کامیابی کی ضمانت ہے... وہ بھی ایک منصوبہ ساز تھا اور ہر کام کو بہتر طور پر انجام دینا چاہتا تھا... اس کی کوشش تھی کہ خود کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رکھے... مگر کیا وہ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہ سکتا تھا؟

جیک دی ریپر کہلائے جانے والے
سیریل کلر کی کہانی

میں آہستہ آہستہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ زیادہ بڑا کمرا نہیں تھا۔ ایک طرف پرانا بیڈ بچھا تھا جس کا گدا دھنسا ہوا اور میلا تھا۔ مشرقی دیوار پر دو گرد آلود کھڑکیاں ایک تنگ گلی میں کھل رہی تھیں جس کی سامنے والی عمارتوں کی لٹکی ہوئی منزلیں کمرے کو مزید تاریک اور تنگ بنا رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ گرمیوں میں وہاں سخت گرمی ہوتی ہوگی۔ خوش قسمتی سے موسم گرما ختم ہوگیا تھا اور میں سردیوں سے پہلے شاید وہاں سے چلا جاتا۔ گیسٹ ہاؤس کی مالکن فرازی اگر ایک

کمزور، لالچی چہرے والی عورت کی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے کا کرایہ زیادہ نہیں تھا، مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں کوئی خوفناک واقعہ ہوا ہو۔

ابھی تک میں نے صرف ایک لمبی زرد سی لڑکی کو دیکھا تھا جو سیاہ لباس میں تھی۔ اس کے بال گردن کے پچھلے حصے میں ایک جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے جو چہرے کی ہڈی کو نمایاں کر رہے تھے۔ وہ راہداری میں بھوت کی طرح چلتی ہوئی گزری تھی اور ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے خوفزدہ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حالانکہ اسے مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس قسم کی لڑکیاں مجھے بالکل بھی پسند نہیں۔

جب میں فراؤ ماگر کے ساتھ شرائط طے کر رہا تھا تو اس نے بتایا کہ یہ لڑکی شہر کے سب سے بڑے فیشن ہاؤسز میں سے ایک میں ورزن تھی لیکن اب بیمار پڑی ہے اور گھر پر رہنے پر مجبور ہے۔ وہ ڈاکٹر کی فیس برداشت نہیں کر سکتی تھی اور ڈرتی تھی کہ جلد اپنی نوکری کھو دے گی۔ خیر، ان دنوں ہر جگہ حالات خراب تھے اور زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ برلن بظاہر دوسرے شہروں سے اس لیے مختلف تھا کہ یہ ایک بڑا اور گنجان آباد شہر تھا۔ میں نے دن میں کچھ وقت اپنی چیزوں کو کھولنے میں صرف کیا۔ میرے پاس براؤن چمڑے کا سوٹ کیس اور کاغذ کا ایک بڑا تھیلا تھا۔ سوٹ کیس اگرچہ پرانا تھا مگر بہت بڑھیا تھا۔ فراؤ ماگر نے اس بات کو ضرور مد نظر رکھا ہوگا کیونکہ جب میں اندر داخل ہوا تو اس نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ہاں، میں عام سا آدمی ہوں، بظاہر میں کسی کی توجہ نہیں کھینچتا لیکن جو کچھ مجھے کرنا ہے، اس کے لیے یہ فائدہ مند ہے۔ میرا کوٹ پرانا ہے، میرے جوتوں کی ایڑیاں گھس گئی ہیں لیکن میں پڑوسی کرائے دار سے جوتوں کی کچھ پالش لینے کی کوشش کروں گا۔ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں، مجھے انہیں احتیاط سے خرچ کرنا ہوگا۔

میں یہ ڈائری اپنے خیالات اور کاموں کو ریکارڈ کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں جو بعد میں اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا مجھے اخبارات میں لکھنا چاہیے؟ کولون میں، جہاں میں تین مہینے رہا، میں نے اس پہ توجہ دی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک جاننے والے نے مجھے متنبہ کیا کہ پولیس میری حرکات میں دلچسپی لے رہی ہے، لہٰذا میں وقت پر وہاں سے نکل آیا۔ یہاں مجھے محتاط رہنا ہوگا اور کسی بھی صورت میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرانی ہوگی۔ میرے والد ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میری چھٹی حس بہت تیز ہے۔ میں اکثر مستقبل کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ میں نے بستر کے قریب دیوار پر لگا ایک گرد آلود کیلنڈر دیکھا۔ کسی وجہ سے پچھلے مہینوں کے صفحات نہیں پھاڑے گئے تھے۔ میں انہیں پھاڑ دوں گا اور مختصر نوٹس لکھنے کے لیے ان کو استعمال کروں گا۔ اب میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھول دی تاکہ حبس بھرے کمرے میں تازہ ہوا آ سکے۔ پھر میں نے گھوڑے کے بالوں والی کرسیوں میں سے ایک پر کھڑے ہو کر تصویروں سے بچی گئی میں جالا اتارا اور چند ماہ پیچھے کو گزرتے دیکھا۔ آخر میں بستر پر واپس آ گیا، کیلنڈر اتار کر اپنی یادداشت کے گھوڑے دوڑائے اور اس پر نشانات لگانے لگا۔ میں نے پچھلی تمام تاریخوں کو مارک کرنے کے بعد آنے والی تاریخ پہ دائرہ لگا دیا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب کہاں ہوں۔ میں حیران ہوں کہ ہم وقت کو کیوں نہیں روک سکتے اور کچھ واقعات کو دوبارہ کیوں نہیں دہرا سکتے جس طرح انسان انہیں اپنے ذہن میں لا سکتا ہے؟

شام قریب آ رہی تھی۔ گیسٹ ہاؤس میں گوبھی کے سوپ کی خوشبو آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔ مجھے بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے صبح ناشتے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا، دو چھوٹے رول اور ایک کپ گھٹیا کافی۔ میں نے اپنا چمڑے کا پرس نکالا اور دروازہ بند کر کے نقدی گننے لگا۔ میرے پاس مستقبل قریب کے لیے کافی مارک موجود تھے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا مجھے گیسٹ ہاؤس میں رہنا چاہیے اور وہاں تیار کھانا لینا چاہیے؟ شاید نہیں۔ کچن سے اٹھنے والی مہک مجھ جیسے خوش مزاج آدمی کے لیے پرکشش نہیں تھی لیکن مجھے محتاط رہنا ہوگا۔ کسی پرسکون سڑک پر کوئی چھوٹا اور سستا کیفے ڈھونڈنا ہوگا لیکن اگر چاہوں تو آج یہاں رات کا کھانا کھا سکتا ہوں تاکہ ڈنر کے لیے کچھ خاطر خواہ بچت ہو جائے۔ خیر، دیکھتا ہوں، لیکن مجھے اپنی صحت پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیتھرین نے کہا تھا کہ میں بہت دبلا پتلا اور کمزور نظر آتا ہوں۔ وہ پیاری لڑکی نہ جانے اب کہاں ہوگی؟ حالانکہ وہ ایک معمولی لڑکی تھی لیکن اس نے ایک اہم موقع پر میری مدد کی اور میرے کولون میں قیام کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ میرا سر اب بھی دکھ رہا ہے۔ شاید یہ اس گھٹیا شراب کا اثر ہے جو میں نے کل رات اسٹیشن پر پی تھی۔ میں پیسے بچانا چاہتا تھا۔

کمرا صاف کرنے کے بعد میں نے چراغ جلایا اور کمرے میں نظر دوڑائی۔ ہاں، اب یہ کچھ بہتر لگ رہا تھا کیونکہ تمام چیزیں ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ خوش قسمتی سے وہ بہت زیادہ نہیں تھیں۔ چراغ کی لو مسلسل جل رہی ہے لیکن میں نے چراغ کو ہلایا تو دیکھا کہ اس میں تیل

بہت کم ہے۔

باہر ابھی روشنی ہے لیکن کمرا مکمل اندھیرے میں ڈوب گیا ہے۔ مجھے نوٹس لینے اور پڑھنے کے لیے چراغ کی ضرورت ہوگی۔ مجھے فراؤ ماگر سے کہنا چاہیے تھا کہ اسے تیل سے بھر دے یا مجھے پینٹری میں جو چھوٹے دھاتی کنٹینرز ہیں، ان میں تھوڑی مقدار میں تیل رکھنے کی اجازت دے۔ ان پر سفید رنگ میں نمبر لکھے ہیں۔ بلاشبہ وہ کمروں کے نمبر ہوں گے۔ کل بارہ ہیں تو اگر تمام کمرے آباد ہوں تو یہاں بارہ مہمان ہوں گے۔ شاید یہ اہم ہوگا۔ میں نے اپنے بیگ کو بستر پر رکھ کر کھولا اور اس کے سامان کا بڑی احتیاط سے جائزہ لینے لگا۔ خوش قسمتی سے اس کا تالا بہت مضبوط ہے۔ وہ عام قسم کا نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی کمرے میں آئے تو مجھے اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ فراؤ ماگر کے پاس یقیناً دوسری چابی ہوگی اور نوکرانی کمرا صاف کرنے آتی ہوگی لہٰذا مجھے یہ دیکھنا ہوگا کہ میرے نوٹس اچھی طرح چھپے ہوئے ہیں۔ ہوٹلوں اور سرائے میں لوگ اکثر دوسروں کے کام میں مداخلت کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست تھے...... لیکن میں ہٹ رہا ہوں۔ کہانی بہت طویل ہے۔ اگر میں لکھوں تو زیادہ وقت اور کاغذ لے گی۔ شاید کبھی، جب میں مشہور ہو جاؤں گا تو میں اسے شائع بھی کرواؤں گا۔ یہ یقیناً پڑھنے کے لائق ہوگی۔

پھر میری نظر کمرے کے کونے میں ایک پردے پر پڑی۔ میں نے اسے کھینچ کر ہٹایا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ وہاں ایک واش بیسن لگا تھا جس کی پچھلی دیوار پر پتھروں کی زد میں آیا ایک آئینہ بھی موجود تھا۔ میں نے تانبے کا نل کھولا تو سرد پانی کا دھارا بہنے لگا۔ ایسی جگہ پر یہ کتنی عیاشی کی چیز تھی۔ میں اپنی صفائی مکمل پرائیویسی میں یہاں کر سکتا تھا اور گرم پانی یقیناً نیچے دستیاب ہوگا۔ مجھے گرم پانی چاہیے کیونکہ میرا استرا کچھ کند ہو گیا ہے اور میں نے ابھی تک نئے قسم کے سیفٹی ریزر نہیں آزمائے۔ کہتے ہیں کہ جلد کو ان کا عادی ہونے میں وقت لگتا ہے۔ میں پھر بستر پر بیٹھ گیا۔ میرے پاس چند ہفتوں کے لیے پیسے ہیں، اگر میں احتیاط سے خرچ کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ مزید پیسے کہاں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن اس بار احتیاط ضروری ہے۔ کولون کے معاملے نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔ یقین کریں میں صرف یاد کرنے سے ہی کانپ جاتا ہوں۔ اگر وہ بوڑھی عورت نہ ہوتی تو کسی کو کچھ بھی معلوم نہ ہوتا لیکن کس نے سوچا تھا کہ اس کی نظر اور سننے کی صلاحیت اتنی تیز ہوگی؟ لیکن جیسے میرے والد کہا کرتے تھے "چھٹی حس" نے پھر میری مدد کی۔ بہرحال انسان کو کبھی خوش قسمتی پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ میں اٹھا اور چراغ کو قریب کر کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ جو عکس مجھے نظر آ رہا تھا، وہ اتنا برا نہیں تھا۔ میں خوبصورت نہیں ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ میری شکل پروقار ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ برلن پُرہجوم شہر ہے۔ مجھے ایک خیال آیا کہ دنیا مقناطیس کی چھڑی کی طرح ہے۔ جتنا آپ اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اتنا ہی آپ کو کھینچ لیا جاتا ہے۔ مجھے پرسکون رہنا ہوگا۔ جب میں ایسی سوچوں میں گم ہوتا ہوں تو کبھی کبھار انہیں بلند آواز میں دہراتا ہوں۔ ایسے مقام پر جہاں دیواریں پتلی ہوں، یہ خطرناک بات ہے۔ میں بیسن کے قریب گیا اور نل گھما کر اپنے جلتے ہوئے چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھویا۔ اب بہتر ہے۔ سر درد اور شراب کی باقیات غائب ہو گئی ہیں۔ میں کمرا چھوڑنے کی تیاری کرنے لگا لیکن پہلے آخری بار اس کی مکمل جانچ کرنا ہوگی۔ میں میز پوش کے کنارے سے اپنے جوتے پالش کرنے کے لیے جھکا اور آخری نظر اردگرد ڈالی۔ پھر پرانے زینے پر کھلنے والے دروازے کو کھولا جس پر ایک بوسیدہ قالین بچھا تھا اور دیواروں پر مذہبی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے رنگ ماند پڑ گئے تھے۔ میں واپس میز پر آیا، لیمپ بجھایا، کیروسین اور گرم دھات کی تیز بو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دروازہ احتیاط سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ مجھے فراؤ ماگر کا خیال آیا تو مسکرا اٹھا۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں روزی کیسے کماتا ہوں؟ یہ سوال نہ صرف اس کے لیے، بلکہ میرے لیے بھی اضطراب کا باعث بنتا۔ میں نے چابی جیب میں ڈالی اور چرچراتی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ مجھے کوئی نظر نہیں آیا، اگرچہ پہلی منزل سے آوازوں کی مدھم گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں پچھلے دروازے سے باہر نکلا اور تیزی سے قدم اٹھاتا گلی میں آگے بڑھ گیا۔ جلد ہی میں برلن کے مضافات میں انسانوں کے ہجوم میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مجھے ایک چھوٹے سے کیفے کی تلاش تھی جو کسی گلی میں ہو، جہاں میری طرف کوئی توجہ نہ دے لیکن وہ زیادہ سنسان جگہ نہ ہو ورنہ میرا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ جوں ہی مجھے کوئی مناسب جگہ نظر آئی، میری عقابی نگاہ اسے فوراً پہچان لے گی۔ جیسا کہ میری ماں کہا کرتی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک بالکل موزوں جگہ مل گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا کیفے تھا جو تنگ عمارتوں کے بیچ پھنسا ہوا تھا، ایک پرسکون گلی میں، لیکن ایک مرکزی سڑک کے بالکل ساتھ۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ خاص طور پر میرے مقاصد کے

لیے بنایا گیا ہو۔ اتنا بڑا کہ میں باقی لوگوں میں گم ہو جاؤں لیکن اتنا چھوٹا کہ اردگرد کسی مشتبہ شخص پر نگاہ رکھ سکوں۔ لگتا تھا کہ چونکہ زیادہ پیسوں والے خاندانوں اور گشتی سیلزمینوں کی آماجگاہ ہے۔ میں انہیں فوراً پہچان لیتا ہوں، خاص طور پر ان کے اداس چہروں اور ان پرانے سوٹ کیسوں سے جنہیں وہ اپنی کرسیوں کے نیچے بڑی مضحکہ خیز احتیاط سے رکھتے ہیں۔ کوئی عورت اکیلے میز پر بیٹھی نظر نہیں آئی۔ یہ سیلزمین اپنے اداس چہروں اور درد تھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اپنی غلامی سے آزاد ہوں، اپنی فنکاری کو آگے بڑھانے کے لیے آزاد، سفر کرنے کے لیے آزاد، یعنی جب میرے پاس پیسے ہوں، دوست چننے میں آزاد، خاص طور پر عورتیں۔ میں اس بارے میں طویل بات کر سکتا ہوں لیکن میں نے طے کیا ہے کہ میں اس ڈائری کو زیادہ سے زیادہ پیشہ ورانہ انداز میں رکھوں گا۔ اس چھوٹے کیفے کی کھڑکی کے پاس میری نشست بغیر کسی مداخلت کے، باہر چلتے لوگوں کو دیکھنے کی آزادی دے رہی ہے۔ ہر قسم کے لوگ، نوجوان اور بوڑھے، مرد اور عورتیں، بچے، لڑکیاں، خانہ بدوش اور بے گھر۔ میں پردے کی آڑ سے انہیں چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

جلد ہی میری نظر ایک لڑکی پر جا ٹکی۔ وہ دراز قد اور خوبصورت جسم کی مالک تھی۔ اس کا لمبا لباس جسم کی خوبصورتی کو نمایاں کر رہا تھا اور اس کے اخروٹی رنگ کے بال کشادہ، ہموار پیشانی سے پیچھے کی طرف کنگھی کیے گئے تھے۔ اس نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کی عمر بیس یا پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ وہ کئی بار میری کھڑکی کے سامنے سے میرے ارادوں اور نگاہوں سے بے خبر ٹہلتے ہوئے گزری۔ کیا وہ یونہی ٹہل رہی تھی جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں، یا کسی سے ملنے کی منتظر تھی؟ شاید کسی سہیلی سے، یا کسی مرد سے۔ بہرحال، وہ کوئی طوائف نہیں لگتی تھی۔ میں اس قسم کی عورتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس میں ایک باعزت محنت کش عورت کی تمام نشانیاں موجود تھیں۔

میری دلچسپی پہلے ہی کافی بڑھ چکی تھی لیکن پھر ایک زرد چہرے والے نوجوان ویٹر نے جس کی سفید قمیص پر چکنائی کے داغ نمایاں تھے، میری توجہ ہٹائی۔ میری جھنجلاہٹ بڑھ گئی کیونکہ وہ لڑکی اب نظر نہیں آ رہی تھی لیکن میں نے اپنی جھنجلاہٹ کو بے نیازی میں چھپا لیا اور اپنی پسندیدہ ساکچر کا آرڈر دیا جس کے ساتھ ابلے ہوئے آلوؤں کا ایک بڑا ڈھیر ہوتا ہے۔ میں نے ایک گلاس سرخ شراب کا بھی آرڈر دینے کی ہمت کی جو میں جانتا ہوں کہ یہاں بہت اچھی ملتی ہے۔ میں رغبت سے کھانے پر جھپٹا اور ابتدائی بھوک مٹانے کے بعد شراب کی گرمی محسوس کرتے ہوئے دوبارہ مشاہدے کی طرف لوٹ گیا لیکن کسی وجہ سے وہ خوشی ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی اب وہاں نہیں تھی۔

اب جبکہ میں کھانے میں مشغول ہوں اور کیک کھانے میں آ رہا ہے، میں اردگرد کی میزوں پر بیٹھے لوگوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔ میرے قریب تین سخت چہرے والے مرد بیٹھے ہیں، جن کے چیک دار سوٹ اور بھرے ہوئے جسم میرے تربیت یافتہ مشاہدے کے مطابق انہیں کامیاب سیلزمین ظاہر کرتے ہیں۔ میں انہیں غور سے دیکھتا ہوں۔ مجھے ایک موٹا سا بٹوا نظر آتا ہے جو ان میں سے ایک نے نکالا ہے۔ وہ تھوڑے نشے میں ہیں اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کے سامنے سرخ شراب کی ایک ایک صراحی رکھی ہے اور وہی زرد چہرے والا ویٹر وقتاً فوقتاً ان کو بھر رہا ہے۔ وہ زیادہ تر کاروبار کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تفصیلات پر توجہ نہیں دیتا لیکن جب وہ اپنی آواز دبا لیتے ہیں تاکہ کسی گزرتی ہوئی خوبصورت عورت پر فحش پھبتی کس سکیں تو میں سننے کے لیے کان لگا دیتا ہوں۔ میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ وہ کب باہر نکلیں گے۔ میں وقت کو اس طرح ترتیب دیتا ہوں کہ کیفے سے ان لوگوں کے ساتھ ہی باہر نکلوں۔ وہاں مختلف چہرے اور اونچی آوازیں پہلے ہی دوسرے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہی تھیں۔ سیب کی پیسٹری نہایت مزیدار تھی۔ میں نے بیکری سے ایک اور پیسٹری اور اسٹرانگ کافی منگوائی جو اس جگہ کی خاص پہچان تھی۔

آخرکار کھانا ختم ہوا۔ میں نے بل دیکھنے میں ایک آدھ منٹ صرف کیا۔ میں انتظار میں تھا کہ میری ساتھ والی میز کے لوگ اٹھ جائیں۔ میں نے بٹوا نکال کر مطلوبہ رقم دی اور ویٹر کے لیے معمولی سی بخشش چھوڑی، جس نے بہرحال مجھے بہت اچھی سروس دی تھی۔ کل میں دوبارہ یہاں آؤں گا۔ وہ تینوں افراد اٹھے، لڑکھڑاتے، میزوں کے بیچ چلتے ہوئے کیشیئر کے پاس پہنچے جہاں ایک سرد مزاج خاتون بیٹھی تھی، جس کے بال برف جیسے سفید تھے۔ اس نے سیاہ سوتی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے بازو کے پاس ایک دھاتی راڈ پر ادا شدہ رسیدیں یوں لگی تھیں جیسے کسی نے انہیں سولی پر چڑھا دیا ہو۔

میرا "دوست" جو مجھ سے آگے قطار میں کھڑا تھا، اس نے اپنا موٹا بٹوا نکالا اور اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر زور سے قہقہہ لگایا۔ جب اس نے بازو گھمایا تو میں بمشکل اس سے

نکل گیا۔ اس کا بٹوا زمین پر گر گیا۔ اس نے بے ساختہ گالی بکی۔ بٹوے سے نوٹوں کی ایک گڈی باہر آ گئی تھی۔ میں نے معذرت خواہ لہجے میں جھک کر بٹوا اٹھایا اور اسے تھماتے ہوئے مزید معذرت کی۔ اس نے خوشدلی سے سر ہلایا۔ یہ سب انتہائی مہارت سے ہوا۔ ایسے لمحات میں مجھے اپنی پیشہ ورانہ چابکدستی پر فخر محسوس ہوتا ہے۔

میں نے بھی بل ادا کیا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ میں اب بھی ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر فٹ پاتھ پر کھڑے بلند آواز میں اپنے شام کے منصوبوں پر گفتگو کرتے رہے پھر مشرق کی سمت چل دیے۔ میں نے ان کے برعکس مغرب کا رخ کیا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔ میں لوگوں کے ریلے میں چلتا اپنی کامیابی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور راہ گیروں، خاص طور پر عورتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے معمولات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دکانوں کی تھکی ماندہ مددگار لڑکیاں، جن کے منجمد چہروں پر عارضی آزادی کی کچھ چمک آ جاتی ہے، مونچھوں والے مرد، موٹے شوہر اور ان کی موٹی بیویاں اور لاعلاج بھکاری، مرد و زن دونوں، جو دکانوں کے درمیان کوری دیواروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ماچس بیچنے والے، معذور ریٹائرڈ فوجی، ایک تو خود ساختہ لکڑی کی گاڑی میں لیٹا تھا جسے ایک بوڑھی عورت، شاید اس کی ماں، دھکیل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ شکر ہے اب بوڑھی نے انہیں کمبل سے ڈھک دیا تھا۔ میں اس کی ٹوپی میں ایک سکہ ڈال کر پیچھے ہٹ گیا تاکہ اس کے شکریے سے بچ سکوں۔ اب میں زیادہ فیاضی کا متحمل ہو سکتا تھا۔ میری انگلیوں نے جیب میں موجود کرارے نوٹوں کو ٹٹولا لیکن پھر اپنی بے صبری پر قابو پا لیا کہ جب تک واپس اپنے کمرے میں نہ پہنچ جاؤں۔ پھر گلی کے کونے کی طرف چل دیا۔

آخر وہ لڑکی مجھے نظر آ گئی۔ وہ ایک کونے میں کھڑی بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے پرسکون انداز میں دیکھا، یہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے میں ہارڈ ویئر کی دکان میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ وہاں زنگ کی بالٹیوں کے پیچھے آئینے لٹک رہے تھے۔ اپنی جگہ سے میں لڑکی کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ کیفے کی کھڑکی کے مقابلے میں اب اور بھی زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔

وہ وہیں کھڑی رہی، الجھن زدہ۔ اپنے سفید دستانے پہنے ہاتھوں کو بار بار رگڑ رہی تھی۔ پھر وہ ایڑیوں پر گھومی جیسے کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور بھیڑ والی سڑک کی طرف بڑھ گئی۔ میں مناسب فاصلے سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ ہم دونوں کے درمیان راہ گیروں کا پردہ تھا۔ جب وہ رکتی تو میں بھی رک جاتا اور دکھاوا کرتا جیسے کسی دکان کو دیکھ رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے نہیں لگتا کہ ایسی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ میری موجودگی سے بالکل بے خبر تھی۔ ہم ایک گھنٹے تک گھومتے رہے۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ اندھیرا ابھر رہا تھا اور لیمپ جلانے والے اسٹریٹ لائٹس روشن کر رہے تھے، جب مجھے اچانک احساس ہوا کہ ہم دوبارہ اس کیفے کے قریب آ گئے ہیں جہاں میں نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ میں سڑک کے دوسری طرف اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا لیکن اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ پھر اچانک جب ہجوم شام کے دھندلکے میں گم ہونے لگا تھا، میں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ ایک نوجوان جس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اور جس کے سیاہ بال اسٹریٹ لائٹ میں چمک رہے تھے، لڑکی کی طرف دوڑا اور بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ راہ گیر تجسس سے انہیں دیکھنے لگے لیکن وہ جوڑا سب سے بے نیاز تھا۔ آنسو تھے اور بے ربط معذرتیں۔ غالباً وہ اپنی ملاقات کے وقت سے کئی گھنٹے دیر سے پہنچا تھا۔ پھر وہ دونوں آہستہ چلتے ہوئے بھیڑ میں گم ہو گئے۔ میں نے منہ موڑ لیا۔ میرا دل غصے اور مایوسی کے احساسات سے بوجھل ہو گیا تھا۔ گویا میرے اور ہجوم سے بھری سڑک کے درمیان کوئی پردہ آ گیا ہو۔ میں جدھر قدم اٹھے، چل دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے خود کو ایک ایونیو پر پایا جہاں کچھ فاصلے پر برانڈنبرگ گیٹ کا عظیم الشان خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کافی دیر سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ میں ایک اعلیٰ کھانوں کی دکان پر رکا اور اپنے لیے دو بڑے گوشت کے پارچے اور دو میٹھے بن خریدے اور واپس فراؤ کامار کے بورڈنگ ہاؤس کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

جب میں نے پچھلا دروازہ کھولا تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اگرچہ کمروں سے آوازیں اور روشنی کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں لیکن کہیں کوئی حرکت نہیں تھی۔ باورچی خانے میں گیس کی مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کے تیل والا کیروسین کا کنستر اٹھا کر اوپر لے گیا۔ وہ خوش قسمتی سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ گیس لائٹ نے زینے کو روشن کر رکھا تھا اس لیے مجھے تالا کھولنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں نے تیل ڈال کر لیمپ روشن کیا پھر دروازہ بند کر کے پردے کھینچے اور بیسن سے ہاتھ منہ دھویا اور ایک نرم کرسی پر بیٹھ کر اپنا "مال" گننا شروع کیا۔ جب میں نوٹ گن

یا تھا تو آئینے میں مجھے اپنا پُرجوش چہرہ جھلکتا نظر آیا۔ پانچ ہفتے کے کام کے چار ہزار مارک، نا قابلِ یقین رقم تھی۔ اب میں موجودہ جمع پونجی سے کئی مہینے آرام سے گزار سکتا تھا، اپنے تعلیمی کام پر پوری توجہ دے سکتا تھا، رہائش اور خوراک کے اخراجات کی فکر کیے بغیر۔ شاید میں کسی رومانوی مہم کے لیے بھی وقت نکال سکوں۔ وہ لڑکی جو گلی میں مجھے نظر آئی تھی، اس کا پیارا چہرہ میرے ذہن سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ میں نے نوٹ اپنے چمڑے کے والٹ میں چھپا دیے۔ پھر میں نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا اور بستر کے کنارے پر آرام سے بیٹھ گیا۔ میرے ذہن میں خیالات گردش کر رہے تھے۔ قریب کے گھنٹا گھر سے بارہ بجنے کی آواز آئی تو میری توجہ ہٹ گئی۔ میں نے جلدی سے کپڑے بدلے، لیمپ بجھایا اور کمبل کے اندر گھس گیا۔ کچھ دیر بعد میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

آج صبح پہلی بار میں نے فراؤ مائر کے دسترخوان پر ناشتا کرنے کا رسک لیا اور دوبارہ اس تجربے سے توبہ کر لی۔ میں نے کم ہی ایسے خستہ حال اور بدمزاج مکینوں کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔ میز کے درمیان ایک بڑے پیالے سے شوربے جیسی چیز بہہ رہی تھی۔ میز پر میلا کچیلا دسترخوان بچھا تھا اور باسی، چکنی بو ایسی تھی کہ پوری زندگی کے لیے بھوک مار دے۔ باسی بن اور کسی میٹھے شربت جیسا مرکب، جسے جام کہا جا رہا تھا۔ اس ناخوشگوار دن کے آغاز سے نمٹتے ہوئے میں نے احتیاط سے اپنے ساتھ کھانے والوں کا جائزہ لیا تو مایوسی ہوئی کیونکہ ان میں ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جو دل کی دھڑکن تیز کر دے یا کم از کم قابلِ توجہ ہو۔

اسی لمحے کمرے میں پتلی سی کافی پیش کی گئی اور میری توجہ وقتی طور پر اپنے ہم نوالہ ساتھیوں کے معائنے سے ہٹ گئی۔ ایک بوڑھا شخص جس کی ڈاڑھی سفید تھی اور کپڑے ماتمی لباس جیسے سیاہ تھے، غالباً شہر کے مشہور میوزیم میں کام کرتا تھا، دو غیر معمولی درجے کے سرکاری ملازم کسی وزارت میں، ایک خستہ حال لیکن فوجی طرز پر سیدھی کمر والا شخص، جس کے کوٹ کے بٹن ہول میں کسی اعزازی فوجی تمغے کی ربن لگی ہوئی تھی۔ جب اسے مخاطب کیا جاتا تو اسے "ہیر ہاؤپٹ مان" یعنی "مسٹر کیپٹن" کہا جاتا تھا۔ ایک بیوقوف، خود پر فخر کرنے والا، بیکار سا بوڑھا فوجی جو پورے اعتماد سے میز پر بیٹھا سب کو پرانی جنگوں کی کہانیاں سنا رہا تھا، جن میں بظاہر اس نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ مجھے اس پر شک تھا۔ ایسے لوگوں کو دنیا سے مٹا دینا چاہیے۔ جنگ کے زمانے میں بھی یہ بیکار ہوتے ہیں اور عام سپاہیوں کی جانوں کو ضائع کرتے ہیں۔ اس کا لمبا چہرہ اور بے ڈھنگی سفید مونچھیں مجھے سخت کراہت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ چند لڑکیاں بھی وہاں موجود تھیں لیکن ان میں کوئی بھی قابلِ توجہ نہیں تھی۔

ان خیالات سے میری توجہ ایک بار پھر اس لڑکی کی طرف چلی گئی جسے کل کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ شاید آج وہ دوبارہ نظر آ جائے۔ کون جانے؟ وہ لڑکی پھر یہاں میری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں اس کے خیال میں ہی آیا۔ بطور نئے کرایہ دار کے، میں ان کے لیے دلچسپی کا باعث تھا مگر مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ آئندہ میں ان کمینوں کی اجتماعی، شام یا دوپہر کے کھانے کی محفلوں کا حصہ نہیں بنوں گا۔ میں باہر کھاؤں گا۔ اب میں اس کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ میرا ایک چست بدن جو تنگ ہوتا جا رہا ہے، اسی بات کا ثبوت ہے۔ کوئی بوڑھا بھی فضول دلچسپی سے وقتاً فوقتاً میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن میں اس کی توجہ سے بچتا رہا۔ آخر اس نے مجھ میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ پھر جیسے ہی موقع ملا، میں جان چھڑانے کے لیے باہر نکل آیا، جہاں ہوا کچھ صاف تھی اور دھندلے سورج کی کرنیں فٹ پاتھوں پر پڑ کر انہیں سنہری بنا رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے زندگی دوبارہ میری رگوں میں دوڑنے لگی ہو۔ آخر کار ایک معروف ریستوران کے باغیچے میں بیئر کا ایک گلاس میری طبیعت بحال کر گیا اور ناشتے کے اس کڑوے ذائقے کو میرے حلق سے دھو ڈالا۔

میں کچھ دیر وہیں بیٹھا ادھر ادھر لوگوں کو دیکھتا رہا، جیسے وقت گزار رہا ہوں لیکن حقیقت میں میرے پیشِ نظر ایک واضح مقصد تھا۔ میں اس لڑکی کو نہیں بھولا تھا اور میری نظریں اس کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں لیکن اس جگہ پر گزرا ایک گھنٹا جہاں بے فکری سے خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور بے مقصد باتیں ہو رہی تھیں، مکمل طور پر ضائع گیا۔ یا تو وہ ابھی یہاں تک آئی نہ تھی یا میری نظروں سے چھپی ہوئی تھی۔ بہر حال، صورتِ حال اتنی ہی خراب تھی جتنا کہ فراؤ مائر کا بورڈنگ ہاؤس۔ کبھی کبھی میری تلاش کی بظاہر بے ثمری مجھے مایوسی کی حد تک لے جاتی تھی اور سچ کہوں تو میں کام کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے پاس مناسب اوزار نہیں تھے۔ مجھے اپنے پچھلے اوزار کولون کے باہر ایک ویران کنوئیں میں پھینکنے پڑے تھے، جہاں میں دوبارہ نہیں جا سکتا تھا۔ ڈسلڈورف تو اور بھی بدتر نکلا۔ وہاں مجھے اپنے معیار پر پوری اترتی کوئی چیز نہیں ملی۔ صرف برلن وہ شہر تھا جہاں مجھے کچھ امید تھی۔ وہ لڑکی یا اگر قسمت نے ساتھ دیا تو لڑکیاں، اور وہ اوزار جن کی تلاش میں، میں یہاں آیا ہوں۔

یقیناً میں اپنا مقصد حاصل کرلوں گا اور میرا نام دنیا بھر میں گونجے گا۔

پھر میں نے دیکھا کہ ویٹر میرے اردگرد اُمید بھری نظروں سے منڈلا رہا ہے۔ میں نے ایک اور مگ کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ واپس آیا اور مگ میز پر رکھ کر پلٹا تو میں نے اس کے کندھے کے پیچھے ایک مانوس شکل کو باغ کی طرف جانے والی محراب کے نیچے سے گزرتے دیکھا لیکن جب اس کا چہرہ نظر آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر ہوں۔ میں نے غصے میں آکر مگ اتنی زور سے میز پر رکھا کہ ساتھ والی میز پر بیٹھی ایک بوڑھی خاتون چونک کر پیچھے دیکھنے لگی۔ کل جس لڑکی کا میں پیچھا کر رہا تھا، وہ میرے لیے ایک جنون بنتی جا رہی تھی۔ نہیں، مجھے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانا ہوگا۔ میں نے خود کو سنبھالا۔

پھر میں اٹھ کر باہر نکلا اور شہر کے عجائب گھر میں چند گھنٹے گزارے، جہاں میں کچھ غیر معروف فنکاروں کی عجیب و غریب تصویروں سے مسحور ہو گیا۔ میں نے سوچا قرونِ وسطیٰ میں زندگی کتنی شاندار رہی ہوگی۔ آپ جو چاہتے کرتے، سوائے اس کے کہ آپ ایک کسان نہ پیدا ہوئے ہوں لیکن اگر کسی کی جان لینا یا اسے بخش دینا آپ کے اختیار میں ہو......

ہاں، یقیناً وہ بہت شاندار وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نگران مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا ہے۔ میں فوراً وہاں سے نکل گیا۔ میں کسی کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ میں صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھا، میرا ناخن صاف اور بال اچھی طرح سنورے ہوئے تھے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب میں پرجوش ہوتا ہوں تو میری آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ مجھے آنکھیں نیم بند رکھنا ہوں گی تاکہ غیر ضروری توجہ سے بچا جا سکے۔

اگلا دن بہت شاندار تھا۔ میں نے اسے دوبارہ دیکھا، وہ اسی سڑک پر کسی مکان میں رہتی تھی یا وہاں کام کرتی تھی۔ اس کا نام اینا تھا، کیا خوبصورت نام ہے۔ جب میں نے دوپہر کے کھانے کے بعد اسے ایک معروف سڑک پر اپنی سہیلی کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک سادہ اور عام سی عورت لگ رہی تھی۔ میں ان کے پیچھے دو یا تین راہ گیروں کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ میں نے ان کی بات چیت کے کچھ حصے سنے۔ ظاہر ہے، وہ دونوں گہری سہیلیاں تھیں اور ایک دوسرے کی کمر کے گرد بازو ڈالے چل رہی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ مارکیٹ کے قریب میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ میں واپس ریستوران کے باغ میں آگیا جہاں میں نے دکھ کے مداوے کے لیے کچھ شراب منگوائی اور اردگرد کی میزوں پر بیٹھے لوگوں اور آنے جانے والوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے جو مجھے کبھی بور نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے ویٹر نے مجھے نوٹ کر لیا۔ میں کبھی کبھار ایک دھار والے چاقو سے اپنے ناخن تراشتا ہوں۔ چاقو کافی بڑا اور تیز ہے۔ جوں ہی اس کی نظر چاقو پر پڑی، اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ میں پریشان ہو گیا لیکن میں نے بے پروائی سے چاقو واپس رکھ لیا۔ جب میری انگلیاں میز کے کنارے سے ٹکرائیں تو وہ کانپ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ ریستوران کے اندر گیا، میں نے شراب کا باقی ماندہ حصہ ختم کیا اور باغ کے ایک دور دراز کونے میں چلا گیا جہاں دوسرے ویٹر سروس دے رہے تھے، اور مزید شراب منگوائی۔ اب میں ایک ناریل کے درخت کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ میرے اور دوسری میزوں کے درمیان ایک تراشی ہوئی باڑ تھی۔ اچانک کہیں سے ایک فوجی بینڈ کی آواز آنے لگی۔ کوئی پرانی واکس نما دُھن بجا رہا تھا اور فضا پھولوں کی خوشبو سے معطر تھی۔

بینڈ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے اردگرد کے لوگوں میں ایک بڑھتی ہوئی جوش و خروش کی کیفیت کو محسوس کیا۔ آہ! وہ آ گئے آخرکار۔ ہمارا رجمنٹ کا بینڈ، ان کے موسیقار، جو اپنے سرخ نیلے بٹن لگے یونیفارم میں نہایت جاذب نظر لگ رہے تھے۔ ان کے آلات موسیقی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ کیا شاندار منظر تھا۔ میرے رگ و پے میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکیاں مسکرا کر ان موسیقاروں کی جانب اپنے رومال ہلا رہی تھیں۔ جلوس کے آگے ایک سوار سفید گھوڑے پر سوار تھا جسے دیکھ کر میرے ساتھ کھڑے بوڑھے مردوں کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ احتراماً سیدھے کھڑے ہو گئے لیکن میرے اندر جو خوشی کی لہر تھی، وہ آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی۔ ان کے دور ہوتے قدم اور میرے اردگرد موجود ان بوڑھے فوجیوں کی عقیدت مجھے بورڈنگ ہاؤس کے اس سابق سپاہی کی یاد دلا رہی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے آسمان پر بادل چھا گیا ہو، حالانکہ سورج اب بھی چمک رہا تھا۔ جب موسیقی کی آواز دھیرے دھیرے فضا سے معدوم ہو گئی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ایک دن جب میں حسبِ معمول بورڈنگ ہاؤس کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا اور نیم تاریک سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو مجھے اندھیرے میں تختے کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ وہ میرے کمرے

کے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میرے شک نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کی مزید تصدیق اس وقت ہوئی جب میں نے اسے اپنے پیچھے چابیوں کا ایک بڑا گچھا چھپاتے ہوئے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ چابیاں ہی ہیں کیونکہ میں نے پہلے بھی اسے یہ اپنی کمر پر لٹکائے دیکھا تھا۔

جب میں قریب پہنچا تو وہ جھینپ کر مسکرائی۔

"اوہ، آپ آگئے؟ میں آپ کے پاس ہی آرہی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج رات کے بعد کمرے کا کرایہ واجب الادا ہو جائے گا۔"

مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن میں نے خاموشی سے سر ہلایا اور بٹوا نکال کر ایک بڑا نوٹ اسے دے دیا اور کہا۔ "یہ اگلے دو ہفتوں کا کرایہ ہے۔"

اس کے چہرے پر حرص اور خوشی کی ملی جلی کیفیت نظر آئی۔ اس نے کہا کہ جب میں نیچے کھانے کے لیے آؤں تو اس کے کمرے سے رسید لے سکتا ہوں۔ اس کے جملے کے آخر میں ایک ہلکی سی تمسخر کی جھلک تھی، جیسے وہ جانتی ہو کہ میں اس کے نام نہاد کھانوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ میں دھیرے سے مسکرایا اور تب تک انتظار کرتا رہا جب تک وہ اپنے کپڑوں کی کرخت سرسراہٹ کے ساتھ سیڑھیاں اتر نہیں گئی۔ میں نے دروازہ کھول کر چراغ جلایا تو مسکرا دیا۔ چراغ کی ڈھکنی پہلے ہی گرم ہو رہی تھی۔ یعنی وہ کمرے میں آئی تھی۔

میں نے چراغ کی لو دھیمی کی، دروازہ اندر سے بند کیا اور اپنی چیزوں کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ فوراً میری نظر سوٹ کیس پر پڑی جو معمول کی جگہ سے ہلا ہوا تھا۔ میں نے قفل کا معائنہ کیا۔ سب بظاہر ٹھیک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بغیر چابی کے اسے قفل توڑ کر یا چمڑا کاٹ کر ہی کھولا جاسکتا تھا۔ تاہم اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں تھی۔ میں اپنی تمام تحریریں بشمول ڈائری، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔

اگلے دن میں تیار ہو کر باہر نکلا تو دروازے کے کنارے پر احتیاط سے ایک دھاگا چپکا دیا۔ بورڈنگ ہاؤس سے نکلنے سے پہلے میں فراڈاگر کے کمرے کے دروازے پر رک گیا۔ اندر سکوں کی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ اچھل پڑی۔ میز پر سکوں کا ڈھیر اور نوٹ پڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ ایک زنگ آلود ٹن کا ڈبا بھی رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں غصے کی لہر نظر آئی لیکن میں نے نہایت خشک اور بے سکون لہجے میں کہا کہ میں نے دو بار دستک دی تھی۔ وہ میرے جھوٹ پر کچھ ناقابل فہم الفاظ میں بڑبڑائی پھر رسید اور باقی رقم مجھے دے دی۔ میں بٹوا جیب میں رکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر سڑک کی گرد بھری ہوا اندر کے فرنیچر زدہ کمرے کی بہ نسبت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ میں دو گھنٹے تک بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا اور گرد کی رونق، ہوا میں خنکی اور اپنے بالوں کو چھوتی ہلکی ہوا سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میری نظروں سے کوئی بھی دلکش عورت بچ نہیں پا رہی تھی۔ وہ زیادہ تر عام لباس میں نظر آئیں۔ درزی خانے کی لڑکیاں، گھریلو خادمائیں یا فیکٹریوں کی مزدور لیکن کبھی کبھار میری نظر کسی حسین عورت پر جم جاتی تھی جو عمدہ لباس میں، چمکتی آنکھوں اور دلکش چال کے ساتھ گزر رہی ہوتی تھی لیکن میں اپنی پسندیدگی کو مہارت سے چھپا لیتا۔ میں دکان کے شوکیس کو گھورتا رہتا مگر درحقیقت اس خاتون کا عکس دیکھ رہا ہوتا تھا۔ میں اس میں بہت ماہر ہوں اور آج تک کبھی پکڑا نہیں گیا۔ میری نگاہیں اپنا کام کر رہی تھیں لیکن لگتا ہے آج وہ نظر نہیں آئے گی۔ افسوس! کیونکہ میرا دل کہتا ہے کہ اب وقت آچکا ہے کہ میں اس سے تعارف حاصل کروں۔ ظاہر ہے ایک فرضی نام سے۔ میں کسی بھی حال میں اپنی اصل شناخت ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ آج میرا موڈ خلاف معمول خوشگوار تھا اور دل کسی مہم جوئی کی تمنا کر رہا تھا۔

یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس احمق سیلز مین کی بدولت میرے پاس کافی رقم موجود ہے، جس سے کینٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اگر میں اسی طرح خرچ کرتا رہا تو موجودہ رقم بہ آسانی دو ماہ اور نکال دے گی۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں اور ان سادہ لوح مردوں اور عورتوں کا جنہیں قدرت نے میری راہوں میں مسلسل بھیجنا اپنا فریضہ سمجھ رکھا ہے۔ تھوڑی سی امید کے ساتھ میں کیفے میں داخل ہوا کہ شاید اینا وہاں سے گزرے۔ میں نے پہلے ایک بیئر کا آرڈر دیا اور اخبار کی آڑ میں لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی ابتدائی شام تھی۔ وہاں چھ یا سات افراد موجود تھے۔ میں انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی گول ٹوپی پہنے کسی سیاسی مضمون میں غرق تھا۔ میری نظر اس سے ہٹ کر دو باوقار خواتین پر پڑی جو ہال کے کونے میں جوش و خروش سے باتوں میں مصروف تھیں۔ بظاہر وہ ہم جنس پرست لگتی تھیں۔ ان میں سے ایک جوان، خوبصورت سنہری بالوں والی تھی۔ اس نے گہرے گلے کا لباس پہن رکھا تھا، گلے میں چمکدار موتیوں کا ہار بھی تھا۔ یہ موتی نقلی ہیں، مجھے اس چیز کا تجربہ ہے۔ تاہم میں جانتا تھا لباس اور زیور سے خوش ذوقی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی ساتھی جو یقیناً اس کی "شوہر" تھی، اتنی جاذب نظر نہیں تھی۔ وہ دبلی پتلی تیس یا اکتیس برس کی ہوگی۔ اس کے

سیاہ، گھنے بال مردانہ انداز میں کٹے ہوئے تھے۔ اس نے گہرے رنگ کی جیکٹ اور مردوں کے انداز میں سفید ریشمی قمیص اور سرخ ٹائی لگا رکھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں کی انگلیوں میں شادی کے چھلّے بھی ہیں۔ وہ بات کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتی تھیں۔ میں دیر تک انہیں دیکھتا رہا مگر جب ویٹر ان کا آرڈر لینے آیا تو وہ ایک دوسرے سے غافل ہوئیں اور تبھی انہیں میری نظروں کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً رخ دوسری طرف پھیر لیا مگر کبھی کبھار نظر چرا کر ہم جنس پرست خواتین کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

جوں ہی کھانا آیا، میں بغیر کسی تامل کے کھانے میں جت گیا۔ تب ہی ایک چھوٹا سا سانحہ پیش آیا۔ میں بیئر کا گھونٹ لے رہا تھا کہ کھڑکی کے پار ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ مجھے لگا کہ وہ اینا ہے۔ میں یکدم کرسی سے اچھل کر دروازے کی طرف لپکا اور یوں ایک ہلکی سی بھگدڑ مچ گئی۔ جب میں بھیڑ چیر کر باہر پہنچا تب تک وہ غائب ہو چکی تھی۔ مایوس ہو کر میں واپس اپنی نشست پر آ گیا اور ہکا بکا ویٹر کو یقین دلایا کہ میرے اچانک اٹھنے کا کھانے یا خدمت کے معیار سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کچھ ہوا، اس نے مجھے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ کھانے کا باقی لطف جاتا رہا۔ میں نے کھانا اداسی بلکہ خفگی سے مکمل کیا۔

تاہم جب میں نے کافی ختم کی تو میرا موڈ بحال ہو چکا تھا اور میں فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور خود کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، جیسے کوئی تنکا طوفانی لہر میں بہتا ہو۔ یونہی بھٹکتا ہوا میں ایک قریبی ہال میں جا نکلا جہاں اسٹیج پر رنگ برنگی لالٹینوں کے نیچے ایک بینڈ بے حد شاندار موسیقی بجا رہا تھا۔ کنسرٹ ابھی جاری تھا مگر میں تقریباً گیارہ بجے پارک سے نکل گیا۔ جب میں واپس فراؤ مارگر کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا تو وہ پہلے سے زیادہ خستہ حال محسوس ہوا۔ اس رات میں کافی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ میں نے سایہ دار لیمپ کی مدھم روشنی میں ایک بار پھر اپنی رقم گنی اور تسلی کی کہ میرے پاس اب بھی خاصی بچت موجود ہے۔ میں زیرِ لب مسکرایا۔ آخرکار میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہر چیز میں کٹوتی کرتے گزارا تھا اور پچھلا عشرہ تو حقیقی غربت میں بسر ہوا تھا، جب تک کہ میں نے یہ نہ سیکھ لیا کہ اپنی ذہانت اور معاشرے سے وہ وصول کرنا ہے جو درحقیقت میرا حق ہے۔ ابھی میری انا کی راہ ہے، تاہم میں کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا۔ میں نے اینا کو چن لیا تھا لیکن اب وہ میری توقع سے کہیں زیادہ گریز پا معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے کسی اور میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر میں نے ان اداس خیالات کو جھٹکا اور اپنا سوٹ کیس کھولا۔ یہ ذکر کردوں کہ دروازہ کھولنے سے قبل میں نے احتیاط سے اس کا معائنہ کیا تھا اور جو دھاگا میں نے دروازے کی درز پر چپکایا تھا، وہ اب بھی جوں کا توں موجود تھا۔ چنانچہ مجھے سوٹ کیس کی سلامتی پر شک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں کافی دیر تک اس کے مواد کو ترتیب سے دیکھتا رہا۔ نہیں، میں پوری طرح قائل ہو گیا کہ جو کام میں نے اپنے لیے چنے ہیں، ان کو مکمل کرنے کے لیے نئے آلات کی ضرورت ہے۔ البتہ میرے پاس وقت بھی ہے اور رقم بھی کہ جب مناسب موقع آئے، میں یہ انتظام کر سکوں۔ فی الحال میرا ذہن مکمل طور پر اینا کے گرد ہی گھوم رہا تھا۔ جب میں بستر پر لیٹا تب بھی میرے خیالات کا محور وہی تھی۔

☆☆☆

گزشتہ شب میں نے نہایت ہولناک خواب دیکھا۔ میں اب بھی اس کے زیرِ اثر ہوں۔ شاید یہ رات کے کھانے کے وقت طاری ہونے والی اچانک ہیجان انگیزی کا نتیجہ تھا۔ مجھے کبھی کبھار بدہضمی ہو جاتی ہے لیکن اس بار جو منظر میرے خواب میں ابھرا، اس کی دہشت کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ سب کچھ ایک باریک جالی دار پردے سے شروع ہوا جو میرے سامنے لہرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے اینا کا تھکا تھکا شکست خوردہ چہرہ نمایاں ہوا۔ پھر میں نے خود کو دوبارہ فراؤ مارگر کے بورڈنگ ہاؤس میں پایا۔ اس کی گرد آلود اور بے ترتیب راہداریوں میں بھٹکتے ہوئے میں بیت الخلا کی طرف جا رہا تھا۔ بیت الخلا صاف ستھرا تھا، چمک دار سیرامک سے بنا ہوا۔ جب میں اسے استعمال کرنے ہی والا تھا کہ یکایک پانی میں سے ہزاروں پھولی ہوئی سیاہ مکڑیاں نکل آئیں۔ میں چیخنا چاہتا تھا مگر میری زبان تالو سے چپک گئی۔ وہ مکروہ مخلوق فضا میں بلند ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑی، میرے بازوؤں پر رینگنے لگیں، میرے کندھوں پر، میرے بالوں میں، یہاں تک کہ میرے منہ کے اندر بھی۔ اسی لمحے میں دیوانہ ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں کوئی چیز آ گئی۔ شاید جھاڑو، شاید پونچا، جو بھی ہو، میں نے کسی دیوانگی میں اسے اٹھایا اور اندھا دھند جھاڑنے لگا، اپنے بوٹوں اور ہتھیار سے ان مکڑیوں کو کچلنے لگا۔ جب بھی میں انہیں روندتا، ایک کریہہ چٹاخ کی آواز آتی اور فضا میں ایک ناگوار بو پھیل جاتی۔ میں جو ہمیشہ جانوروں اور کیڑوں سے محبت کرنے والا رہا ہوں، اب انہی کو نیست و نابود کر رہا تھا، جنہیں بچانے کو میں نے اپنی زندگی وقف کی تھی اور میری اس وحشت میں اذیت ناک شرمندگی بھی شامل تھی۔ پھر میں ایک جھٹکے سے

جاگ گیا۔ میں نے دیکھا کہ نیم شب کی خاموشی میں کھڑکی کے پیچھے سے تر تھا۔ مجھے لگا جیسے میں چیخا ہوں مگر شاید وہ پوری طرح گھٹی ہوئی سی کراہ تھی جو میرے خمار بھرے ذہن سے نکلی تھی۔ کیونکہ باہر راہداری میں نہ کوئی قدموں کی چاپ سنائی دی، نہ کوئی آوازیں، نہ کوئی ہنگامہ لیکن خواب کی اذیت کی شدت ایسی تھی کہ جب میں جاگا تو دیکھا کہ میرے ہاتھ کی ہتھیلیوں میں میرے ناخنوں کے نشان تھے اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ جب میں نے لیمپ جلایا تو چادروں پر دھبے دکھائی دیے اور میں بھیگا ہوا تولیا لے کر آدھے گھنٹے تک ان دھبوں کو صاف کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ہر نشان مٹ گیا۔ پھر ان دھبوں سے بچاؤ کے لیے میں نے اپنے ہاتھوں پر رومال باندھ لیے۔

صبح میں جاگا تو خود کو بیمار محسوس کر رہا تھا۔ میں کسلمندی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ تیار ہو کر باہر نکل گیا۔ تاہم کیفے میں پہنچ کر میرے دل کی کیفیت اینا کی جھلک دیکھ کر پھر خوشگواری میں بدل گئی۔ بے شک وہ وہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی، کیونکہ جب وہ اس کیفے کی کھڑکی کے سامنے سے گزری تو کسی کے ساتھ باتوں میں مگن تھی۔ میں نے بل ادا کیا، کافی کا آخری گھونٹ بھرا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ایک خواتین کے لباس تیار کرنے والی ورکشاپ کے پچھلے دروازے سے اندر گئیں۔ اگلے دروازے کے ایک طرف نصب جس کی تختی پر شام کو بند ہونے کا وقت درج تھا۔ دونوں لڑکیوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے گتے کے ڈبے تھے جن پر اس ورکشاپ کا نام درج تھا۔ بلاشبہ وہ آرڈر پہنچا رہی تھیں۔ یہ میرے لیے بہت بڑی خوش نصیبی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شام کو درج شدہ وقت پر وہاں موجود ہوں گا۔ البتہ میرے پاس اب بھی سات گھنٹے باقی تھے۔ میں نے سوچا، کیوں نہ دیر سے دوپہر کا کھانا کھایا جائے تاکہ دن طویل محسوس نہ ہو۔ میں ادھر ادھر گھومتا ایک مصروف سڑک پر نکل آیا۔ ایک دیلی گلی پر ایک حیران کن اور عجیب و غریب پرانے کتب فروش کی دکان میری منتظر تھی۔ میں نے وہاں ایک پرانی کتاب دریافت کی، جس کا عنوان تھا "درد کی لذتیں" ایک گمنام مترجم حسن عالم کی شائع کردہ تھی۔ میں اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا اور فیصلہ کیا کہ اس میں سے چونکا دینے والے اقتباسات نقل کر لوں۔ میں نے وہ کتاب عارضی طور پر ادھار لے لی کیونکہ دکاندار دیگر گاہکوں میں گھرا ہوا تھا۔ میں اسے اپنی جیکٹ کے پیچھے دبا کر خاموشی سے کھسک آیا تاکہ سکون سے پڑھ سکوں۔

سے بڑے مذبح خانے میں ملازم تھا۔ چونکہ ابا سے ملنے میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے ٹیکسی لی اور مذبح خانے کا رخ کیا۔ میرا واقف میری آمد پر کچھ حیران ضرور ہوا مگر فوراً میری خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، مجھے جانوروں پر ظلم سے گھن آتی ہے لیکن میں قصائیوں کو کام کرنے کے طریقہ کار میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ وہ مجھے ایک فولادی گیلری پر لے گیا جو مرکزی مذبح خانے کے اوپر واقع تھی، جہاں کھال اتری ہوئی لاشیں زنجیروں سے لٹکی ہوئی تھیں اور کچھ دراز قامت افراد خون آلود ایپرن پہنے کلہاڑیاں اور نہایت تیز چھریاں استعمال کرتے ہوئے مہارت سے انہیں کاٹ رہے تھے۔ میں ان کی مہارت پر مسحور ہو گیا اور ان کی فنکاری میں محو۔ مجھے کسی جادو کے زیر اثر تقریباً آدھے گھنٹے تک وہیں کھڑا رہا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شام کو اسے دو تین پیگ شراب کے پیش کروں گا۔ پھر نہایت ادب سے جھک کر رخصت ہوا۔ واپسی پر میں شہر کے وسط میں ایک کھلونوں کی دکان پر رکا جہاں میں نے کچھ مخصوص شکل و صورت والی گڑیاں خریدیں۔ باہر نکل کر مجھے بھوک کا احساس ہوا تو میں نے قریب ہی کے ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں ایک طرف مڑ گیا اور ایک تنگ گلی میں جا نکلا جہاں مختلف دکانیں تھیں۔

کچھ دور چل کر میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔ میرے سامنے وہ دکان تھی جسے میں مدت سے تلاش کر رہا تھا۔ چمکتے ہوئے چاقوؤں کی جھلملاہٹ درختوں کی چھن چھن کر آتی دھوپ میں شیشوں کی طرح منعکس ہو رہی تھی۔

یہ ایک طبی آلات کی دکان تھی جہاں ہر وہ چیز فروخت ہو رہی تھی جو کسی سرجن کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ شیشے کی الماریاں ہر قسم کے آلات سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا؟ کیا میں کسی زمانے میں طب کا طالب علم نہیں تھا؟ اس سانحے سے قبل جو میرے تعلیمی سفر کا اختتام بنا، اور ظاہر ہے میں یہ کردار بخوبی نبھا سکتا تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ میں خاصا معزز اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا اور وہ تمام لیکچرز جو میں نے سنے تھے، وہ بھی یاد آ رہے تھے۔ میں نے سرجری کو چنا، اگرچہ اس میں مہارت حاصل کرنے سے پہلے ایک طبی سند حاصل کرنا لازم تھا۔

میں دکان میں داخل ہو گیا۔ وہاں کی فضا میں دواؤں اور کیمیکلز کی وہ مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی جو اسپتالوں کی پہچان ہوتی ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ بے ساختہ ایک ڈاکٹر کے پیچھے سے جو نوجوان سیلز مین نمودار ہوا، وہ خود بھی اتنا ہی

مجھے کیا ہوا لگ رہا تھا جتنا کہ میں۔ یہ بات میرے لیے باعث تسلی تھی۔ میں نے اطمینان سے اپنی ضرورت بیان کی۔ وہ مجھے ایک طویل راہداری میں لے گیا جہاں کھلے میں رکھے گئے سرجیکل آلات قطار در قطار سجے تھے۔ باریک چاقو، لمبے لانسیٹس اور کچھ بڑے اوزار جو بڑے کاموں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ میں نے جلدی اور اعتماد سے پانچ اوزار منتخب کیے اور دکاندار کی پیشہ ورانہ اصطلاحات پر محض مسکرا دیا۔ ادائیگی کے بعد رسید حاصل کی اور شادمانی سے بھرپور دل کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اب راستہ میرے سامنے بالکل واضح تھا۔ یقیناً میں نے جعلی نام اور پتا دیا تھا اور دکاندار نے مجھ سے کوئی شناخت طلب نہیں کی تھی۔ مجھے رتی برابر شک نہ تھا کہ مجھے تلاش کرنا ناممکن ہوگا۔

اپنے کمرے میں واپس آکر میں نے اپنی نئی خریداری کو نہایت احتیاط سے ترتیب دیا۔ کیا ہی دلکش منظر تھا۔ شیشے کی بالائی کھڑکیوں سے آتی ہلکی سورج کی کرنوں میں وہ نئے اوزار چمک رہے تھے۔ میں انہیں دیر تک دیکھتا اور سراہتا رہا، پھر نہایت احتیاط سے انہیں دھویا اور صاف کیا۔ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا کہ اعلیٰ ترین جراحی کے آلات بھی اپنی چمک کھو دیتے ہیں، اگر ان کی باریک دھار پر کوئی فالتو چیز چپک جائے۔ مثلاً گرد، ریت یا گوز کا ریشہ۔ ہر چیز کو مکمل ترتیب سے رکھنے کے بعد میں نے گڑیاؤں کو میز پر بچھا دیا۔ ان کے لباس میں پہلے ہی اتار چکا تھا۔ یقیناً وہ مذبح خانے میں لٹکی لاشوں جیسی نہیں تھیں اور زندہ لڑکیوں سے مشابہت بھی صرف ایک خام خیال تھا لیکن کچھ مشابہت تو تھی، بس یہی کافی تھی۔ میں خاموشی اور نہایت انہماک کے ساتھ ان کا تشریحی تجزیہ کرنے لگا۔ میری مہارت ابھی باقی تھی۔ جلد ہی فرش پر برادہ، شیشے کی آنکھیں اور جوڑوں سے الگ کیے گئے ہاتھوں کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ ان ماڈلز میں چکنی مٹی (پورسلین) بہت زیادہ ہے۔ میں اپنے اوزاروں کی دھار ان پر کند کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے عمل میں ویسا نہیں ہوگا جیسا اصل میں ہونا چاہیے مگر فی الحال یہ کافی تھا۔ جب میں نے کمرا صاف کرلیا اور سارا کچرا اس ریپنگ پیپر میں لپیٹ دیا جس میں دکاندار نے میری چیزیں پیک کی تھیں تو ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوا۔ پھر میں نے اپنے موجودہ کام کے لیے درکار اوزار چنے اور باقی کو احتیاط سے بند کردیا۔ منتخب کیے ہوئے آلات کو ایک چمڑے کے ایپرن میں رکھا جو کوٹ اور جیکٹ کے نیچے میری کمر سے بندھا تھا اور سرائے سے نکل گیا۔

☆☆☆

پچھلے چند گھنٹے گویا کسی خواب یا بے خودی میں گزرے تھے اور مجھے احساس تک نہیں تھا کہ میرے قدم مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ ابھی ایلا سے میری ملاقات میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ چنانچہ میں اس سمت میں جہاں سے وہ ہر روز گزرتی تھی، ایک خالی دہلیز پر جا کھڑا ہوا۔ جلد ہی وہ آتی نظر آئی۔ میں اس سے جا ملا۔ وہ مجھے دیکھ کر بظاہر حیران ہوئی مگر میں نے خود کو متعارف کرایا اور اسے یاد دلایا کہ ہم کہاں ملے تھے۔ ہم کچھ دیر بات کرتے رہے۔ پھر میں اسے دو عمارتوں کے بیچ ایک تنگ گلی میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد میں ایک عجب سرشاری کے عالم میں وہاں سے نمودار ہوا اور بورڈنگ ہاؤس کی راہ لی۔

اس رات میں نے پھر ایک ہولناک خواب دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں اور وہاں خون کی بارش ہو رہی ہے۔ میں برہنہ کھڑا ہوں اور چھت سے سرخ بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ میں نے آئینے میں دیکھا، وہ بوندیں میری چھاتی پر بہہ رہی تھیں۔ میں چیخ اٹھا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ میں سو نہیں رہا تھا۔ میں خود کو بھیگا ہوا اور چپچپا محسوس کر رہا تھا۔ خوف نے شدت اختیار کرلی تھی۔ میں بڑی مشکل سے بستر سے نکلا اور چراغ جلایا۔ میں اس قدر حواس باختہ تھا کہ آنکھیں کھول نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا جسم خون میں لت پت ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ صرف پسینا چہرے اور بدن سے بہتا ہوا شب خوابی کے لباس کو تر کر رہا تھا۔ نجات کا احساس اتنا شدید تھا کہ میں فرش پر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔ مجھے سردی لگنے لگی تھی اور دانت بج رہے تھے۔ میں دبے قدموں دروازے تک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ ہر طرف مکمل سناٹا تھا، گویا میری بھیانک چیخ کسی نے نہیں سنی تھی۔ شاید وہ ایک خاموش چیخ تھی۔ ایک ایسی چیخ جو صرف میرے اندر گونجی تھی۔ میں نے شکر ادا کیا اور واپس بستر پر چلا گیا۔ میں بے چین نیند سویا۔

اگلی صبح کچھ غیر معمولی تھی۔ گلی میں شور اور باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی اور کرسی پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکا۔ نیچے لوگوں کا ہجوم تھا، جیسے کوئی سانحہ پیش آگیا ہو۔ اچانک ایک ایمبولینس تیزی سے گزری۔ لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں کھڑکی کھلی چھوڑ کر اپنی تیاری مکمل کرنے لگا۔ میں نے جب دوبارہ جھانکا تو بھیڑ چھٹ چکی تھی، گلی نے اپنی معمول کی خاموشی اوڑھ لی تھی۔ جب میں دروازہ باہر سے بند کرنے لگا تو اچانک ایک چپچپی سی چیز انگلیوں پر محسوس ہوئی۔ میرے ہاتھ پر سرخ کچھ لگا تھا۔ یہ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ خوش قسمتی سے راہداری میں کوئی نہیں تھا۔

ابھی ناشتے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ میں تیزی سے اندر گیا اور رومال پانی میں بھگو کر ہینڈل صاف کرنے لگا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بخار چڑھ گیا ہے۔ آخر میں نے راہداری میں جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے رومال ٹھنڈے پانی سے دھو دیا۔ یہاں تک کہ خون کا ہر نشان مٹ گیا۔ زینہ اترتے وقت میں ہر قدم پر غور کر رہا تھا۔ میں باہر نکلا اور اسی ریستوران کے باغ میں جا بیٹھا جہاں اکثر جاتا تھا۔ میں نے کافی اور رولز کا آرڈر دیا۔ ابھی شراب پینے کا وقت نہیں، مجھے دماغ صاف رکھنا تھا۔

ویٹر ایک باتونی آدمی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی خبر سنانے کے لیے بے تاب ہے مگر میری خاموشی نے اسے روک دیا۔ کچھ دیر بعد وہ برابر کی میز پر بیٹھے جوڑے کا آرڈر لینے گیا تو میں نے ان کی گفتگو کے بیشتر حصے سنے۔ پتا چلا کہ پڑوس کی گلی میں ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔ کہا جا رہا تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ اچانک میرے اندر ایک عجیب سی گھبراہٹ سر اٹھانے لگی۔ اتنی کہ میں تقریباً بل دیے بغیر اٹھنے والا تھا۔ ویٹر کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بل لے آیا۔ میں کرسی پر دھنس گیا۔ اعصاب قابو میں نہیں آ رہے تھے، زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

ویٹر نے تجسس بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”آپ خیریت سے ہیں؟“

میں جانتا تھا، وہ نیک نیتی سے پوچھ رہا ہے۔ لہٰذا میں نے خود پر قابو پایا اور شکریہ ادا کیا مگر میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے معمول سے کہیں زیادہ رقم دے دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا، آہستہ سے کچھ بڑبڑایا اور دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں اپنے خیالات سمیٹتے ہوئے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے کیفے سے نکل آیا۔ خوش قسمتی سے سامنے ہی ایک چھوٹا پارک تھا۔ میں نے سڑک پار کی اور دھوپ کی مدھم کرنوں میں ایک خالی بینچ ڈھونڈ نکالی۔ بہت دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا۔ ٹھنڈی ہوا میرے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ حواس بحال ہونے لگے۔ جب میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر ہو گئی تھی۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کتنے گھنٹے گزر چکے ہیں مگر اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹائی سیدھی کی، کپڑوں کی گرد جھاڑی اور ایک عمدہ ریستوران کا رخ کیا جہاں میں نے اطمینان سے خوب ڈٹ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی مگر مجھے فراؤ ماگر کے بورڈنگ ہاؤس لوٹنے میں ایک عجیب سی کراہت محسوس ہو رہی تھی۔

چنانچہ میں چڑیا گھر چلا گیا اور وہ گھنٹے وہاں گزارے۔ وہاں بڑے درندوں کو گوشت کے بھاری ٹکڑے کھلائے جا رہے تھے۔ ان کی غراہٹیں اتنی پرزور تھیں کہ ننھی چڑیوں کی چہچہاہٹ کو دبا رہی تھیں۔ جب میں باہر نکلا تو باہر کا ذہن کا شور، گھوڑوں کے سموں کی آوازیں اور لوہے کے پہیوں کی کھنک سے سڑک گونج رہی تھی۔ میں گھر لوٹ گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دھوپ لمبے سائے رینگ رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور آہستگی سے زینے چڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ فراؤ ماگر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اندر سے پتلی روشنی کی لکیر راہداری میں پڑ رہی ہے۔ میرے قدموں کی چاپ سنتے ہی وہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے بتایا کہ ایک آدمی آیا تھا جس نے تمام مکینوں سے پوچھ گچھ کی تھی۔ میں نے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔ فراؤ ماگر نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”اس کا کہنا تھا کہ یہ ضابطے کی کارروائی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟“

اس نے پھر کندھے اچکائے اور بولی۔ ”عام سا، ادھیڑ عمر کا آدمی، کالے چمڑے کے کوٹ میں، سبز فلیٹ ہیٹ پہنے ہوئے۔ وہ کہہ رہا تھا انٹرویو مکمل کرنے کل دوبارہ آئے گا۔“

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، پولیس کا آدمی۔ میں اس نسل کو خوب پہچانتا ہوں۔ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے پر الجھن کے آثار نہ ابھریں مگر فراؤ ماگر کے چہرے پر لیمپ کی مدھم روشنی میں کوئی تاثر نہ تھا۔ میں نے کہا کہ میں کل دوپہر کے بعد گھر پر ہی رہوں گا۔ یہ سن کر وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ وہ واپس مڑی اور دروازہ بند کر لیا۔

میں زینے چڑھ گیا۔ دل میں گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ آیا اس نے کسی کے کمرے کی تلاشی بھی لی تھی؟ اب نیچے جا کر پوچھنا شک کو جنم دیتا۔ خوش قسمتی سے میرے کمرے میں تلاشی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میں جانتا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ میں نے رقم دوبارہ گنی اور تیاری شروع کر دی۔ میں نے بستر کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا پھر کمرے میں بکھری تمام اشیا سمیٹ کر اس میں رکھ لیں۔ پھر چراغ بجھا دیا اور نیم تاریکی میں دھڑکتے دل کے ساتھ خاموش بیٹھ گیا۔ ایک زخمی، تعاقب زدہ جانور کے مانند۔ یہاں تک کہ نیچے کھانے کے لیے گھنٹی کی آواز سنائی دی، پھر ان بدنما کمینوں کے بھاری، گھسٹتے قدم سنائی دیے جو طعام گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

urdunovels.com

جب میں اٹھا۔ آخری بار کمرے کا جائزہ لیا کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ خصوصاً میرے تحریری نوٹس، جو سب سے زیادہ اہم تھے۔ میں نے کوٹ پہنا، چابی میز پر رکھی اور آہستگی سے دروازہ بند کرکے سیڑھیاں اتر گیا۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور تاریکی میں باہر نکل گیا۔ اب سڑک پر چند ہی راہ گیر نظر آرہے تھے۔ میں نے قدم تیز کرلیے۔ ذرا سی تاخیر تباہی لا سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ رات ریلوے اسٹیشن پر گزاروں گا۔ کل کا پروگرام میرے ذہن میں بالکل واضح تھا۔

☆☆☆

چند دن بعد میں لندن میں تھا۔ شہر حد درجہ گندا اور پرانا معلوم ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ سال کے اس حصے میں بھی دھند اور نمی میں ڈوبا تھا، جسے کارخانوں اور گھروں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں اور بھی ناقابلِ برداشت بنا رہا تھا۔ میں نے ایک تنگ گلی میں واقع سستی رہائش گاہ میں قیام کیا۔ یہ جگہ تقریباً فرا ڈی ماگر کے مکان کی نقل تھی۔ البتہ کھانے کا معیار اس سے بھی بدتر تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر میں نے چند یورپی اخبارات پر سرسری نگاہ ڈالی مگر خوش قسمتی سے وہاں کچھ نہ تھا۔ یہ بات میرے لیے راحت کا باعث تھی۔ میں نے مارک، پونڈز میں تبدیل کرائے۔ شرحِ تبادلہ دیکھ کر مجھے غصہ آیا مگر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ خوش قسمتی سے میں بحفاظت یہاں پہنچ گیا تھا۔ نہ ٹرین میں، نہ کیلیز (شہر کا نام) میں، نہ ہی جہاز پر مجھے کسی پر مشتبہ شخص کا احساس ہوا۔ خاص طور پر ڈوور پر اترتے وقت میں نے پوری احتیاط برتی مگر وہاں بھی اور لندن کی ٹرین پر بھی کسی تعاقب کی کوئی علامت نہ ملی۔ یہ احساس کہ میں واقعی محفوظ ہوں، میرے دل پر سے ایک بڑا بوجھ اتار گیا تھا۔

اب میں نے اپنا نیا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔ دوسرے شہر کے ہوٹلوں اور بورڈنگ ہاؤس کے برعکس انگلینڈ میں کوئی خطرناک قاعدہ نہیں کہ مہمانوں کو پولیس کے ہاں رجسٹر کروایا جائے۔ میرا کمرا نہایت محفوظ ہے، دروازے پر مضبوط تالا اور دو کھڑکیاں ہیں جو میرے مقاصد کے لیے بالکل موزوں ہیں۔ پہلی شام ہی میں نے اپنے اوزار نکالے اور یہاں پہلے عظیم کارنامے کی تیاری کے لیے انہیں دھویا اور چمکایا۔ ایک ایسا کارنامہ جو فوراً ہی مجھے نامور لوگوں کی صف میں کھڑا کردے گا۔ کتنی دلکش چمک ہے ان چمکتے ہوئے پھلوں میں۔ کمرا روشن ہے، اگرچہ موسم صاف نہیں،

کیونکہ کمرے کی کھڑکی سے دریائے ٹیمز کا گدلا بھورا پانی دکھائی دے رہا ہے اور کنارے کی سڑک پر گاڑیوں کا شور میرے خیالات کو منتشر کردیتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہورہا ہے جیسے میں تقدیر کا ہاتھ تھامے چل رہا ہوں۔ آج رات میں ان اوزاروں کا انتخاب کروں گا جو میرے کام کے ہوں، باقیوں کو قفل میں بند کردوں گا۔ میں نے ہر احتیاط برتی ہے۔ رستے نے ایک دور ہارڈ ویئر اسٹور سے خریدے ہیں، عام سا لباس پہنتا ہوں۔ تاہم میرا خیال ہے کوئی مجھ پر توجہ نہیں دے رہا۔ موسم اتنا خراب ہے لیکن یہ انگلینڈ ہے۔ ایک حقیقت جسے میں اکثر بھول جاتا ہوں۔ میرے مقصد کے لیے یہ ملک بہترین ہے۔ میں کھڑکی کے پاس نیم تاریکی میں بیٹھا اندھیرا ہونے کا انتظار کررہا ہوں۔ یہاں کی بلندیوں پر رات دیر سے اترتی ہے۔ جب میں اپنے کمرے سے نکلا تو تقریباً دس بج چکے تھے اور دھند میں لپٹے گیس لیمپ کنارے پر ایسے جھلملا رہے تھے جیسے خوابوں کے بھوت ہوں۔ کل ہی میں نے ایک بریف کیس خریدا ہے جو بالکل ویسا ہے جیسا غریب کلرک اٹھائے پھرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے موسم میں کوئی مجھ پر دھیان نہیں دے گا۔ میں نے یہاں دو تین لوگوں سے اور قریب کے اسٹیشن پر بات کی اور کچھ نہایت اہم معلومات حاصل کیں۔ میں نے کمرے پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور اپنی عظیم مہم پر نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔ پھر میں نے میز کے اوپر لٹکے میلے کیلنڈر پر ایک چھوٹی سی علامت لگائی۔ آج چھ اگست 1888ء ہے۔

جب میں نے مرکزی دروازہ کھولا جو رات بھر کھلا رہتا ہے، تو کوئی میری جانب متوجہ نہیں ہوا۔ میں اندھیری سڑک پر گزرتے لوگوں میں گم ہوجاتا ہوں۔ بریف کیس میں رکھے اوزار مدھم سی جھنکار پیدا کررہے ہیں۔ چمکتی ہوئی دھاریں، حتیٰ کہ تاریکی میں بھی مگر آئندہ انہیں کپڑے میں لپیٹنا ہوگا تاکہ آواز نہ ہو۔ میں بڑھتی تاریکی میں مشرق کی سمت قدم بڑھاتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں میں جارہا ہوں، وہاں طوائفوں کی بہتات ہے اور کسی نے مجھے وہ جگہ بتائی ہے جہاں سے میں بھی لے سکتا ہوں، جو مجھے واپس وائٹ چیپل پہنچادے گی۔

(وائٹ چیپل، لندن کا وہ علاقہ ہے جہاں 1888ء سے 1889ء کے دوران ایک نامعلوم قاتل جو بعد میں "جیک دی ریپر" کہلایا، نے چھ طوائفوں کو نہایت سفاکی سے قتل اور ان کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا)

✖✖✖

UrduPdfs.com

سفید موتیا اور سرخ گلابوں کے گجرے ہاتھوں میں لیے وہ کم عمر سا لڑکا بڑی کاروں کے آگے پیچھے گھوم رہا تھا کہ شاید کوئی صاحب اپنی بیوی یا محبوبہ کے لیے کچھ کنگن یا گجرے لے لے۔

کافی دیر سے ٹریفک جام تھا۔ بس میں کھڑی نگین کی نظریں اس لڑکے اور اس کے ہاتھوں میں موجود پھولوں پر تھیں۔ پھول جو خوبصورتی اور پاکیزگی کی علامت ہوتے ہیں، جو پیار اور محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہیں، جو ایک بہترین تحفہ سمجھے جاتے ہیں، جو نگاہوں کو سکون اور تازگی بخشتے ہیں۔ پھولوں کی تعریف میں جتنے بھی الفاظ استعمال کیے جائیں، وہ کم ہیں مگر......

نگین جسے پھولوں اور ان گجروں کو دیکھ کر کراہیت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اسے گھن آتی تھی پھولوں سے، ان کی خوشبو سے۔

اپنے ماضی سے خائف ایک خوبصورت لڑکی کی پریشانی

کہتے ہیں کہ انسان کا ماضی اس کا پیچھا کرتا ہے... یہاں بھی ایسا ہی تھا... وہ بھی گناہوں کی دلدل سے نکل کر ایک باعزت زندگی جی رہی تھی... مگر گزرا کل اور اس سے جڑے لوگوں کا خوف ہمہ وقت اسے ہراساں رکھتا... اسی گھبراہٹ میں اس نے ایسا عمل کر دیا جس کا مداوا ناممکن تھا۔

سفید چھڑی

صائمہ دانش

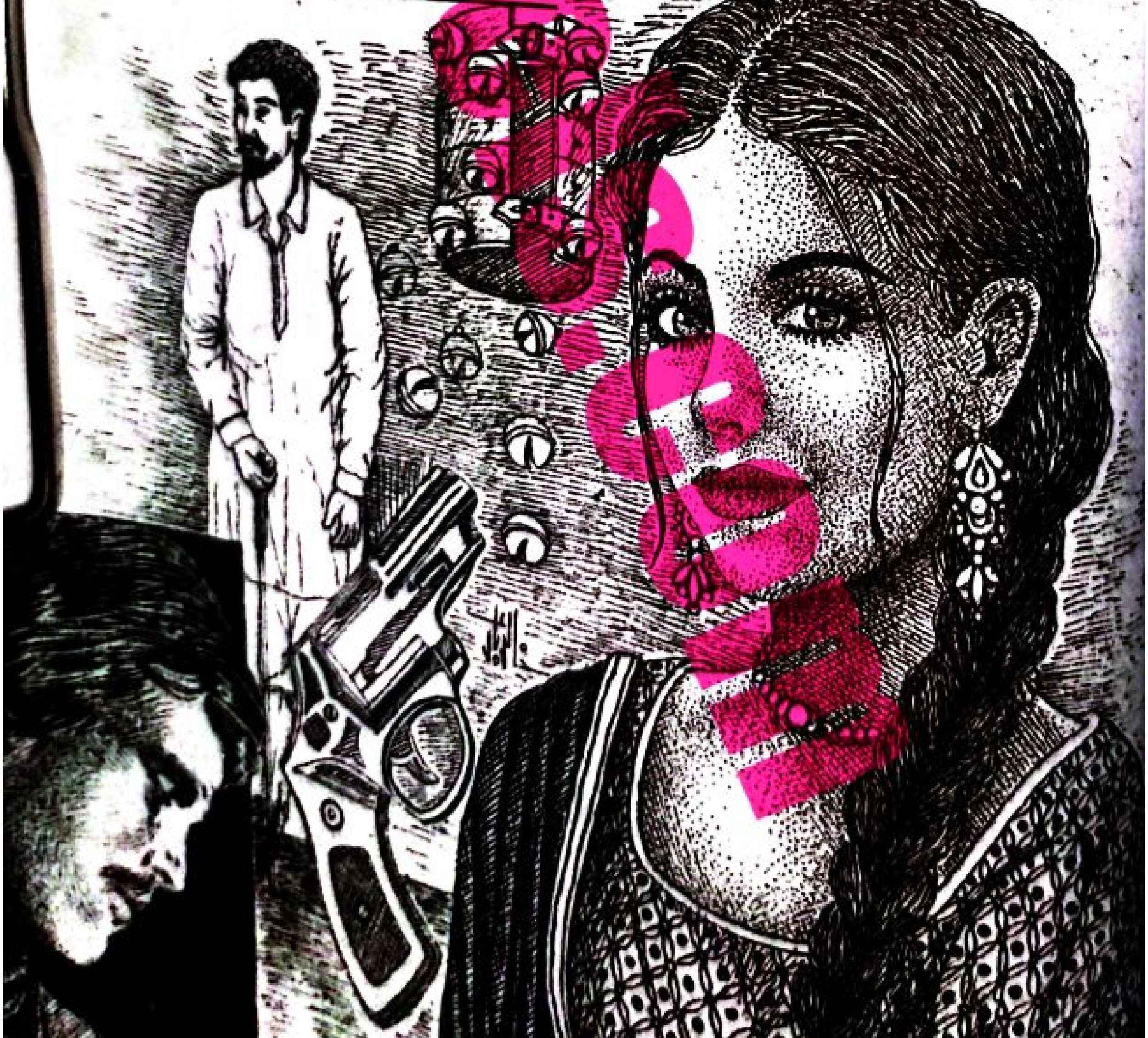

ثمین نے گھبرا کر فوراً ہی اس لڑکے پر سے اپنی نظریں ہٹالیں۔ بس میں رش ہونے کے باعث ثمین کو آدھے سے زیادہ سفر کھڑے ہو کر کرنا پڑا۔ جیسے ہی سیٹ خالی ہوئی، ثمین نے بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ ڈرائیور کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر وہ اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے لگی۔

پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا کسی پُرمشقت کام سے کم نہ تھا۔ خاص طور پر جاب کرنے والے لوگ جنہیں صبح شام یہ تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ چھ بجنے والے تھے۔ آفس سے گھر کا رستہ بیس منٹ کا ہی ہوتا مگر پہلے تو بس وقت پر نہیں آتی اور پھر ذرا ذرا سے فاصلے پر رک کر دن بھر کے تھکے ہارے لوگوں کو اور بھی تھکا دیتی تھی۔

ثمین کو آج گھر جانے کی جلدی تھی۔ صبح ماں جی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے حرا کو اسکول جانے سے روک کر اسے دادی کا خیال رکھنے کا کہا کیونکہ وہ پہلے سے ہی اس مہینے میں کافی چھٹیاں کر چکی تھی اور اب مزید چھٹی اپنے کھرانٹ قسم کے باس کی وجہ سے نہیں کر سکتی تھی۔

بس میں رش کم ہوا۔ تب ہی اچانک ثمین کی نظر سامنے بیٹھے آدمی پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے پورے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ ثمین نے جلدی سے رخ موڑا اور سامنے دیکھنے لگی۔

"کہیں میری نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟" اس نے سوچا۔

وہ اس قدر خوفزدہ ہو گئی تھی کہ دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کا رسک بھی نہیں لے رہی تھی۔ اسی لیے سامنے لگے شیشے میں وہ اسے نظر آیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، چہرے پر خباثت جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ وہی تو تھا...... بغیر کسی شک و شبے کے۔

راجا کو دیکھ کر ثمین پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ سرد موسم میں بھی اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے چادر میں چہرہ اچھی طرح سے چھپا لیا۔

"کہیں اس نے مجھے دیکھ تو نہیں لیا؟" یہ خیال ہی اس کے اوسان خطا کر رہا تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی منتر پڑھ کر غائب ہو جائے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ یہیں پہ گاڑی رکوا کر اتر جائے مگر پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس کی آواز سن نہ لے۔ ثمین وقفے وقفے سے شیشے میں اسے دیکھ رہی تھی۔

سدا کا باتونی راجا اس وقت بھی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے باتیں کر رہا تھا البتہ اس کے ساتھی کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اسے راجا کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

راجا کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ اس نے ثمین کو دیکھ لیا ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔ جو بھی تھا، اسے دیکھ کر ثمین کی حالت لمحہ بہ لمحہ غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا دماغ تیزی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔

ثمین ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتی تھی جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ثمین بچپن ہی سے اپنی ماں کے پیشے اور اس ماحول سے نفرت کرتی آ رہی تھی۔ اسے تعلیم سے بے حد لگاؤ تھا۔ قسمت اچھی تھی، ماں نے اس کی خواہش پوری کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ ہاں، البتہ ساتھ میں رقص اور موسیقی کی تعلیم دینا بھی نہیں بھولی۔ اس پر ثمین نے احتجاج کرنا چاہا لیکن ماں کے جواب نے اس کا منہ بند کر دیا۔

"اگر رقص نہیں سیکھو گی تو میں تمہیں اسکول سے بھی اٹھا لوں گی کیونکہ کرنا تمہیں وہی ہے جو ہم کرتے آ رہے ہیں۔"

ماں کے نقشِ قدم پر چلنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر وہ اپنی پڑھائی کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اس لیے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ماں جو سکھا رہی ہے، سیکھتی جائے۔ جب عملی وقت آئے گا، تب دیکھا جائے گا۔

میٹرک کرنے کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لینا چاہا تو ماں نے صاف انکار کر دیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بچی کے پر نہ نکل آئیں۔ رو دھو کر، منتیں کر کر کے ثمین نے ماں کو راضی کر ہی لیا۔ قسمت نے اور بھی ساتھ دیا اور ماں نے یہ بات بھی مان لی کہ جب تک ثمین گریجویشن نہیں کر لیتی، اسے کسی اور کام کے لیے مجبور نہیں کرے گی۔ ساتھ میں اس نے نیلم بائی سے بھی اجازت دلا دی۔

نیلم بائی یہاں کی نائکہ تھی۔ رعب، دبدبے کا یہ عالم تھا کہ لڑکیاں اس کے سامنے نظر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں لیکن ثمین کی بات کچھ اور تھی۔ ایک تو ثمین کی ماں نیلم بائی کی لاڈلی تھی، اوپر سے ثمین کی خوبصورتی سے بھی نیلم بائی کو کچھ زیادہ ہی توقعات تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر لڑکیوں کے برعکس ثمین کالج تک آ گئی تھی۔ ثمین اس گناہوں بھرے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی مگر کیسے...... اس بات کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

☆☆☆

پھر اس کی زندگی میں کاشف آ گیا۔ کاشف کی محبت

کر اس کا اعتماد بڑھ گیا اور پھر ایک دن چپکے سے وہاں سے نکل آئی۔

کاشف ایک غریب لڑکا تھا لیکن ثمین کی خواہش عزت کی زندگی تھی، دولت نہیں۔ کاشف کا ساتھ پا کر وہ خود کو بے حد خوش قسمت تصور کر رہی تھی۔ کاشف نے اسے محبت اور سہارا دینے کا وعدہ کیا تھا جو اس نے بخوبی نبھایا۔ بڑی اماں اور ثمین کو لے کر وہ کراچی آ گیا۔

کراچی آ کر بھی ثمین کو ہر وقت یہی خوف ستاتا رہتا تھا کہ کہیں وہ لوگ ان تک پہنچ نہ جائیں۔ اسی ڈر کی وجہ سے نہ رات کو پرسکون نیند تھی، نہ دن کو چین تھا۔

کاشف اسے سمجھاتا رہتا۔ ”ثمین! یہ ڈر دل و دماغ سے نکال دو۔ ہم نے وہاں کوئی نشان نہیں چھوڑا جس سے وہ لوگ ہم تک پہنچ سکیں۔ ویسے بھی مجھے تو وہ جانتے بھی نہیں۔“

”کاشف! تم نہیں جانتے۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“ اس نے بے اختیار ہی جھرجھری لی۔

”میں ہوں نا...... میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔“ وہ بے حد محبت سے اس کا حوصلہ بڑھاتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ثمین کے ڈر میں کمی آ گئی لیکن مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ اب بھی ہر دستک پر اس کے دل میں پہلا خیال ان لوگوں کا ہی آتا تھا۔ اکثر ایک ہی خواب اسے دکھائی دیتا تھا کہ وہ لوگ اس تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ خوف اس کے اندر جڑیں پکڑ چکا تھا۔

اور آج سات سال بعد جب وہ ایک چھ سالہ بچی کی ماں تھی، اس کا خوف خوفناک حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا یہ محض اتفاق ہے یا پھر واقعی میں ان لوگوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا ہے؟“ وہ سوچ رہی تھی۔ ساتھ میں اس کے ذہن میں نیلم بائی کی باتیں بھی گونجنے لگیں۔

”یہاں سے بھاگنا جتنا مشکل ہے، تو بھاگ کر کہیں چھپ کر رہنا ناممکن۔ تم کہیں بھی چلی جاؤ، ہمارے آدمی تمہیں ڈھونڈ ہی لیتے۔“ ایک بار ایک لڑکی وہاں سے بھاگ گئی تھی مگر راجا چند ہی دنوں میں واپس لے آیا تھا اور پھر اس لڑکی کا ان لوگوں نے کیا حشر کیا تھا، اس کا تصور ہی ثمین پر کپکپی طاری کر دیتا تھا۔

☆☆☆

ثمین کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پہلے تو ذہن میں خیال آیا کہ کاشف کو فون کر دے لیکن پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ ”نہیں...... اس طرح تو وہ بھی ان کی نظروں میں آ جائے گا۔ مجھے خود ہی ان سے پیچھا چھڑانا ہو گا۔“

بس میں ایک بار پھر رش بڑھ گیا جس کے باعث راجا اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوا تو اسے کچھ سوچنے میں آسانی ہوئی۔

ثمین کو اندازہ تھا کہ ان کے ہاتھ لگنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہو گا اور اگر وہ اس کی بیٹی تک پہنچ گئے تو......

نہیں...... نہیں...... میں ان کے ناپاک سائے بھی اپنی بیٹی پر نہیں پڑنے دوں گی۔ میں ہرگز ان کے ہاتھ نہیں آؤں گی چاہے اس کے لیے مجھے مرنا پڑے یا مارنا۔ یہ سوچتے ہوئے اس کا ہاتھ بے اختیار بیگ میں پڑے ہوئے پستول پر جا لگا۔ پستول کی موجودگی کو محسوس کر کے اس کے دل میں یک لخت ہی کسی حد تک طمانیت بھر گئی۔

ماں جی کی بیماری، بچی کی پڑھائی اور باقی کی ضروریات زندگی کے لیے کاشف کی تنخواہ ناکافی تھی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے کاشف کا ساتھ دینے کے لیے ثمین نے جاب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کاشف نے پہلے تو اسے بہت روکا لیکن پھر اس کی ضد کو دیکھتے ہوئے اجازت دے دی۔

جاب شروع کرنے کے بعد اس کا خوف اور بھی بڑھ گیا۔ دفتر آتے جاتے بھی خوف ستاتا کہ کہیں کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ تب ہی کاشف نے اس کا ڈر ختم کرنے کے لیے پستول خرید لیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس کے چلانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ وہ اپنی طرف سے ثمین کا اعتماد بحال کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

پستول ثمین کے بیگ کی لازمی شے بن چکا تھا۔ اس کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکلتی تھی لیکن آج وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ پستول کو بھول ہی گئی تھی۔

بس ایک بار پھر رکی تو رش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ثمین نے اپنی منزل سے ایک اسٹاپ پہلے ہی اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اترتے وقت اس کے پیروں کی کپکپاہٹ واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ اس نے پیچھے دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ راجا اس کے پیچھے بس سے اترا ہے یا نہیں۔

چند قدم چلنے کے بعد سامنے ہی ایک گلی تھی۔ ثمین اسی جانب مڑ گئی۔ وہ خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کوشش میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ یہ لرزاہٹ اس کی چال سے عیاں تھی۔

گلی میں جا کر اس نے ڈرتے ڈرتے پیچھے پلٹ کر

urdunovels.com

دیکھا۔ تمکین کو اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ اب تک وہ یہی دعا کرتی آرہی تھی کہ راجا کا اس گاڑی میں ہونا صرف ایک اتفاق ہو لیکن اب اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس کے پیچھے راجا تو نہیں مگر اس کا ساتھی ضرور آرہا تھا۔

تمکین کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ تمکین کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے۔ وہ چل رہی تھی، سمت کا تعین کیے بغیر ہی۔ اس کا مقصد راجا اور اس کے ساتھی سے پیچھا چھڑانا تھا۔

دو گلیاں مڑنے کے بعد تمکین ایک طویل گلی میں آگئی۔ گھبراہٹ کے مارے وہ دیکھ ہی نہیں پائی کہ آگے سے گلی بند ہے۔ نزدیک جا کر ہی اسے اس بات کا احساس ہوا۔ یہ دیکھ کر اس کی حالت خراب ہوگئی۔ اس نے گھبراتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ اب تک تو وہ اس امید کے سہارے تھی کہ بھاگ کر ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرلے گی مگر اب تو جیسے فرار کی سب راہیں بند ہوگئی تھیں۔

پیچھا کرنے والا گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ تمکین کو لگا کہ اس شخص سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ یوں اس کے تعاقب میں تھا گویا اسے کسی کا کوئی ڈر ہی نہ ہو۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔

گاڑی سے اترنے کے بعد سے اب تک اسے راجا نظر نہیں آیا تھا۔ 'کہیں وہ اپنے اور ساتھیوں کو لے کر تو نہیں آرہا؟' یہ خیال آتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔

'اس سے پہلے کہ اس کے اور ساتھی آجائیں، مجھے اس اکیلے آدمی سے جان چھڑانا ہوگی۔' یہ سوچ کر تمکین نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور وہیں پر رک کر کھڑی ہوگئی۔ پل بھر میں ہی اس نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔

ڈر حد سے بڑھ جائے تو انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ تمکین نے بھی کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ شخص لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آرہا تھا۔ چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو تمکین نے اس پر پستول تانتے ہوئے للکارا۔

''خبردار! ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا۔'' مگر وہ نہیں رکا۔

اسٹریٹ لائٹ بند تھی جس کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ تمکین نے کانپتے ہاتھوں سے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

''میں...... میں تم سے کہہ رہی ہوں، آگے مت بڑھنا ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔''

تمکین نے دھمکی دی جس کا اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تمکین کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ شخص بھاگ جائے گا مگر وہ تو بے انتہا ڈھیٹ تھا یا پھر یہ سمجھ رہا ہوگا کہ یہ نازک سی لڑکی فائر نہیں کرسکے گی۔

فاصلہ چند قدم کا رہ گیا۔ تمکین کے بار بار للکارنے پر بھی وہ آدمی نہیں رکا تو تمکین نے آنکھیں بند کرکے ٹریگر دبا دیا۔ دو تین گولیاں ایک ساتھ چلانے کے بعد ہی تمکین نے آنکھیں کھولیں۔

وہ آدمی اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔

'اس سے پہلے کہ لوگ فائرنگ کی آواز پر گھروں سے نکل آئیں، مجھے یہاں سے نکلنا ہوگا۔' یہ سوچ کر تمکین تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکل آئی۔ کچھ دور جا کر اسے خیال آیا کہ پستول اب تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ قسمت اچھی تھی یا پھر شاید سردی کی وجہ سے رستہ سنسان تھا۔ سب کچھ بھی ہو، اس کے حق میں یہی بہتر تھا۔

اس نے پستول بیگ میں رکھا اور چادر درست کرتے ہوئے مین روڈ پر نکل آئی۔ تمکین جلد از جلد اس علاقے سے نکلنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ راجا اپنے ساتھیوں کے ساتھ آس پاس موجود نہ ہو۔

قتل کرنے کے بعد بھی اسے لوگوں یا پولیس کا ڈر ہونے کے بجائے راجا کا خوف تھا جو اس کے دل و دماغ پر بری طرح سوار تھا۔

رکشے میں بیٹھ کر اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے فوراً سے پیشتر یہ شہر چھوڑنا ہوگا کیونکہ ساتھی کے مارے جانے کے بعد تو راجا کسی پاگل کتے کی طرح اسے ڈھونڈنے نکل پڑے گا۔

☆☆☆

لاش کے اردگرد خون پھیل چکا تھا۔ قریب ہی سفید چھڑی پڑی تھی۔ لوگ گھروں سے نکل کر وہاں جمع ہوگئے تھے۔ سب ہی افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔

''بیچارے کو کسی نے گھر کے سامنے ہی مار دیا۔''

''بھلا اس گونگے بہرے سے کسی کو کیا دشمنی تھی؟'' ایک آدمی نے کہا۔

''ہائے بیچارہ......!'' ایک آدمی تاسف سے بولا۔ ''پیدائشی گونگا بہرا تو تھا ہی مگر ایک حادثے میں اس کی بینائی بھی چلی گئی تھی اور اب کسی ظالم نے یوں بری طرح سے اسے قتل کر دیا۔ غریب نے کیا قسمت پائی تھی۔''

×××

ن ان باتوں پر حضور بہت آیا مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور یہ باتیں شاہ تک پہنچا دی گئیں۔ شاہ
ان تمام علاقوں کے حاکموں کو علی محمد باب کے بارے میں لکھ دیا کہ ان پر نظر رکھی جائے مگر جہاں ضروری ہو وہاں ان

میرزا یحییٰ صبح ازل

ضیا تسنیم بلگرامی

انیسویں صدی عیسوی میں ایران کے شہر تہران اور شیراز سے فتنوں کی یلغار شروع ہوگئی اور ایک ہی وقت میں متعدد افراد نے طرح طرح کے دعوے شروع کردیے۔ ان کے ذہن چونکہ خود بھی صاف نہیں تھے اس لیے ان کے دعوے بھی مبہم تھے۔ وہ نبی تھے، مہدی تھے، مسیح تھے اور من یظہرہ اللہ (وہ جو اللہ کی طرف سے ظاہر ہوا) میرزا یحییٰ صبح ازل بھی انہی میں سے ایک تھا۔ اس کو اپنے دعوے پر اتنا یقین تھا کہ کوئی اس کو متزلزل نہ کرسکا۔ پھر انہی میں سے ایک مدمقابل شخصیت نمودار ہوگئی اور ان کا خود ساختہ پن دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

خود ساختہ مدعیان نبوت میں سے ایک جس کا اردو میں بہت کم ذکر کیا گیا

آخری حصہ

کے خلاف کارروائیاں بھی کی جا چکی ہیں۔

اب بات حد سے گزر چکی تھی کیونکہ یحییٰ اور میرزا حسین علی اس تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے اور میرزا حسین علی، علی محمد باب سے ملاقات بھی کر چکا تھا۔

یحییٰ نے اپنی عمر کے پندرھویں سال فیصلہ کیا کہ وہ بھی علی محمد باب سے ملاقات کرے گا۔ چنانچہ جب اس نے رابطہ قائم کیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو اسے فوراً اجازت دے دی گئی اور یحییٰ کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

یحییٰ نے جب پہلی بار علی محمد باب سے ملاقات کی تو اس قدر متاثر ہوا کہ صحیح طور پر اس سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔

علی محمد باب نے اسے تسلی دی اور یہ خوشخبری سنائی کہ "تو کم سن سہی مگر میرا جانشین تو ہوگا اور میرے سارے ماننے والے تیرے معتقد ہوں گے۔"

یحییٰ بہت گھبرایا کیونکہ ابھی وہ بہت کم سن تھا۔

علی محمد باب نے کہا۔ "میں تیری خاموشی کا مطلب سمجھ سکتا ہوں مگر جو بات مقدر ہو چکی ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔"

پھر علی محمد باب نے اس پندرہ سالہ لڑکے کو پیروؤں کے سامنے پیش کیا اور کہا۔ "یہی وہ لڑکا ہے جو میرے بعد تم سب کی قیادت کرے گا۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہے، اسے پہچان لو۔ خبردار! جو بھی اس کے حکم کی سرتابی کی گئی۔"

اب یحییٰ اس قدر خوش تھا جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ اسی تقریب ملاقات میں علی محمد باب نے یحییٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ یحییٰ صبح ازل ہے کہ اس نے ازل سے درخشندگی پائی ہے۔ یہ ازل سے موجود ہے کیونکہ اس کا وجود روزِ ازل ہی پایا جاتا تھا۔ اس لیے اب اسے یحییٰ صبح ازل کہا جائے گا۔"

یہ کارروائی جب مکمل ہو چکی تو اس کا سب سے زیادہ دکھ میرزا حسین علی کو پہنچا کیونکہ وہ خود بھی کسی منصب یا مقام کا امیدوار تھا۔ اس نے اپنے کئی ساتھیوں سے کہا۔ "یحییٰ میرا چھوٹا بھائی ہے اور یہ علی محمد باب اور ان کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسے بتایا، سمجھایا اور سکھایا اور آج یہ اس لائق ہو گیا ہے کہ یہاں علی محمد باب کے مقابل کھڑا جانشینی کا اعزاز حاصل کر رہا ہے اور مجھے اس سے محروم کر دیا گیا ہے۔"

ان میں ایک شخص میرزا آقا جان کاشانی تھا۔ اس نے میرزا حسین علی کو تسلی دی اور کہا۔ "مایوس نہ ہو، تم کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا اور جو کچھ بھی ملے گا، وہ اتنا عظیم تر ہوگا کہ تم مطمئن ہو جاؤ گے۔"

چھوٹا بھائی تمام بابیوں کو کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے سے سرور و انبساط رگوں میں دوڑتے خون کی طرح جھلک رہا تھا۔

اب یحییٰ کو قرار آ چکا تھا کہ اسے صبح ازل قرار دیا گیا ہے۔ اس نے حویلی میں واپس آتے ہی اپنے باپ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے علی محمد باب کے فضائل بیان کیے اور یہ یقین دلایا...... "جو لوگ علی محمد باب پر ایمان نہیں لائیں گے، منکر کہلائیں گے اور اب جو زمانہ آنے والا ہے، اس میں منکرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی اس لیے میں علی محمد باب کے جانشین اور قائم مقام کی حیثیت سے دعوت دیتا ہوں کہ آپ بھی اس دین میں آ جائیں۔ اگر آپ نے اس دین کے قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا تو خسارہ اٹھائیں گے اور میں کہ آپ کا بیٹا ہوں، آپ کے کسی کام نہ آ سکوں گا۔ میں یہ دعوت زبانی بھی دے سکتا تھا مگر تحریری اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھے کمزور اور بزدل نہ سمجھا جائے اور دعوت کا سلسلہ ہمیشہ گھر اور اپنے خاندان سے شروع ہوتا ہے۔"

جب یہ تحریر میرزا بزرگ نوری کو ملی تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے بیٹے میرزا حسین علی کو بلایا اور یہ خط اس کے سامنے رکھ دیا، پوچھا۔ "یہ کیا ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میرزا حسین علی کچھ دیر تو اسے پڑھتا رہا، آخر تائید کر دی اور کہا۔ "یہ درست ہے، اس وقت میں وہاں موجود تھا جب یحییٰ کو صبح ازل کا خطاب دیا گیا اور علی محمد باب نے اسے اپنا جانشین و قائم مقام قرار دیا۔ اس لیے اب اس پر ایمان لانا ضروری ہو گیا ہے۔"

باپ اپنے بیٹوں کی باتوں پر حیران و ششدر تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب کو کس طرح چھوڑ سکتا ہے اور علی محمد باب کے دین کو کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک نئی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ حکومت بابیوں کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہتی تھی اور شاہ ان سے متنفر تھا اور وہ ان کے خلاف کوئی بھی حکم دے سکتا تھا، مگر اب جبکہ

وزیر کے دونوں بیٹوں نے اس دین کو اختیار کر لیا تھا اور اس کا ایک بیٹا صبح ازل اور قائم مقام بھی مقرر ہو چکا تھا تو وہ یہ کوئی خفیہ قدم کس طرح اٹھا سکتا تھا۔ اب تو وہ ان کی حفاظت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ماں کو ان واقعات کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ یہ تو محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دونوں بیٹے کسی نہ دکھائی دینے والے کام میں بہت زیادہ مشغول ہو گئے ہیں۔

رات کو کھانے کے بعد میرزا بزرگ نوری اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر حویلی کے باغ میں چلا گیا اور وہاں ٹہل ٹہل کر باتیں کرنے لگا۔ وہ دونوں بیٹوں کو سمجھا رہا تھا کہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے وہ خود زیر عتاب آ جائے کیونکہ جس دین کو ان دونوں نے اختیار کیا ہے، شاہ اس کا دشمن ہے اور کسی وقت بھی اس دین کے خلاف کارروائی شروع ہو سکتی ہے۔

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "بابا جان! ہم لوگ لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ جرأت ہماری [illegible] وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کیونکہ آپ لوگ صدیوں سے ایک عقیدے پر چل رہے ہیں اور کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہ راستہ درست ہے، سیدھا ہے یا اس میں کسی قسم کی کجی پائی جاتی ہے۔"

باپ نے اپنے چھوٹے بیٹے سے پوچھا۔ "تو کیا کہتا ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "میں بھی وہی کہوں گا جو بھائی میرزا حسین علی نے کہا ہے اور اب ان حالات میں کہ حضرت علی محمد باب نے مجھے صبح ازل کے خطاب سے نوازا اور اپنا جانشین و قائم مقام مقرر فرما دیا ہے تو اس بات کی گنجائش ہی کہاں باقی ہے کہ میں اپنی ذات میں کوئی لچک پیدا کروں۔ آپ کو چاہیے کہ میرے دین میں آ جائیں۔"

باپ نے کہا۔ "میں تمہیں موقع دیتا ہوں کہ کچھ دن اپنے معاملات پر خوب غور و خوض کر لو۔ رہ گئی یہ بات کہ میں تمہارے دین کو قبول کر لوں، یہ ناممکن بات ہے۔ اب اگر تم لوگوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کا سلسلہ شروع کیا گیا تو میں اس میں بالکل بے بس اور مجبور ہو جاؤں گا۔"

یحییٰ نے زور دیا۔ "آپ میرے دین کو اختیار کر لیں، اسی بات میں نجات ہے۔"

باپ نے جواب دیا۔ "میں یہ دین اختیار نہیں کر سکتا اور تم دونوں کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کر سکتا۔" اور اس کے بعد ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے گویا تم دونوں نے میری عمر کم کر دی ہے اور اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔"

یحییٰ نے جلدی سے کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو آپ کو چاہیے کہ دین باب فوراً اختیار کر لیں کیونکہ اب جو اللہ تعالیٰ کے ہاں حساب کتاب ہو گا، اس میں آپ کے لیے کوئی رو رعایت اور گنجائش نہیں ہو گی اور وہاں ہم بھی بے بس ہو جائیں گے۔"

باپ نے جواب دیا۔ "مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ کل قیامت کے دن جب اللہ کے نیک بندوں کو جنت کی طرف بھیجا جائے گا تو ان میں تم دونوں شامل نہیں رہو گے۔ بس تو مجھ کو ابھی سے دکھ لاحق ہو گیا ہے۔"

اس رات تینوں دیر تک باغ میں ٹہلتے رہے لیکن ان میں بات چیت کا سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ وہ گفتگو کے ختم ہونے کے بعد بھی ٹہلتے رہے اور آخر میں جب وہ اپنی اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگے تو باپ نے اپنے بیٹوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا۔ "جاؤ، اب سو جاؤ۔ میں رات بھر جاگ کر مناجات کروں گا کہ خدا تمہیں اس آگ سے نکالے۔"

ان کی حرکات و سکنات پر ماں کی بھی نظریں تھیں۔ جب اس نے ان تینوں کو باغ میں ٹہلتے دیکھا اور یہ بھی محسوس کیا کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں اور خاصے پریشان نظر آتے ہیں تو خود بھی فکر مند ہو گئی اور چپ چاپ یحییٰ کی خواب گاہ میں گئی اور اس کے پاؤں کے پاس بیٹھ کر دریافت کیا۔ "کیا بات ہے، تم لوگ کسی پریشانی کا شکار نظر آتے ہو؟"

یحییٰ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور ماں کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ماں! آپ میرے پاؤں کے پاس بیٹھ کر مجھے گناہگار کیوں کر رہی ہیں، آپ میرے پاس یہاں سرہانے بیٹھ جائیں اور بتائیں کہ اس وقت کیوں زحمت کی ہے؟"

ماں نے جواب دیا۔ "بیٹے! میں نے کبھی تجھے کوئی دکھ دیا ہو تو وہ مجھے یاد نہیں۔ اب جبکہ تو جوان ہو گیا ہے اور اپنے فیصلے خود کرنے لگا ہے تو میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں کہ بتا تو نے وہ کون سا نیا فیصلہ کیا جس نے تم تینوں کو پریشانی میں ڈال دیا ہے؟"

یحییٰ نے اب کچھ چھپانے کا فیصلہ بدل دیا تھا اور اپنی جرأت مجتمع کر کے بیان کرنے لگا تھا۔ جواب دیا۔ "والدہ محترم!

آپ نے بابی دین کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ ضرور سنا ہوگا؟"

ماں نے اقرار کیا۔ "میں نے سنا ہے کہ علی محمد باب نامی ایک پیغمبر پیدا ہو گیا ہے اور اس نے پورے ایران کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔"

یحییٰ نے کہا۔ "یہ بات نہیں ہے۔ پریشانی میں ہمیں وہ لوگ ڈال رہے ہیں جو اس دین کی مخالفت کر رہے ہیں اور اسے جھٹلا رہے ہیں اور آپ کو خوش ہو جانا چاہیے کہ ہم دونوں بھائی اس دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں علی محمد باب کا قائم مقام اور جانشین ہوں۔"

ماں نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ "اور میرا بیٹا میرزا حسین علی کیا ہے، اس کو بھی کوئی عہدہ ملا؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "فی الحال تو انہیں کوئی عہدہ نہیں ملا مگر مستقبل میں ان کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔"

ماں نے تشویش ظاہر کی۔ "معلوم نہیں تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ میں ڈر رہی ہوں کہ تمہارا باپ جو وزیر بھی ہے، تم کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

یحییٰ نے کہا۔ "ہم دونوں نے باپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے اور اسے دین کی دعوت بھی دے دی ہے۔ وہی دعوت میں آپ کو بھی دیتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ہمارے دین میں آ جائیں۔"

ماں نے کہا۔ "اگر میرا شوہر تیرے دین کو اختیار کرتا ہے تو میں بھی اختیار کر لوں گی ورنہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم دونوں بھائی ان فضول چکروں سے باز آ جاؤ کیونکہ اس میں بڑے خطرات ہیں اور اس کا امکان موجود ہے کہ تم دونوں کے مقابلے پر حکومت آ جائے اور تم دونوں حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

میرزا یحییٰ نے ماں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

یحییٰ کی خواب گاہ سے نکل کر ماں اپنے بیٹے میرزا حسین علی کی خواب گاہ میں پہنچی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی، پوچھا۔ "سچ بتا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں پیش پیش کون ہے، تو یا یحییٰ؟"

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "ماں! اس مذہب کو ہم دونوں نے اختیار کر لیا ہے لیکن مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے، میں یحییٰ سے تیرہ سال بڑا ہوں پھر میری موجودگی میں میرے چھوٹے بھائی کو علی محمد باب نے اپنا جانشین اور قائم مقام کر دیا۔ علی محمد باب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر کیا بھی تھا تو یحییٰ کو یہ منصب نہیں قبول کرنا چاہیے تھا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "جو کچھ تم دونوں کر رہے ہو، اس سے تمہارے باپ کی عمر کم ہو جائے گی اس لیے تم ان فضول مصروفیات سے باز آ جاؤ۔"

لیکن یحییٰ کی طرح میرزا حسین نے بھی ماں کی نصیحت کو کوئی اہمیت نہ دی۔

چونکہ دونوں بھائی فعال ہو چکے تھے اس لیے ان کے پاس بابیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ یہ لوگ صلاح مشورے کے لیے حویلی کے چکر لگانے لگے۔ باپ نے دونوں کو منع کیا، کہا۔ "میری حویلی کو شاہی انتقام کا ہدف بننے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ جب یہ باتیں شاہ کے کانوں تک پہنچیں گی تو وہ مجھے برطرف کر کے میری حویلی کو فوج کے حوالے کر دے گا اور فوج اس حویلی کو تباہ و برباد کر کے واپس چلی جائے گی۔"

یحییٰ نے کہا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں کی وجہ سے آپ اور آپ کی حویلی خطرے میں ہے تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ اپنی حویلی میں بہ شوق رہیں۔"

باپ نے جب یہ دیکھا کہ اس کے دونوں بیٹے حویلی چھوڑنے پر آمادہ ہیں تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا اور آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر ہماری قسمت میں یہی لکھا گیا ہے کہ ہم اپنے دونوں بیٹوں کی وجہ سے برباد ہو جائیں تو مجھے یہ بربادی منظور ہے۔"

شاہ تک یہ بات پہنچ گئی کہ میرزا بزرگ نوری کے دونوں بیٹے بابیوں کے دین میں داخل ہو چکے ہیں اور اپنے مقاصد میں سرگرم عمل ہیں تو اس نے پہلے تو اپنے وزیر کو سمجھایا اور حکم دیا کہ وہ دونوں بیٹوں کو حویلی سے نکال باہر کرے۔

میرزا بزرگ نوری نے اپنے دونوں بیٹوں کو تو حویلی سے نہیں نکالا مگر خود شاہی دربار سے نکل گیا اور شاہ سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔

دونوں بیٹوں نے بھی حویلی میں رہنا کم کر دیا تھا۔ اب وہ پوری طرح اپنے دین کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو چکے

کبھی تہران میں ہوتے، کبھی اس کے مضافات میں۔ ایک بار تو دونوں کئی ہفتے غائب رہے اور جب واپس آئے تو [illegible]

تھے۔ وہ معلوم ہوا کہ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ دونوں بھائی بہت غمزدہ ہوئے۔ [illegible]

ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو اپنے شوہر کی موت کا سبب قرار دے رہی تھی جبکہ دونوں بھائیوں کے دلوں میں شاہ ایران کے [illegible] غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی موت کا سبب شاہ ایران کی سخت گیر پالیسی کو ٹھہراتے تھے۔ انہوں کے دل میں خلاف [illegible]

بھی ان دونوں بھائیوں کے لیے بڑی ہمدردیاں تھیں۔ انہوں نے ان دونوں کے باپ کی موت کو بڑی اہمیت دی۔ وہ [illegible] علی محمد باب سے شاہ ایران کے خلاف فتویٰ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ [illegible]

کیا کہ شاہ کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ ایک سازش تیار کی گئی اور مقررہ وقت پر اس پر عمل ہوا مگر یہ سازش پوری طرح کامیاب نہیں رہی۔

شاہ ایران صرف زخمی ہوا تھا۔ اس نے بابیوں کی گرفتاری کے احکامات صادر کر دیے۔ اب بابیوں نے [illegible]

لوگ ایران خالی کر گئے۔

سرحدوں پر پہرے بٹھا دیے گئے اور دونوں بھائیوں کی حویلی کو گھیرے میں لے لیا گیا۔

یحییٰ نے بغداد کا رخ کیا۔ اسے اپنی گرفتاری کا خدشہ تھا۔

یحییٰ بغداد کے لیے روانہ تو ہو گیا مگر اس سے پہلے اس کے سامنے یہ خوف تھا کہ عراق کی سرحد پر شاہ ایران کے سپاہی اور جاسوس موجود ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بغداد پہنچ جانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن بغداد کے علاوہ کوئی دوسرا ٹھکانہ دونوں کے سامنے نہیں تھا اور بہت سے بابی وہاں پہنچ چکے تھے۔

یحییٰ نے فقیروں کا لباس پہنا اور بغداد روانہ ہو گیا۔ سرحد پر ایرانی حکام نے اسے روک لیا، حالانکہ وہ [illegible]

تھے۔ وہ یحییٰ کو فقیر سمجھ رہے تھے۔ اس کے کاندھے پر ایک افسر نے ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”تو ادھر میرے ساتھ آ۔“

یحییٰ کو اپنی گرفتاری کا یقین ہو گیا۔ وہ افسر کے ساتھ چلتے چلتے اپنے فرار کے منصوبے بنانے لگا۔

افسر نے اپنے خیمے میں لے جا کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا تو میرزا بزرگ نوری کے دونوں بیٹوں کو پہچانتا ہے؟ میرزا حسین علی اور یحییٰ کو؟“

یحییٰ سمجھ گیا کہ یہ افسر احمق ہے اور وہ ان دونوں سے قطعاً ناواقف ہے۔

یحییٰ نے جواب دیا۔ ”بابا! ہم فقیر لوگ شاہوں اور وزیروں کو کیوں پہچاننے لگے۔“

افسر نے کہا۔ ”تم میرے لیے ایک کام تو کر سکتے ہو۔ یہ دونوں بھاگ کر بغداد تو پہنچیں گے اور وہاں [illegible] اگر کام کرنے کا موقع ملے گا۔ میں ان دونوں کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ تو فقیر ہے اور اگر تیری مدد سے ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قابو پا جاؤں اور گرفتار کر لوں تو میرے عہدے میں اضافہ ہو جائے گا اور شاہ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں گا۔“

یحییٰ نے پوچھا۔ ”اگر میں یہ کام کروں گا تو اس کا صلہ مجھے کیا ملے گا؟“

افسر نے جواب دیا۔ ”تو فقیر ہے، میں تجھے فقیری سے نجات دلا دوں گا اور اپنے پاس سے بھی اور شاہ ایران سے بھی تیری مدد کروا دوں گا تاکہ تجھے اس فقیری سے نجات مل جائے۔“

اس کے بعد دونوں ایران کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے اور بابیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ [illegible]

گفتگو دونوں نے علی محمد باب کے بارے میں گفتگو کی۔ افسر نے علی محمد باب کو گالیاں دیں اور کہا۔ ”ایک [illegible]

کتے کی موت مارا جائے گا اور وہ اپنی نبوت کو یکسر فراموش کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

یحییٰ نے یہاں پر اپنے اس افسر سے اختلاف کیا اور کہا۔ ”شاید ایسا نہ ہو [illegible]

نہیں اترتا۔ جس کے ہزاروں پیروکار ہوں اور وہ اپنے نبی پر جان قربان کرنے پر آمادہ ہوں [illegible]

ارادوں اور منصب سے باز آ جائے گا۔“ کافی دیر بعد جب یحییٰ ایرانی سرحد سے گزر گیا [illegible]

بعد اس افسر کو بتایا کہ اس حلیے کا ایک فقیر بغداد جانے کے لیے یہاں سے گزرے گا [illegible]

نکلا ہے، علی محمد باب کا جانشین اور قائم مقام۔

افسر نے اس شخص کو یہ نہیں بتایا کہ فقیر تو اس سے باتیں کرنے کے بعد بغداد چلا بھی گیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ [illegible]

میرزا حسین علی کو فرار ہوتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ ایران پر حملہ آور ہونے کے جرم میں اس کے ساتھ اور بہت سے بابی بھی گرفتار کیے گئے تھے۔

بغداد میں یحییٰ اپنے بھائی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے کافی عرصے تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا بھائی میرزا حسین علی گرفتار کیا جا چکا ہے۔

قید خانے میں میرزا حسین علی کو اس کے ساتھیوں نے ورغلانا شروع کر دیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''آپ کے بھائی یحییٰ کو تنہا نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب آپ تو قید خانے میں ہیں اور آپ کا بھائی یحییٰ بغداد میں امن و چین سے رہ رہا ہے۔''

کسی خوشامدی نے مشورہ دیا۔ ''آپ کا چھوٹا بھائی علی محمد باب کا جانشین اور قائم مقام بن گیا ہے اور آپ اس کے بڑے بھائی ہونے کے باوجود اس کے ماتحت کر دیے گئے ہیں۔ اب اس پُرآشوب دور میں جبکہ کئی لوگ نبوت کے دعوے کر چکے ہیں، کیوں نہ آپ بھی کوئی دعویٰ کر دیں اور نبی بن جائیں۔''

اس مشورے میں سب سے پیش پیش میرزا آقا جان کاشانی تھا۔ یہ شخص یحییٰ کا خاص حسد تھا مگر بدقسمتی سے میرزا حسین علی کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب قید خانے میں اسے ورغلا رہا تھا۔ اسے نبی بننے کی دعوت دے رہا تھا۔

جب ان قیدیوں سے الگ الگ شاہ کے مقرر کردہ ارکان حکومت نے باتیں کیں اور ان کے دلوں کو ٹٹولنا چاہا کہ معلوم ہو ان میں کون کون بابیوں کا مخلص کارکن ہے اور کس کو شبے کی بنیاد پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ ان سے شاہ کے قتل کا منصوبہ بنانے والوں کا بھی پتا چلانا چاہتے تھے۔

جب شاہ کے آدمی میرزا آقا جان کاشانی کو علیحدہ لے گئے تو اس نے بابی ہونے کا الزام غلط بتایا۔ ''میرا علی محمد باب یا اس کے مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں تو میرزا حسین علی کا دوست تھا۔ اسی قسم کا دوست جیسے کوئی عیسائی کسی مسلمان کا دوست ہو جائے۔''

''شاہی تحقیقات کرنے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ لوگ تجھے بابی کہتے ہیں اور تو اس سے انکار کر رہا ہے۔''

میرزا آقا جان کاشانی رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کہا۔ ''خدا کسی کو نادار و مفلس نہ بنائے۔ ایک عرصے سے بیکار پھر رہا ہوں، کام نہیں ملتا۔ میں نے وزیر کے دونوں بیٹوں کو وسیلہ بنانا چاہا مگر ان دونوں نے میرا کام اس لیے نہیں کیا کہ میں بابی نہیں تھا۔ اگر میں بابی ہوتا تو وہ میری مدد ضرور کرتے لیکن میرا کام کسی نے بھی نہ کیا بلکہ اس کا صلہ یہ ملا کہ ناکردہ گناہ بابی ہونے کے جرم میں قید کر لیا گیا اور اب مجھ پر مقدمہ چلے گا کہ میں بھی شاہ پر حملہ آوروں میں شامل تھا۔''

شاہی افسر نے پوچھا۔ ''تو کیا تو واقعی بابی نہیں ہے اور ان لوگوں سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں بابی نہیں ہوں۔ میں صرف ایک بیکار انسان ہوں اور اب بھی اس قید خانے میں اپنی ملازمت کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔''

اس تحقیقاتی افسر نے یہ خبریں اوپر پہنچائیں اور میرزا آقا جان کاشانی کے بارے میں پوچھا۔ ''اب اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے کیونکہ وہ ایک بیکار اور پریشان حال ایرانی ہے اس لیے اسے یا تو رہا کر دیا جائے یا پھر رہائی کے ساتھ ساتھ اس کی ملازمت کا بھی بندوبست کیا جائے۔''

لیکن اوپر والوں نے میرزا آقا جان کاشانی کا جو ریکارڈ جمع کر رکھا تھا، اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس شخص کا بابیوں سے گہرا تعلق ہے اور یہ شخص یحییٰ صبح ازل کا خاص دوست ہے اور دو دوستوں میں کوئی قدر مشترک ضرور ہوتی ہے۔ میرزا آقا جان کاشانی اور یحییٰ صبح ازل میں بابی مذہب ہی قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن انتہائی تحقیق اور بحث و مباحثے کے بعد بھی میرزا آقا جان کاشانی کا بابی ہونا ثابت نہ ہو سکا۔

حکومت نے میرزا آقا جان کاشانی کو ترکی چلے جانے کا حکم دیا اور اسے ایرانی سفارت خانے میں ملازمت دے دی گئی۔ وہ سفارت خانہ جو ترکی میں ایرانی مفادات کا خیال رکھتا تھا اور سفیر کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ میرزا آقا جان کاشانی پر گہری نظر رکھی جائے کہ کہیں یہ شخص بابی تو نہیں ہے۔

ایران میں شاہ کے قاتلوں پر مقدمہ چلا تو میرزا حسین علی کو کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے بری کر دیا گیا اور کئی ملزموں کو مزید تحقیقات کی خاطر قید رکھا گیا۔

اب میرزا حسین علی رہائی پانے کے بعد اپنی ماں کے پاس حویلی میں گیا تو وہاں ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔ ماں نے

دنوں بعد بیٹے کو دیکھا۔ اس سے پہلے اس کے بارے میں جیسی بری بری خبریں سنی تھیں، اس سے اس کا دماغ تو اوندھا ہو گیا تھا۔ وہ بیٹے سے دیر تک بہکی بہکی باتیں کرتی رہی اور آخر میں اس نے یحییٰ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کیونکہ وہ شروع ہی سے اسے ناپسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو خراب کیا ہے۔ اس نے میرزا حسین علی سے کہا۔
"اب تو کہیں نہیں جائے گا۔"

لیکن میرزا حسین علی نے ماں کو سمجھایا۔ "ماں! اس میں بھائی یحییٰ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے بابی ہونے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اب اگر میں اس حویلی میں رہوں گا تو کسی ایسے ہی موقع پر پھر گرفتار کر لیا جاؤں گا اور اس طرح تمہیں پھر پریشانی اٹھانا پڑے گی۔"

ماں نے پوچھا۔ "اگر تو اس حویلی میں نہیں رہے گا تو کہاں جائے گا؟"

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "میں بغداد جا رہا ہوں، بھائی یحییٰ کے پاس۔"

ماں نے پوچھا۔ "پھر اس حویلی کو کون سنبھالے گا؟ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔"

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "یہاں بھروسا تو کسی چیز کا بھی نہیں، کیا حویلی، کیا ہماری زندگیاں۔"

کچھ دنوں بعد میرزا حسین علی نے ماں کو حویلی میں چھوڑا اور خود بغداد روانہ ہو گیا۔

بغداد میں بابیوں کا اجتماع تھا اور وہ آزادی سے اپنے مذہب کے لیے کام کر رہے تھے۔ پھر یہاں بھی حکومت کو ان کی سرگرمیوں پر اعتراض ہوا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ بغداد چھوڑ دیں۔

اب ایک بار پھر یہ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے لیکن بہت جلد انکشاف ہوا کہ بغداد میں وہ جو خود کو نہایت محفوظ، آزاد تصور کر رہے تھے، یہ ان کی خام خیالی تھی ورنہ بغداد کی حکومت نے ان کے خلاف ایک باقاعدہ منصوبہ بنا رکھا تھا۔ ان کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا۔ ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جا رہی تھی اور یہ بات ان کے بس کی نہیں تھی کہ وہ جہاں جانا چاہتے اپنی مرضی سے چلے جاتے۔

آخر کار انہیں حکومت کی طرف سے مطلع کیا گیا کہ اب وہ مزید بغداد میں نہیں رہ سکتے اس لیے انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ترکی چلے جائیں۔ ترکی کی حکومت نے انہیں عارضی طور پر پناہ دینے کی درخواست قبول کر لی تھی۔ انہیں بغداد سے ترکی روانہ کر دیا گیا۔

ترکی میں شہر اورنہ میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہیں میرزا آقا جان کاشانی موجود تھا۔ ایرانی حکومت نے ترکی سے خاص طور پر اورنہ شہر کا اس لیے انتخاب کیا تھا کہ یہاں جو بابی ایرانی سفارت خانوں میں بحیثیت مسلمان ملازم تھے وہ در پردہ بابی تھے۔

کچھ عرصہ یہ لوگ خاموش رہے اور میرزا آقا جان کاشانی، یحییٰ اور میرزا حسین علی سے ملاقات کرنے نہیں گیا کیونکہ وہ اپنے بابی ہونے کو ایک خاص مدت تک پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اور جب اس نے سفارت خانے سے درخواست کی کہ کیا یہ بات سب کے علم میں لا کر اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہوں جو بابی ہیں۔ سفیر نے کسی قدر رد و قدح کے بعد ملنے کی اجازت دے دی۔

وہ سیدھا یحییٰ کے پاس گیا اور اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتا رہا لیکن یحییٰ، میرزا آقا جان کاشانی کو مسلسل نظر انداز کرتا رہا اور سرد مہری اختیار کر لی۔ جب یہ سرد مہری ناقابل برداشت ہو گئی تو اس نے یحییٰ سے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے کہ آپ مجھے مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں؟"

یحییٰ نے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ تو نے اپنے بابی ہونے سے انکار کیا اور اسی چھپن و بابی پر قید سے رہائی حاصل کی ہے اور سفارت خانے میں ملازمت بھی حاصل کر لی؟ ہمیں یہ باتیں جس ذرائع سے معلوم ہوئیں ان پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

میرزا آقا جان کاشانی نے صاف صاف اقرار کر لیا۔ "میں نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ اب آپ لوگ جو سزا دینا چاہیں، دیں مگر یہ یاد رہے کہ اگر میرا یہ راز کھل گیا کہ میں واقعتاً بابی ہونے کے باوجود اس سے انکار کرتا رہا ہوں تو بہت سے جو ابھی تک غیر بابی کے روپ میں سرکاری ملازمتوں پر فائز ہیں، شک و شبے کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔ مجھے تو آپ پیدائشی بابی سمجھیں۔"

یحییٰ نے اس کی صفائی قبول کر لی اور کہا۔ "بہتر ہے تو جس جگہ اور جو کچھ کر رہا ہے، کرتا رہ اور سفارت خانے میں ہمارے خلاف جو خفیہ تجویزیں اور منصوبے تیار کیے جائیں تو ہمیں ان سے خبردار کرتا رہ۔"

یہاں سے اٹھ کر وہ صبح ازل کے بڑے بھائی میرزا حسین علی کے پاس پہنچا۔ وہاں اس سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی اور میرزا حسین علی نے میرزا آقا جان کاشانی کی تعریفیں اس کے منہ پر کیں اور کہا۔ "تو نے اپنی اسیری کے دوران میں اپنے بابی ہونے کا

کرتا رہے گا۔"

اعتراف نہ کر کے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا اور ہمیں امید ہے کہ تو اسی طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔

یہاں میرزا آقا جان کاشانی نے بڑے بھائی سے اس کے چھوٹے بھائی یحییٰ کی شکایت کی اور کہا۔ "یہ کیسا صبح ازل ہے کہ مجھ پر باب سے منحرف ہونے کا شبہ کر رہا ہے حالانکہ جتنا دل کی گہرائیوں سے میں بابی ہوں، کوئی دوسرا بابی میرے جیسا بابی نہیں ہوگا۔"

اور اب اس نے پورے یقین اور قوت سے میرزا حسین علی کو مشورہ دیا۔ "آپ کو دعویٰ کر دینا چاہیے کہ وہ جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، آپ ہی ہیں۔ آپ اگر علی محمد باب کے مقابلے میں نبوت کا بھی دعویٰ کر دیں تو میں آپ کے لیے بے حد کام کروں گا۔ میں سرکاری ملازمت بھی چھوڑ سکتا ہوں اور آپ کی نبوت پر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "وقت کا انتظار کر۔ تو جو کچھ کہہ رہا ہے، میں اپنی ذات میں ایسی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں اور میرے اندر کوئی موجود ترغیب دے رہا ہے کہ میں اپنی نبوت کا اعلان کر دوں۔"

اسی دوران خراسان سے خبر آئی کہ وہاں ایران بھر کے بابی جمع ہو رہے ہیں اور ان دونوں کو بھی وہاں طلب کیا گیا ہے۔

یہ دونوں اور دے سے خراسان روانہ ہو گئے۔

خراسان میں علی محمد باب خود تو نہیں پہنچا مگر اپنے قائم مقام کو کچھ ایسی نشانیاں ضرور بھیج دیں جن سے یحییٰ صبح ازل کی حیثیت مستحکم قرار پائی۔

علی محمد باب، یحییٰ صبح ازل سے بے حد خوش تھا۔ اسی خوشی میں علی محمد باب نے یحییٰ صبح ازل کے لیے اپنا قلمدان، کاغذات، نوشتہ جات، لباس، انگوٹھی اور بعض دوسری چیزیں بھیج دی تھیں۔ کتاب بیان بھی بھیجی گئی تھی اور ایک بار پھر یحییٰ کی جانشینی کا وصیت نامہ تیار کروا کے روانہ کیا گیا تھا۔

یہ چیزیں میرزا حسین علی کے لیے رشک و حسد کا باعث بن گئیں۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بالکل خوش نہیں تھا اور اب ایک عرصے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جب تک صبح ازل موجود ہے، اس وقت تک میرزا حسین علی کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتا اور علی محمد باب بھی اسے یحییٰ جتنی اہمیت نہیں دے گا۔

خراسان سے واپس جانے کے بعد میرزا حسین علی نے میرزا آقا جان کاشانی سے مل کر صبح ازل کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

اسی دوران یحییٰ نے کاشانی کو بابیت سے متعلق چند کتابیں دیں اور کہا کہ انہیں نہایت احتیاط سے سفارت خانے کے سامان کے ساتھ تہران روانہ کر دیا جائے۔ وہاں سے یہ کتابیں بغداد بھیج دی جائیں لیکن یہ ہدایت کی کہ اسے راز رکھا جائے اور یہ بھی بتایا کہ اگر یہ راز سفیر پر عیاں ہو گیا تو ہمیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

دل نہ چاہنے کے باوجود میرزا آقا جان کاشانی نے یہ کتابیں لے لیں اور اپنے گھر کے کسی گوشے میں انہیں چھپا دیا۔ سفارت خانے میں کچھ ایسی مصروفیات رہیں کہ وہ کتابیں سفارت خانے کے سامان میں نہیں چھپا سکا۔ یہ کتابیں گھر ہی کے اندر پڑی رہیں۔

میرزا آقا جان کاشانی ان کتابوں کی وجہ سے بہت خوفزدہ رہتا تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ انہیں زمین کھود کر دفن کر دیا جائے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ اگر دفن نہ کیا جائے تو پتھر باندھ کر دریا برد کر دیا جائے مگر ادھر کچھ دنوں سے باہر نکلتے ہی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

یحییٰ صبح ازل کو جب یہ پتا ہوا کہ کتابیں ابھی تک میرزا آقا جان کاشانی کے گھر میں موجود ہیں تو اسے بلوا کر ہدایت کی کہ ان کتابوں کو یا تو واپس کر دے یا کسی طرح تہران روانہ کر دیا جائے۔ تہران میں وہ شخص کتابوں کا انتظار کر رہا ہے جو انہیں وہاں سے بغداد پہنچائے گا۔

میرزا آقا جان کاشانی نے عذر پیش کیا۔ "ادھر کچھ عرصے سے میری نگرانی کی جا رہی ہے اور مجھے ہر وقت اپنی گرفتاری کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ان حالات میں اگر میں کتابیں سفیر کے سامان میں رکھوں گا تو وہ فوراً پکڑی جائیں گی اور مجھے گرفتار کر لیا جائے گا اس لیے فی الحال میں خاموش ہوں اور وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

یحییٰ صبح ازل نے کہا۔ "اگر یہ کام تیرے امکان سے باہر ہے تو کتابیں واپس کر دے، میں کسی دوسرے ذریعے سے انہیں بغداد روانہ کر دوں گا۔"

میرزا آقا جان کاشانی نے جواب دیا۔ "فی الحال یہ کام بھی دشوار ہے کیونکہ میری نگرانی کی جا رہی ہے اور اگر میں ان کتابوں کے ساتھ پکڑا گیا تو میرے پاس جھوٹ بولنے کی بھی گنجائش نہیں رہے گی۔ اس لیے آپ کچھ دن صبر سے کام لیں۔ اس وقت کا انتظار کریں جب یہ کام میرے لیے آسان ہو جائے گا۔"

یحییٰ صبح ازل کو اب یہ شبہ ہونے لگا کہ بات کچھ اور ہے۔

مرزا حسین علی کے بارے میں بابیوں نے یحییٰ صبح ازل کو یہ خبر دی کہ اب وہ اپنے ٹھکانے پر موجود نہیں ہوتا اور کچھ دنوں سے اس کا یہ دستور ہو گیا ہے کہ وہ اپنی جائے رہائش سے کہیں اور چلا جاتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ کسی پہاڑی میں روپوش ہے اور وہاں بیٹھا کوئی خوفناک منصوبہ بنا رہا ہے۔

یحییٰ صبح ازل نے سوچا کہ اس کا بھائی کس قسم کے منصوبے بنا سکتا ہے اور کس کے خلاف منصوبے بنا رہا ہے؟

اب چونکہ یحییٰ صبح ازل، علی محمد باب کا جانشین تھا لہٰذا وہ اپنے بڑے بھائی مرزا حسین علی کو حکم دے سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے مرزا حسین علی کے نام ایک خط لکھا۔ ”تم جہاں کہیں بھی ہو، میں خلیفۃ الباب کی حیثیت سے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فوراً واپس آ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ تم پراسرار طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر کیا کام کر رہے ہو؟ تمہاری عدم موجودگی میں لاعلمی کی وجہ سے ہم میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ تمہارا واپس آنا اور ہم سب میں رہنا از بس کہ ضروری ہے۔“

اس تحکمانہ تحریر نے مرزا حسین علی کو اور زیادہ برگشتہ کر دیا۔ وہ جہاں بھی تھا، وہاں سے فوراً واپس تو آ گیا، اپنے بھائی کے سامنے جھوٹی سچی وضاحت بھی پیش کر دی مگر اب وہ خود خلیفۃ الباب بننا چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے یحییٰ صبح ازل کو راستے سے ہٹایا جائے۔

اس نے اپنے چھوٹے بھائی یحییٰ صبح ازل کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ یہ دعوت اس بات کی خوشی میں کی گئی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی صبح ازل اب باقاعدہ باب کے خلیفہ کی حیثیت سے فرامین جاری کرنے لگا تھا۔

اس دعوت میں یحییٰ صبح ازل کو زہر دے دینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

کسی نے یحییٰ صبح ازل کو اس منصوبے کی خبر کر دی۔ یحییٰ کو بے حد دکھ پہنچا اور اس نے اس منصوبے کا کسی اور کے سامنے ذکر نہیں کیا لیکن وہ اس خبر کی صداقت کا اندازہ ضرور لگانا چاہتا تھا۔

جب دسترخوان بچھ گیا اور سارے مہمان دسترخوان کے سامنے بیٹھ گئے تو کچھ دیر بعد مرزا حسین علی کی اجازت سے دسترخوان پر کھانا لگا دیا گیا۔ جو کھانا یحییٰ صبح ازل کے سامنے رکھا گیا تھا، کچھ دیر بعد اسے یحییٰ صبح ازل نے اپنے بڑے بھائی مرزا حسین علی کے سامنے رکھوا دیا اور مرزا حسین علی کا کھانا اپنے سامنے۔

مرزا حسین علی بہت گھبرایا کہ معاملہ الٹا ہو گیا اور مسموم کھانا اس کے سامنے لگا دیا گیا تھا۔ اب وہ یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ اس کے سامنے کا کھانا ہٹا لیا جائے۔

کچھ دیر بعد کھانا شروع کیا گیا اور یحییٰ صبح ازل نے اپنے بڑے بھائی کو حکم دیا۔ ”کھانے کی بسم اللہ تجھ سے ہو گی، کھانے کا آغاز کر۔“

مرزا حسین علی نے کسی پس و پیش کے بغیر ایک لقمہ حلق سے اتار لیا۔ خود یحییٰ صبح ازل کھانے سے پرہیز کر رہا تھا۔

مرزا حسین علی نے منہ بناتے ہوئے اعلان کیا۔ ”ابھی ابھی مجھے بتایا گیا کہ میں کھانا نہ کھاؤں، اس کھانے میں زہر کی آمیزش ہے۔“

وہ دسترخوان سے اٹھا اور کلیاں کرنے لگا۔ اسی وقت طبیبوں کی جماعت اس کے علاج کے لیے بیٹھ گئی کیونکہ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور حلق اور سینے نے مرزا حسین علی کو ہلکان کر دیا تھا۔

یحییٰ صبح ازل نے حکم دیا۔ ”کھانا اٹھا دیا جائے کیونکہ یہ مشتبہ کھانا ہے۔ کسی نے کوشش کی ہے کہ ہمیں زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے۔“

مرزا حسین علی نے پوچھا۔ ”ایسی مذموم کوشش کون کر سکتا ہے؟“

یحییٰ صبح ازل نے جواب دیا۔ ”جب تجھے یہ خبر دی جا سکتی ہے کہ کھانے میں زہر ملا دیا گیا ہے تو تجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کھانے میں زہر کس نے شامل کیا ہے۔“

مرزا حسین علی نے جواب دیا۔ ”مجھے اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا مگر صحت یاب ہونے کے بعد۔ اطبا علاج کر رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ میں بہت جلد صحت یاب ہو جاؤں گا۔“

یحییٰ صبح ازل نے آہستہ سے کہا۔ ”بھائی حسین علی! شیطان جو ہم سے بہت زیادہ قریب ہے، ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ اسے کب موقع ملے اور کب ورغلائے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس پر قابو پا لیں۔ ویسے میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکایت تھی تو مجھے بتاتے، میں اس کا ازالہ کرتا۔“

مرزا حسین علی نے کہا۔ ”اس طرح آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں، ذرا صاف صاف بات کیجیے۔“

یحییٰ صبح ازل نے جواب دیا۔ "میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ تم نے میرے کھانے میں زہر کیوں شامل کیا؟"

میرزا حسین علی نے کہا۔ "آپ نے کھانا کھایا نہیں پھر آپ کو یہ شکایت کیوں ہے کہ میں نے آپ کے کھانے میں زہر کیوں ملوایا؟"

یحییٰ صبح ازل نے کہا۔ "میں نے کھانا اسی لیے نہیں کھایا تھا کہ مجھے ایک دن پہلے ہی یہ بتا دیا گیا تھا کہ میرے کھانے میں زہر ملا دیا جائے گا۔ چنانچہ تو نے غور نہیں کیا کہ میں نے دسترخوان پر کھانا لگنے کے بعد اپنا کھانا تیری طرف رکھ دیا اور تیرا کھانا اپنی طرف رکھ لیا اور تجھے حکم دیا کہ کھانے کا آغاز تو کر۔ تو نے بدرجہ مجبوری ایک لقمہ کھایا اور تھوکتا تے کرتا دسترخوان سے اٹھ گیا۔ اب میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو نے ایسا کام کیوں کیا؟"

میرزا حسین علی نے جواب دیا۔ "بھائی! میں اپنی بیماری کی وجہ سے خاموش ہوں ورنہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے کھانے میں آپ نے زہر ملایا کیونکہ آپ کو کسی نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں آپ کے خلاف سازشیں کر رہا ہوں۔"

یحییٰ صبح ازل پریشان ہو گیا کیونکہ میرزا حسین علی نے جس طرح اور جس وقت اس پر الزام لگایا تھا، وہ نہایت بروقت اور اثر انگیز تھا اور اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا مگر میرزا حسین علی کی باتوں کا ہر کوئی یقین کرے گا۔

دونوں نے فی الحال خاموشی اختیار کی اور مناسب وقت اور موقع کے انتظار میں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔

جب میرزا حسین علی بالکل صحت یاب ہو گیا تو اس نے اپنے ماننے والوں کو یکجا کیا اور ان سے شکایتاً کہا۔ "تم لوگ جانتے ہو کہ میں یحییٰ صبح ازل کا بڑا بھائی ہوں اور ان کی ہر ہر قدم پر مدد کرتا ہوں مگر اس کے باوجود معلوم نہیں کیوں وہ مجھ سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ علی محمد باب نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔ میں نے ان کے اعزاز میں دعوت کر دی، انہوں نے اس دعوت میں میرے خلاف جو کچھ کیا، وہ سب آپ سب کو معلوم ہے۔ مجھے کھانے میں زہر دے دیا گیا مگر میں بچ گیا۔ اب آپ لوگ بتائیں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟"

کسی نے مشورہ دیا۔ "فی الحال انتظار کریں اور اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ خود ہی انصاف فرما دے گا۔"

لیکن میرزا آقا جان کاشانی نے کھڑے ہو کر کہا۔ "ہمیں اس معاملے کو یوں ہی نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ یہ شخص جس کو صبح ازل کا لقب ملا ہے اور علی محمد باب کے خلیفہ ہونے کا شرف عطا کیا گیا ہے، آج وہ اپنے بڑے بھائی کو اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ ہمیں اس وقت درگزر سے کام نہیں لینا چاہیے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کہ اپنے بڑے بھائی کو زہر دے کر ہلاک کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔"

میرزا حسین علی نے بڑی نرمی سے کہا۔ "لیکن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ وہ نہیں کر سکتا جو اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔ اس لیے میں اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں اور اپنے بھائی کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں کہ اسے راہ راست پر لائے اور اس کا ذہنی و عقلی توازن برقرار رکھے۔"

میرزا آقا جان کاشانی نے کہا۔ "لیکن میں آپ کی شرافت اور نیکی میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے بھائی کو معاف کر سکتے ہیں مگر میں معاف کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

میرزا حسین علی نے اپنے ماننے والوں کو ایک موقع دیا اور کہا۔ "میں اس مقدمے کا فیصلہ تم سب سے چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے ایک ہفتہ، پورے سات دن اور سات راتیں ہیں۔ میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ گے کہ میں اپنے بھائی کے خلاف کون سا قدم اٹھاؤں۔"

سات دن گزر گئے اور یحییٰ صبح ازل اپنے بڑے بھائی میرزا حسین علی کے خلاف زیادہ چرچا نہیں کر سکا جبکہ میرزا حسین علی نے ہر طرف یہ مشہور کر دیا کہ اس کے کھانے میں زہر یحییٰ صبح ازل نے ملایا تھا۔ اب دونوں بھائیوں میں کھلم کھلا معرکہ آرائی شروع ہو چکی تھی۔ بظاہر اس جنگ میں جیت کا پلہ میرزا حسین علی کی طرف جھکا ہوا تھا لیکن ابھی اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ یحییٰ صبح ازل کو پچھاڑ دیتا کیونکہ صبح ازل یعنی علی محمد باب کا خلیفہ تھا اور پورے ملک کے بابی میرزا حسین علی کو نہیں، یحییٰ صبح ازل کو جانتے تھے۔

یحییٰ صبح ازل اپنے نائی محمد علی سے روزانہ خط بنواتا تھا۔ میرزا حسین علی کی نظریں محمد علی حجام پر گڑ گئی تھیں۔ وہ کئی دن تک حجام کو آتے جاتے دیکھتا رہا پھر ایک دن میرزا آقا جان کاشانی نے نائی کو راستے میں روک لیا۔ اس سے کہا۔ "آخر تجھے تیری خدمت کا صلہ کیا ملتا ہے؟"

محمد علی حجام نے جواب دیا۔ "میں یہاں صلے کی خاطر نہیں آیا۔ دراصل میں ایک عقیدت مند اور پیروبھی ہوں۔ میں باب کے خلیفہ سے کیا لوں گا۔"

میرزا آقا جان کاشانی نے حجام کو مشورہ دیا۔ "اگر تو رازداری کا عہد کرے تو میں تیری دنیا بھی سنوار سکتا ہوں اور آخرت بھی۔"

حجام نے پوچھا۔ "میں جو باب کے خلیفہ کی خدمت کر رہا ہوں، کیا اس سے میری دنیا و آخرت نہیں سنور رہی ہے؟"

میرزا آقا جان کاشانی نے اسے سمجھایا۔ "دیکھ، مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ علی محمد باب کی طرف سے خلیفہ تبدیل ہو جانے والا ہے اور اب جو خلیفہ آئے گا، وہ میرا اپنا آدمی ہے۔ تو چاہے گا تو میں تجھے کہیں سے کہیں پہنچا دوں گا۔" میرزا آقا جان کاشانی نے باب کے نئے خلیفہ کا نام بھی بتا دیا۔ "وہ خلیفہ میرزا حسین علی، یحییٰ صبح ازل کا بڑا بھائی ہے۔"

حجام کو تشویش ہوئی۔

میرزا آقا جان کاشانی نے جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ آخر جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ "دونوں بھائیوں میں اسی بات پر اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ بڑے بھائی کو چھوٹے کے تابع کر دیا گیا اور یہ بات میرزا حسین علی کو گراں گزر رہی ہے۔ آخرکار در پردہ طور پر یہ طے پایا ہے کہ کسی بھی طرح یحییٰ صبح ازل سے نجات حاصل کی جائے۔ اگر اسے کسی طرح قتل کر دیا جائے تو خلافت بڑے بھائی میرزا حسین علی کو مل جائے گی اور باہمی اختلافات ایک دم ختم ہو جائیں گے۔"

محمد علی حجام نے پوچھا۔ "لیکن ان باتوں کا میری ذات سے کیا تعلق ہے؟"

میرزا آقا جان کاشانی نے اسے سرگوشی میں سمجھایا۔ "تو یحییٰ صبح ازل کا ہر روز خط بناتا ہے۔ اگر تیرا استرا پھسل کر صبح ازل کے گلے میں اتر جائے تو کیسا رہے گا؟ اور یہ استرا مسموم ہونا چاہیے۔"

محمد علی حجام اس تجویز سے پریشان ہو گیا، کہنے لگا۔ "لیکن جب لوگوں کو اس سازش کا علم ہو گا تو فوراً مجھے قتل کر دیں گے۔"

میرزا آقا جان کاشانی نے اسے سمجھانا شروع کر دیا۔ "اگر تو یہ کام کر دے گا تو میرزا حسین علی کی نظر میں تو بڑی اہم شخصیت بن پائے گا۔"

حجام اس تجویز کے درخشاں پہلو پر غور کرتا رہا اور آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں بھائیوں کی جنگ میں میرزا حسین علی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس سے زیادہ سرگرم دوسرا کوئی نہیں تھا۔

آخرکار محمد علی حجام نے میرزا آقا جان کاشانی کی تجویز منظور کر لی اور اس کام کے لیے دوسرے دن کو رکھا گیا۔ اس عرصے میں وہ استرے کو بہ آسانی زہر میں بجھا سکتا تھا۔

اس روز محمد علی حجام، یحییٰ صبح ازل کے پاس پہنچا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔

یحییٰ صبح ازل نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، آج تو اتنا خوش کیوں ہے؟"

محمد علی حجام نے جواب دیا۔ "میں نے آج صبح آپ کو خواب میں دیکھا۔ آپ اوپر سفر کر رہے تھے اور خوش تھے۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں اور اتنے خوش کیوں ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ خدا نے مجھے طلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے مرتبے و مقام میں اضافہ کیا گیا ہے اور میں آپ کے بلند درجات سے بے حد خوش ہوا۔"

یحییٰ صبح ازل کو شک گزرا۔ اس نے پوچھا۔ "سچ سچ بتا کہ میرزا آقا جان کاشانی نے تیرے سپرد کیا کام کیا ہے؟"

محمد علی حجام اس اچانک سوال پر اتنا گھبرایا کہ کسبت اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یحییٰ صبح ازل کو میرزا آقا جان کاشانی کی سازش سے فرشتوں نے خبردار کر دیا ہے۔ اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

یحییٰ صبح ازل نے پوچھا۔ "کیا تو یہ ساری باتیں ہم سب کے سامنے مجمع عام میں بیان کر سکتا ہے؟"

محمد علی حجام نے جواب دیا۔ "بالکل بیان کر سکتا ہوں۔"

حجام نے گری ہوئی کسبت اٹھائی اور پوچھا۔ "آپ خط بنوائیں گے؟"

یحییٰ صبح ازل نے جواب دیا۔ "تو نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے۔ اب میں تجھے کبھی بھی اپنے پاس نہیں آنے دوں گا۔"

یحییٰ صبح ازل نے سرکردہ بابیوں کو اکٹھا کیا اور میرزا حسین علی اور میرزا آقا جان کاشانی کو بھی طلب کر لیا۔ سب کی موجودگی میں یحییٰ صبح ازل نے محمد علی حجام سے پوچھا۔ "اے حجام! تو سچ سچ بتا کہ تجھے میرے قتل پر کس نے آمادہ کیا؟"

محمد علی حجام نے ساری تفصیل سب کے سامنے بیان کر دی تو میرزا آقا جان کاشانی غصے میں اٹھا اور محمد علی حجام کے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ "اتنا بڑا جھوٹ اور مجھ سے وابستہ کر دیا اور میں اس قسم کی سازش کیوں کروں گا؟"

یحییٰ صبح ازل نے حاضرین سے کہا۔ "تم سب جانتے ہو کہ علی محمد باب کا خلیفہ میں ہوں مگر ادھر کچھ دنوں سے بھائی حسین علی اور ان کے ساتھی مجھے اس مقام سے ہٹا دینے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ مجھے کھانے میں زہر دیا گیا مگر میں نے وہ کھانا اپنے

جانے سے ہٹا کر بھائی میرزا حسین علی ... کوشش کریں گے۔ میں ان سے بچ
مجھ پر الزام عائد کر دیا کہ یہ زہر میں نے ان کو دیا تھا۔ جب یہ لوگ تیسری بار کوشش کریں گے۔ میں ان سے بچ گیا۔ اب یہ لوگ

میرے قتل پر آمادہ کرنا چاہا مگر میں اس بار بھی معجزاتی طور پر بچ گیا۔ اب یہ لوگ تیسری بار کوشش کریں گے۔ میں ان سے بچ گیا۔ ''میں ان سب سے لاتعلق ہونا چاہتا ہوں۔''

میرزا آقا جان کاشانی نے بہت شور کیا۔ اسے اپنے اور میرزا حسین علی کے خلاف سوچی سمجھی سازش قرار دیا اور کہا۔ ''مجھ پر بابی ہونے کا الزام لگایا گیا تاکہ میں اس سے انکار کرتا رہا اور اس انکار کی وجہ سے ایرانی سفارت خانے میں مجھے ملازمت مل گئی۔ اب اگر ایرانی سفیر کو معلوم ہو گیا کہ میں بابی ہوں تو مجھ پر مقدمہ چلے گا اور میں ملازمت سے نکال دیا جاؤں گا اس لیے اب میں خود بھی بابیوں کے اجتماع میں شامل نہیں ہوا کروں گا۔''

ترکی میں میری حیثیت ایک سفیر بابی کی ہے۔ خود بھی اس سازشی ماحول سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ تو جو کتابیں میں نے تجھے دی تھیں، وہ کتابیں ابھی تک تیرے پاس رکھی ہیں اور تو انہیں نہ تو بغور دیکھتا ہے اور نہ مجھے واپس کرتا ہے۔''

صبح ازل نے کہا۔ ''میں نے تجھے چند کتابیں دی تھیں، وہ کتابیں ابھی تک تیرے پاس رکھی ہیں اور تو انہیں نہ تو بغور دیکھتا ہے اور نہ مجھے واپس کرتا ہے۔''

میرزا حسین علی نے اس جھگڑے کو ختم کرنا چاہا اور کہا۔ ''میرے ساتھ جو زیادتی ہوئی، میں اسے نظرانداز کرتا ہوں۔ میں بابی مذہب کے مفاد میں اپنی زہرخورانی کو بھی بھلائے دیتا ہوں اور اب بھائی یحییٰ صبح ازل کو بھی اس ذکر کو یہیں ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس سے ہماری صفوں میں اختلاف و انتشار پیدا ہوگا۔''

سرکردہ بابیوں نے بھی میرزا حسین علی کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور ترکی میں خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے اتفاق و اتحاد کی تلقین کی۔

لیکن میرزا حسین علی اور میرزا آقا جان کاشانی نے اپنی بزرگیوں کا انتقام لینے کی قسم کھائی اور نہایت غور و خوض کے بعد میرزا آقا جان کاشانی کو اس کا اختیار دیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے مگر یحییٰ صبح ازل کو معاف نہ کرے۔

میرزا آقا جان کاشانی کے سازشی دماغ نے ایک نئی سازش تیار کر لی۔ اس نے یحییٰ صبح ازل کی طرف سے باب عالی (خلیفہ عثمانیہ) کے نام ایک خط لکھا۔

''ہم علی محمد باب کے پیروجوان دونوں ہزاروں کی تعداد میں ترکی میں جمع ہو گئے ہیں، خلیفۃ الباب یحییٰ صبح ازل کی سرپرستی اور نگرانی میں ترکی سلطنت کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اگر باب عالی اس ذلت اور شرمندگی سے بچنا چاہتے ہیں جو مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کا مقدر ہو گئی ہے تو وہ بابی دین میں آ جائیں۔ اگر بابی دین کو سرکاری مذہب قرار دیں تو انہیں معاف کر دیا جائے گا ورنہ ہم ہزاروں بابیوں کا لشکر اچانک نمودار ہوگا اور یہ سیلاب خس و خاشاک کی طرح باب عالی اور اس کی حکومت کو بہا لے جائے گا۔ ہمیں خدا کی طرف سے یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ فوج کشی سے پہلے باب عالی کو خبردار کر دیا جائے۔''

اس خط نے ترکی حکومت کو ہیجان میں مبتلا کر دیا اور باب عالی کی فوجیں حرکت میں آ گئیں۔ یحییٰ صبح ازل کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ میرزا حسین علی بھی ترک فوجوں کی حراست میں تھا۔ یحییٰ صبح ازل کو عثمانی فرمانروا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے انکار کیا کہ یہ خط میں نے نہیں لکھا ہے۔

ترک فرمانروا نے پوچھا۔ ''اگر یہ خط تو نے نہیں لکھا تو پھر کس نے لکھا؟ اس شخص کی نشاندہی کر ورنہ حکومت یہی سمجھے گی کہ یہ خط تیری طرف سے لکھا گیا ہے۔''

یحییٰ صبح ازل نے خاموشی سے میرزا آقا جان کاشانی کا نام لیا اور کہا۔ ''یہ شخص جو ایرانی سفارت خانے میں کام کرتا ہے، بابی ہے اور ان دنوں ہمارے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔''

یحییٰ صبح ازل کی نشاندہی پر میرزا آقا جان کاشانی کو گرفتار کر لیا گیا اور اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔ ایرانی سفیر اس کو غیر بابی کہہ رہا تھا مگر ترکی حکومت اسے بابی ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایرانی سفیر کو آگاہ کیا گیا۔ ''ہمیں میرزا آقا جان کاشانی کے گھر کی تلاشی لینا پڑے گی اور وہاں سے کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور مل جائے گی جس سے اس کا بابی ہونا ثابت ہو جائے گا۔''

ایرانی سفیر نے ترک حکومت کو اجازت دے دی بلکہ ایرانی سفیر بھی ترک حکومت کے ساتھ تلاشی لینے والوں میں شامل

یحییٰ صبح ازل

ہو گیا۔ میرزا آقا جان کاشانی کے گھر میں ابھی تک یحییٰ صبح ازل کی کتابیں موجود تھیں۔ تلاشی کے دوران یہ کتابیں دستیاب ہو گئیں اور میرزا آقا جان کاشانی کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

میرزا حسین علی کو اس کی گرفتاری سے بے حد دکھ پہنچا۔ اس نے در پردہ کوشش کی کہ وہ رہائی پا جائے مگر ترکی حکومت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بابی کو بدترین سزا دے گی۔

ابھی سوال جواب باقی تھے۔ یحییٰ صبح ازل نے میرزا آقا جان کاشانی کو کہلوا [illegible] ہے؟

میرزا آقا جان کاشانی نے جواب میں کہلوایا۔ "میں خلیفۃ الباب یحییٰ صبح ازل کی دشمنی میں اندھا ہو گیا تھا اور [illegible] سازشوں میں مشغول رہتا تھا۔ خدا نے مجھے یہ سزا دی کہ آج موت میرے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔"

میرزا آقا جان کاشانی پر ایسا خوف طاری ہوا کہ جب وہ رات کو قید خانے میں ڈالا گیا تو اس کے سر کے سارے بال سیاہ تھے لیکن دوسرے دن صبح قید خانے میں کھانے پینے کی چیزیں پہنچائی گئیں تو قید خانے کے محافظ نے قید خانے میں سیاہ بالوں والے کی جگہ سفید بالوں والے قیدی کو اکڑوں بیٹھے دیکھا۔

میرزا آقا جان کاشانی رات بھر میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ لوگوں کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو اس کا دیدار کرنے والوں کا ہجوم قید خانے کے سامنے جمع ہو گیا مگر اسے ایک خطرناک قیدی قرار دیا گیا تھا اس لیے اسے ہجوم کے سامنے نہیں لایا گیا۔

اس پر مقدمہ چلا اور عمر قید ہو گئی۔ وہ عمر قید نہیں جو چودہ سال یا سات سال بھی [illegible] ہے۔ اسے زندگی بھر کے لیے قید خانے میں ڈال دیا گیا لیکن ساڑھے چار ماہ بعد اچانک اسے رہا کر دیا گیا۔ اس کی رہائی سے یحییٰ صبح ازل اور میرزا حسین علی، دونوں ہی خوش نہیں تھے کیونکہ اب وہ بابیوں میں ترکوں کے جاسوس کی حیثیت سے پہچانا جا رہا تھا اور شاید اسی وعدے پر اس کی رہائی عمل میں آئی تھی۔

اب بابی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور دونوں ہی آپس میں برسرِپیکار رہنے لگے تھے۔ ترکی حکومت نے ایرانی حکومت کو مطلع کیا کہ اب وہ ان کو ترکی میں نہیں رہنے دیں گے کیونکہ دونوں نے ترکی کی فضا خاصی مکدر کر دی ہے۔

ایرانی حکومت نے ترک حکومت کو اختیار دیا کہ وہ ان دونوں کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ دیں۔ ایرانی حکومت اس میں دخل نہیں دے گی۔

یحییٰ صبح ازل نے شادی کر لی تھی اور اس کی اولادیں بھی اس کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ دوسری طرف میرزا حسین علی بھی شادی شدہ تھا اور اس کی اولادیں بھی اس کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔

ترکی حکومت نے کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ دونوں کو ترکی سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ میرزا حسین علی کو عکا (شام) روانہ کر دیا گیا اور یحییٰ صبح ازل کو جزیرہ قبرص کے شہر ماغوسا پہنچا دیا گیا۔ ان دونوں کے ساتھ ساتھ چار چار چھ چھ بابی بھی بھیجے گئے تھے۔ یحییٰ صبح ازل کے ساتھ جو چھ آدمی بھیجے گئے تھے، وہ در حقیقت میرزا حسین علی کے آدمی تھے اور میرزا حسین علی کے ساتھ جو چار آدمی بھیجے گئے تھے، وہ حقیقتاً یحییٰ صبح ازل کے آدمی تھے۔ ان میں میرزا آقا جان کاشانی بھی شامل تھا اور یہ عثمانی سلطنت کا جاسوس تھا۔

جب میرزا حسین علی کو اس کے جاسوس ہونے کا شبہ ہوا تو نہایت بے دردی سے قتل کروا دیا گیا۔

یحییٰ صبح ازل ایک جزیرے میں قیدی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ یہاں سے وہ کہیں اور نہیں جا سکتا تھا۔ اب چونکہ بابیوں سے اس کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا اس لیے بابی دین کی اشاعت کا سلسلہ بھی رک گیا اور دنیا والے صبح ازل کو ڈھونڈتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ آج جب بابی اور بہائی مذاہب کا ذکر ہوتا ہے تو کوئی یحییٰ صبح ازل کا نام نہیں لیتا۔

قبرص میں یحییٰ صبح ازل کا کیا انجام ہوا، دنیا نہیں جانتی لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ 1908ء تک زندہ تھا اور جن لوگوں نے اس سے ملاقات کی، وہ بتاتے ہیں کہ اسے سب سے زیادہ نقصان اس کے بڑے بھائی میرزا حسین علی نے پہنچایا کیونکہ یہی میرزا حسین علی بعد میں بہاء اللہ کہلوایا اور بہائی مذہب اس سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

(ختم شد)

مضمون کے مآخذ

ائمہ تلبیس، ابوالقاسم رفیق دلاوری۔

فرقے اور مسالک، ہلال زبیری۔

... علی محمد باب

urdunovels.com

تریاق

فرح بخاری

معاشرہ جب اخلاقی انحطاط و دیگر برائیوں کا شکار ہوجائے تو تباہی یقینی ہے... ایسے میں فردِ واحد بھی اس کے سدھار میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے... اور پھر اسی طرح قافلہ بنتا جاتا ہے... اس نوجوان میں بھی کچھ کرگزرنے کا حوصلہ تھا... اس کے ارادے مضبوط اور عزم چٹانی تھا... الجھی گتھیوں کو سلجھانا اس کا پیشہ تھا... مگر خود اس کی زندگی کے کچھ باب الجھے ہوئے تھے جنہیں سلجھانے کے لیے ہی وہ کمر کس کر اور سینہ تان کر میدان میں اترا تھا اور اسے ہر حال میں منزل پر کامیابی سے پہنچنا تھا۔

الجھے معمے سلجھانے والے ایک پُرعزم نوجوان کی داستان

چنار کے طویل قامت درخت، شام کے نیم تاریک سایوں میں کچھ عجیب پراسرار سا تاثر دیتے ایک تواتر سے گزر رہے تھے۔ تحسین نے ذرا بے چین ہو کر موبائل میں وقت دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں مکمل رات ہونے والی تھی۔ افنان کھانے پینے کا کچھ زیادہ ہی شوقین تھا۔ راستے میں رک رک کر آتے چترال پہنچنے تک اندھیرا ہو چکا تھا۔ تحسین کو دور تک بھی سڑک ہی دکھائی دے رہی تھی۔ آبادی شاید پہاڑوں کے پیچھے کہیں ہو۔ پر کامل یقین تھا کہ جتنی بھی نزدیک ہو، کسی ہوٹل پہنچنے تک رات ضرور ہو جاتی ہے۔

"ہوٹل ہم نے پہلے سے بک کیوں نہیں کروایا افنان؟"

"یار! میں تو دوستوں کے ساتھ بہت گھومتا پھرتا ہوں۔ مجھے تو کبھی یاد نہیں کہ ہم نے ہوٹل پہلے سے کبھی بک کروایا ہو۔"

"لیکن یہ تو ہنی مون تھا۔" تحسین نے منہ بسور کر افنان کو دیکھا۔ "تھوڑا اسپیشل لینا تھا۔"

"ارے واہ! تو ہے نا اسپیشل۔ گھوم پھر کر اپنی مرضی کا کوئی ہوٹل پسند کرنا۔" افنان نے پیار سے اپنی دلہن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"بس رہنے دو۔" تحسین نے مصنوعی خفگی سے ہاتھ ہٹایا۔ "بے وقت ہو گیا، ابھی ہم چترال سٹی تک نہیں پہنچے۔ پتا نہیں کیسی جگہ ملے گی۔"

"اچھا سوچتے ہیں ڈیئر وائف ــــ! اور اگر کچھ نہ ملا تو کار کو ہماری یادگار رات ــــ"

"شٹ اپ افنان!" وہ مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے ہنس پڑی۔

وہ دونوں اپنی کار میں اسلام آباد سے روانہ ہوئے تھے۔ ان دونوں کی شادی ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی۔ اگرچہ لو میرج تھی لیکن افنان اور تحسین پہلے سے ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ ایک اتفاقی ملاقات نے ان دونوں کو ایسے ملایا کہ افنان کو وہ معصوم سی لڑکی پہلی نظر میں بے حد پسند آ گئی۔

دیا، جس کے جواب میں ...

...وٹ کروایا۔

چند روز کی بات چیت کے بعد ملنے کی نوبت آئی اور اذکان نے پہلی ملاقات میں ہی اسے پرپوز کر دیا تھا۔

اس کی امی جاب کرتی تھی، اس کی امی اس کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھیں۔ اذکان نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی اور کو پسند کر بیٹھیں اور آپس میں کسی اختلاف کی نوبت آجائے اور اگرچہ اس کی نوبت بھی آہی گئی کیونکہ والدہ قدسیہ ایک کالج میں لیکچرار تھیں اور انہوں نے پہلے ہی چند لڑکیاں پسند کر رکھی تھیں، لیکن اذکان نے ضد ہی باندھ لی تھی۔

اذکان کے والد اظہر حسین پیشے سے ڈاکٹر تھے اور ایک نہایت ہی نرم طبیعت کے انسان تھے۔ انہیں ماں، بیٹے کی کھینچا تانی برداشت نہ ہو رہی تھی۔ تبھی قدسیہ کو ہی دبے لفظوں میں سمجھا دیا کہ اذکان کو اس کی مرضی کی زندگی جینے دی جائے۔ قدسیہ بھی چپ ہو گئیں۔ اذکان ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ بڑے ہی ناز و نعم میں پلا تھا اور شاید یہ اسی لاڈ پیار کا نتیجہ تھا کہ اذکان قدرے ضدی واقع ہوا تھا۔ اسے جب بھی کچھ پسند آیا، اس نے لے کر ہی دم لیا تھا۔ قدسیہ کبھی کبھار بہت پریشان ہو جاتی تھیں یہ سوچ کر کہ کچھ دراڑیں تو لائف میں کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ہر بار برداشت نہ کر پانا بھی کبھار انسان کی زندگی مشکل بنا دیتا ہے۔

بہر حال تحسین دلہن بن کر اذکان کے گھر اس کے جیون میں آ گئی۔ اذکان کو شادی کے لیے دس روز کی چھٹی ملی تھی جس میں شروع کے چار پانچ دن تو دعوتوں وغیرہ میں نکل گئے جبکہ ... اس کی اولین ترجیح تھا۔ اس لیے پچھلے روز صبح سویرے وہ دونوں ... کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

''میں چاہتی تھی ہم سیف الملوک دیکھیں، بری ... جائیں یا پھر کالام وغیرہ۔''

''یار ان سب جگہوں پر گرمیوں میں ... ہوتا ہے۔ میں بہت ... لوگوں سے۔''

بھرے کہیں کوئی اور نہ ہو۔"

"ہاں...... اور پھر ہم ہوا کھائیں، ہوا پئیں اور ہوا اوڑھ کر سو جائیں۔" اس نے منہ بسورا۔

"وہ دیکھو، چترال کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ تم گھبرا رہی تھیں کہ رات ہو جائے گی۔" افنان نے بلاوجہ سامنے اشارہ کیا تو تمکین نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔

سفر نے تو خوب ہی تھکا دیا تھا۔ اچھا ہوٹل بھی بہ آسانی دستیاب ہو گیا تھا۔ دونوں فریش ہو کر کھانا کھانے باہر نکلے۔ چھوٹا سا ایک بازار تھا، یہاں بھی سیاح تو موجود تھے لیکن نسبتاً کم۔ دونوں نے بازار سے نکل کر کچھ دور تک چہل قدمی کی لیکن دونوں کا ارادہ ہی آج ریسٹ کر کے اگلی صبح گھومنے پھرنے کا تھا۔ چلتے چلتے افنان نے چپکے سے اپنا ہاتھ تمکین کی انگلیوں میں پھنسایا۔ اس کے ہاتھ کی گرمی اور انگلیوں کے نرم سے دباؤ پر تمکین نے ہنس کر منہ پھیرا۔ شوہر کا خاموش خوبصورت اظہار لفظوں کا محتاج کہاں ہوتا ہے۔ اس نے پہلے اپنے قدم روک کے پھر واپسی کے لیے موڑ لیے، جس پر افنان نے ہاتھ چھوڑ کر باقاعدہ اپنا بازو اس کی کمر میں حمائل کر کے اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ جس جگہ سے وہ چلے تھے وہاں نیم تاریکی تھی۔ تھوڑا آگے آنے پر وہ اس سے کچھ فاصلے پر ہو گئی۔

افنان کا پروگرام تھا کہ اگلے روز وہ اسے گرم چشمہ اور کچھ فورٹس دکھانے لے جائے گا۔ تمکین ذاتی طور پر تاریخی مقامات میں زیادہ دلچسپی نہ رکھتی تھی لیکن افنان کو ابھی جاننا شروع کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش میں خاموشی سے اس کی مرضی کے مطابق چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گزرے ایک ہفتے میں کسی حد تک محسوس تو ہوا کہ افنان عام لڑکوں سے ذرا ہٹ کر ہے، لیکن یہ سوچ کر اگنور کیا کہ جاننے کے مرحلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دھیرے دھیرے لائف ایک دم رواں ہو جاتی ہے۔ نئی شادی تو ویسے بھی ایک نیا جہان دریافت کرنے کے مترادف ہے۔

☆☆☆

"گڈ مارننگ، سویٹ ہارٹ!" افنان نے ماتھے پر آئی تمکین کی لٹ چہرے سے ہٹائی تو اس نے مسکرا کر مندی آنکھوں سے افنان کو دیکھا۔

"گڈ مارننگ!" اس نے لاڈ سے افنان کے گلے میں بانہیں ڈالنا چاہیں لیکن افنان نے اس سے بھی زیادہ نرمی سے اس کے بازو پیچھے ہٹا دیے۔

"اس وقت کسی "جھپّی" میں پھنسنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ فوراً اٹھ جاؤ، ہم نے جلدی نکلنا ہے۔ فورٹس وغیرہ پر دوپہر کو دھوپ بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اٹھو شاباش۔" وہ اس کے بال بکھیر کر بیڈ سے کھسک گیا اور تمکین عجیب سی نظروں سے افنان کے بدلتے روپ کو دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی کچھ نہ سمجھ میں آنے والا کیریکٹر تھا۔ وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بستر سے نکل کر فریش ہونے چلی گئی۔

ایون فورٹ آبادی سے کافی ہٹ کر چند خشک پہاڑیوں کے پیچھے ایک بالکل ہی ویران جگہ پر تھا۔ افنان بھی پوچھتے پوچھتے وہاں تک پہنچا تھا۔ اگرچہ لوگوں سے پتا بھی چلا تھا کہ وہاں تک صرف جیپ ہائر کر کے جایا جاتا ہے لیکن اس نے ان سنی کر دی۔ حالانکہ راستہ واقعی بڑا دشوار تھا۔ چند ایک جگہوں پر تو سڑک اتنی تنگ اور خستہ تھی کہ سانس گلے میں اٹکی گئی۔ تمکین کو اب باقاعدہ افنان پر غصہ آنے لگا تھا۔ نہ جانے کہاں کی سیریں کروانے لے آیا تھا۔ یہ ہنی مون تھا یا خوار ہونے کی کوئی پکنک۔ وہ بڑی مشکل سے ضبط کر کے بیٹھی تھی۔ اپنا موڈ تو خراب تھا ہی، ڈرائیونگ کرتے افنان کا پارہ ہائی کرنا فی الوقت اسے مناسب نہیں لگا۔ بہر حال خستہ حال سڑک کا انجام ہوا اور وہ ایک غیر آباد علاقے کے نہایت قدیم فورٹ تک آ پہنچے۔

فورٹ خوبصورت بھی تھا اور پراسرار بھی۔ موسم بھی کچھ گدلا سا ہونے لگا تو ماحول کی رومانویت کچھ اور بڑھ گئی۔ تمکین کا موڈ تو فریش ہو گیا لیکن افنان اسے کچھ تھکا تھکا سا محسوس ہوا۔ اسے ایک دو کالز بھی آ گئیں، جنہیں سننے کے لیے اسے سائڈ پر جانا پڑا۔

"کیا ہوا، کون فون کر رہا ہے؟" تمکین اپنا میک اپ فریش کر کے اب اپنی سیلفیز لے رہی تھی۔

"یار! چھٹی کا مزہ غارت کر کے رکھا ہوا ہے، بار بار کسی کام سے کال کر دیتے ہیں۔"

"اچھا تو موبائل آف کر دیں۔ فوٹو گرافی کرتے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ غائب دماغی سے اس کی تصویریں بنانے لگا۔

فورٹ کو اندر سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن راستہ کچھ پیچیدہ سا تھا۔ بیرونی جانب البتہ پتھریلی سیڑھیاں تھیں۔ اگرچہ ٹوٹی پھوٹی سی تھیں لیکن اوپر چڑھا جا سکتا تھا۔ دھوپ بھی کھل ہی نکل آئی تھی۔ اوپر چڑھنے کی ضد بھی افنان ہی کر رہا تھا حالانکہ تمکین اب تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی، پھر بھی اس کا کہنا مان کر اوپر آ گئی۔ چھت ایک دم کشادہ تھی۔ ایک جانب پتھریلی منڈیر بنی تھی۔ وہ دونوں اس جگہ کا

urduvision.com

خوبصورت ویو دیکھتے ہوئے وہاں تک آ گئے۔ تمکین نے منڈیر سے جھانکا تو سانس اٹک گئی۔ فوراً ہی پیچھے ہوئی۔

"باپ رے...... بہت اونچی جگہ ہے۔ جھانکنے پر زمین بہت نیچے کہیں دکھائی دی۔" وہ ہنس کر پلٹی لیکن افنان کہیں دکھائی نہیں دیا تو اس کے لب سٹ گئے۔ یہ نہایت غیر متوقع تھا۔

"افنان......!" وہ حیرت سے سیڑھیوں کی طرف بھاگی کیونکہ اس کھلی کشادہ چھت پر تو سب دور دور تک واضح تھا۔ اتنی سی دیر میں افنان واپس کیوں چلا گیا؟ وہ سیڑھیوں پر آئی تو نظر نیچے پڑی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ جو دکھائی دیا وہ تعجب خیز تھا لیکن تمکین کو اس حیرت کے جھٹکے سے نکلنے کی مہلت بھی نہیں ملی اور فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ گولی اوپر پہلی سیڑھی پر کھڑی تمکین کے حلق کو چیرتی ہوئی پیچھے نکل گئی۔ توازن بگڑا اور وہ پتھریلی سیڑھیوں سے لڑھکتے نیچے زمین پر آ رہی۔ گردن سے خون فوارے کی طرح چہار جانب پھیل چکا تھا۔ وجود شاید گرنے کے دوران ہی کہیں بے جان ہوا اور اب خشک پتھریلی زمین پر تمکین پھٹی بے جان آنکھوں کے ساتھ چت پڑی تھی۔ لبوں پر مچلتے سوالوں کو زبان تو نہ دے پائی تھی پر ایک تحیر تھا جو اس کی ساکن پھٹی آنکھوں میں ثبت ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"اس قبیلے کو ہمیشہ ایک ایسے مسافر کی تلاش اور انتظار رہتا تھا جو بالکل یکا و تنہا ہو۔ کیلاش کے اس دور افتادہ گاؤں میں رہنے والے اس ہندو قبیلے کا باقی ہندو برادری کے ساتھ بھی آنا جانا نہیں تھا۔ وہ اپنی عجیب و غریب رسومات اور عادات کی بنا پر برسہا برس سے باقی دنیا سے تقریباً کٹے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کے ٹو (K-2) کے ایک دیوتا کی کھوج میں نکلنے والے یہ لوگ بالآخر ایک خاندان کی صورت یہاں آباد ہوئے اور پھر ایک قبیلہ بن گئے۔ پہاڑوں کے علاوہ کہیں بھی رہائش اختیار کرنا ان کے بس کی بات نہ رہا تھا۔ وہ پہاڑوں کے شیدائی تھے، غاروں میں اپنے دیوتا کی تلاش میں بھٹکتے تھے۔ میدانوں سے انہیں ایک چڑ، ایک نفرت سی تھی کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ان کا دیوتا جو پہاڑوں کی طاقت حاصل کرنے گیا تھا، اسے اونچائیوں سے عشق تھا اور اسی عشق کا سودا نسل در نسل برقرار رکھنے کے لیے وہ بھی پہاڑوں سے ہٹ کر کچھ نہ سوچتے تھے۔

"تو......؟" روشن آرا نے قدرے اشتیاق سے آگے کو جھکتے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تو...... وہ اکیلے مسافر سے کیا چاہتے تھے؟"

"ہاں...... وہ......" امجد نے صفحہ پلٹتے ہوئے کچھ دیر خاموشی سے مطالعہ کیا پھر لبوں کو بیٹی کے انداز میں آپس میں سکوڑ کر ماں کو دیکھا۔ امجد کی آنکھوں میں بھی اب ایک بے چینی اور اضطراب دکھائی دینے لگا تھا۔ روشن آرا اسے تجسس اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ لوگ چونکہ ابھی تک اپنے دیوتا کو تلاش کرنے میں ناکام ہی رہے تھے، تو ان کے چند ایک عقائد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دیوتا کو کسی مہم جو کی بھینٹ دی جائے۔ مطلب کہ بلی (قربانی) چڑھائی جائے۔"

"مہم جو ہی کیوں......؟"

"شاید اس لیے کہ مہم جو بھی پہاڑوں سے پیار کرتا ہے۔"

"یہ سب کوئی افسانہ ہے امجد؟" روشن آرا کے لہجے میں نہ جانے کیوں ایک امید سی تھی، جیسے امجد اسے ایک فرضی قصہ کہہ دے گا۔

"نہیں۔ یہ افسانہ نہیں ہے۔" اس نے بات کے دوران صفحے میں انگلی پھنسا کر اسے بند کرتے ہوئے اس کا کور دوبارہ دیکھا۔ "یہ آتھر ہیں...... فیلیکس کوڑلو۔ رشین کوہ نورد ہیں۔ ان کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ مجھے پچھلے دنوں پنڈی کی ایک اولڈ بک شاپ سے ملی یہ کتاب، تو خرید لی۔ یہ سفرنامے لکھتے ہیں۔" امجد اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ماں کو اس نے کتاب کے متعلق جتنا معلوم تھا، وہ بھی بتایا۔

"تو کوئی انہیں روکتا کیوں نہیں؟ یہ تو زیادتی ہے۔ معصوم بے گناہ مسافروں کے ساتھ ایسا سلوک۔ کیا کوئی انسان اپنا شوق بھی پورا نہ کرے۔ وحشی ہیں، قاتل ہیں۔ یہ تو......"

"ارے، آپ اتنا کیوں سوچنے لگیں؟ کتنی پرانی کتاب ہے۔ معلوم نہیں اب وہ قبیلہ باقی بھی ہے یا نہیں، جانے وہاں کوئی جاتا بھی ہے یا نہیں؟ آپ بلاوجہ حساس ہو جاتی ہیں۔"

"ہاں بیٹا! کہنے کو بڑھاپا "محرومی" میں اضافے کا دوسرا نام ہے۔ جہاں یہ ہم سے ہماری کئی طاقتیں، حسیں، تو تیں واپس لینا شروع کر دیتا ہے۔ واحد حساسیت وہ چیز ہے، بڑھتے وقت کے ساتھ جس میں صرف اضافہ ہی ہوتا ہے۔"

"اچھا، کوئی ضرورت نہیں زیادہ حساس ہونے کی۔ اچھی اچھی خوشگوار سوچوں کو ذہن میں جگہ دیں۔ پوزیٹو سوچا کریں۔"

"ہوں۔ تم کہو، کوئی نیا کام ابھی نہیں ملا؟"

"لگتا ہے ملنے والا ہے۔ مجھے فرمان انکل کی کال آئی تھی، عابد ماموں کے دیرینہ دوست ہیں۔ یہ بھی ریٹائرڈ ہیں

آج کل۔ ضرور کوئی کام ڈے لگنے والا ہے۔"
"تم نے بھی کیسے کام میں ہاتھ ڈالا ہے۔ ماں تو تسبیح ہاتھ میں لیے تیری خیر و عافیت کی دعائیں ہی مانگتی رہتی ہے۔"
روشن آرا نے منہ بسور کر بیٹے کو دیکھا جس پر وہ ہنستے ہوئے ماں کے قریب آیا اور انہیں اپنے بازو کے گھیرے میں لیا۔
"خطرہ آج کل کہاں نہیں ہے میری ماں؟ راہ چلتے دن دیہاڑے آپ کو لوٹ کر سڑک کنارے پھینک دیا جاتا ہے۔ میری کوشش تو ان ظالموں تک پہنچنا ہے جو معصوم شہریوں کے لیے ایک کھلا تھریٹ ہیں۔"
"ہاں تو ماموں کی طرح پولیس میں چلے جاتے۔"
روشن آرا مطمئن دکھائی نہ دیں۔
"ارے میری ماں! یہ پولیس، آرمی، انٹیلی جنس، سراغ رسانی تو بس نام ہیں۔ جان تو سبھی نے ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے، بلکہ میرے معاملے میں تو زیادہ لوگوں کو علم نہ ہونا ایک لحاظ سے فائدے میں جاتا ہے۔ اگرچہ میں نے یہ سوچ کر سراغ رسانی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ آپ تو جانتی ہیں، بس شروع سے مزاج ہی ایسا تھا۔"
"ہاں۔" روشن آرا کچھ سوچ کر ہنس دیں۔ "ایک کھوجی طبیعت تھی تمہاری بچپن سے ہی۔ تمہیں ہمیشہ ہر چیز کا ماخذ ڈھونڈنا ہوتا تھا۔ یہ کام کیوں ہوا، کیسے ہوا، کس نے کیا......؟ تمہارا باپ کہتا، یہ لڑکا بس انہی سوالوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔"
"ہاں...... لیکن......" اسجد نے بے ساختہ ایک ٹھنڈی آہ بھری۔
"اچھا بس۔" روشن آرا نے وہیں بیٹے کو ٹوک دیا اور جلدی سے اٹھ کھڑی ہوگئیں۔ "تم بھی ٹائم پر سو جاؤ اور...... کتنے بجے جانا ہے فرمان سے ملنے؟"
"دس بجے تک جاؤں گا۔" وہ ماں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس بھری دنیا میں اس کا ماں کے سوا تھا ہی کون...... اور وہ سادہ دل عورت بھی انتہا کی حساس ہو چکی تھی۔ بلکہ اسجد نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا، ماں کو ایسے ہی وہمی، کمزور دل ہی دیکھا تھا۔ حالانکہ روشن آرا اسے بتاتی تھیں کہ وہ بڑی بے فکری اور مضبوط اعصاب کی بہادر خاتون تھیں لیکن اسجد تو سن کر ہنس ہی دیتا۔ کہتا، وہ بے فکری اور ماں ہوگی۔ لگتا ہے میرے حصے میں سوتیلی آئی ہے۔ تب روشن آرا اسے چپل کھینچ مارتیں۔
پر کہیں نہ کہیں اسجد انہیں درست تو سمجھتا ہی تھا۔ وجہ بھی بڑی سیدھی اور سمجھ میں آنے والی تھی۔ سات سال کی عمر میں وہ یتیم ہو گیا تھا۔ اس کا باپ اس کا آئیڈیل، اس کا دوست، اس کا مضبوط سہارا تھا جس سے اس کا ہاتھ جب اچانک چھوٹا جبکہ ابھی وہ دنیا کو سمجھنے کے مراحل میں تھا۔ اس کی ننھی سی یادداشت میں چند ایک نہایت تکلیف دہ یادیں تھیں، جن میں سب سے مضبوط سب سے گہری یاد جو شاید ہمیشہ کے لیے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی، وہ یہی کہ اس کا باپ قتل ہوا تھا، لیکن اس کا قتل ایک معما تھا جو کبھی دنیا سے حل نہ ہوا تھا۔
وہ جانتا تھا، اس کی ماں کتنی بہادر عورت ہے۔ بھلا وہ کیوں جھوٹ بولے گی کہ کبھی وہ بڑی بہادر ہوا کرتی تھی۔ یقیناً اس حادثے نے ایک معصوم سے کوئی نہیں، ایک ہنستی مسکراتی عورت کی زندگی کو بھی اندھیروں میں دھکیلا تھا۔ شوہر کی اچانک موت نے اس کی ماں کو بے فکری سے وہمی، بہادر سے بزدل اور مضبوط سے ایک دم کمزور اعصاب کا بنا دیا تھا اور یہ وہی جانتا تھا کہ یہ بزدلی، وہم، کمزوری اس کی ماں اس کا کس قدر قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی یہ تصور میں نہیں لانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کھو دے گا تو اس کا کیا بنے گا۔ یقیناً وہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔
وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک گہری سرد آہ باہر کو چھوڑتے ہوئے اس نے دیوار پر لگی اپنے بابا کی تصویر کو دیکھا اور پھر کارنس پر سجی چھوٹے فریم میں لگی اس کی شیلڈ جو کہ اسے کریمنالوجی کی ڈگری حاصل ہونے پر ملی تھی۔ سات سال کی عمر سے ہی دماغ خود بخود ان خطوط پر استوار ہوا تھا کہ اسے اپنے باپ کے قاتلوں کو کھوجنا ہے۔ وہ قتل جس کا معما حل کرنے میں دنیا ناکام رہی تھی، اسے وہ خود سلجھائے گا۔ تبھی اس نے سراغ رساں بننے کا فیصلہ کیا تھا اور بتدریج تعلیمی مدارج طے کرتے آگے بڑھتے بالآخر ایک لائن مقرر کر ہی لی اور اب وہ عرصہ دو سال سے باقاعدہ ڈگری شدہ پرائیویٹ ڈیٹیکٹیو تھا۔

☆☆☆

جاتا سرما یہاں بڑا خوش آئند تصور ہوتا تھا۔ کچھ ہفتے پہلے ہوا کہ دھوپ بڑی نکھری نکھری سی تھی۔ برف پگھل چکی تھی، راستے صاف ہو رہے تھے۔ دوسرے علاقوں کی طرف معمول کا آنا جانا شروع ہوتے ہی کاروبار چمک اٹھتے تھے۔ چہروں پر جھلکتی رونق بھی چمکتی دھوپ سے کم نہ تھی۔ بیٹھکوں، ڈیروں کی رونق بھی مہمانوں کی آمد کی وجہ سے بڑھ جاتی۔ پر یہ سردار خمیر جان کا ڈیرا تھا، جہاں صبح سویرے ہی عجیب سوگ بھری خاموشی چھائی تھی۔ ملازمین یوں دبے پاؤں کام انجام دے رہے تھے کہ ذرا سی چاپ

بھی گویا جرم گردانی جائے گی۔ وجہ سردار ضمیر کا وہ غصہ تھا جو پچھلی شام سے معمولی سا بھی کم ہونے میں نہ آرہا تھا۔

"عدالت......؟" ضمیر جان نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کوئی تیسری مرتبہ دہرایا۔ "ولید عدالت جائے گا......اوئے بدبختا! یہ کس نے بتا دیا؟ ہمارا فیصلہ تو جرگے میں ہو چکا تھا۔ اس کے باپ نے خود جرگہ بلایا تھا۔ یہی فیصلہ ہوا تھا، پورا گاؤں گواہ ہے۔ فورٹ شاہزئی اب دلاور جان کے بعد اس کے چھوٹے بھائی ضمیر جان کا کسٹڈی میں آگیا ہے۔"

"خان! بات پکی ہے۔"

"ارے پکی ہے تو پتا کرو، کون بدبخت اس کا کیس لڑ رہا ہے، کس کا شامت آیا ہے۔ جاؤ، مرزا! چوبیس گھنٹے میں اس بندے کا نام پتا معلوم کرکے لاؤ۔ اس کو بھی پتا چلے کہ وہ کس بے ایمان کا کیس لڑ رہا ہے۔ جرگے کے ممبر اس کو بھی معاف نہیں کریں گے۔ یہ جھوٹا بچہ کا بچہ بتا کر کام نکلوانا چاہتا ہے۔ میں بتاؤں گا اس وکیل کو کہ یہ کیس ہاتھ ڈالنے کا نہیں ہے۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا، فیصلہ ہو چکا ہے۔" ضمیر جان ایک تواتر سے بولتے چلے گئے اور اعظم علی سر جھکا کر ہدایات سنتا مؤدب سا واپس پلٹ گیا۔

"ضمیر جان کے بڑے بھائی امیر جان کا ابھی ایک برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ ضمیر جان بال بچے دار آدمی تھا جبکہ امیر جان نے کئی برس تک بے اولاد رہنے کے بعد بالآخر ایک بچہ گود لے لیا تھا۔ البتہ ایک دن کا بچہ گود لیتے ہی ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوا دیا لیکن دنیا بہرحال جانتی تھی کہ وہ لے پالک ہے۔ خود امیر جان بھی اگرچہ یہ بات کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ان کے ولید خان کو کوئی لے پالک سمجھے لیکن ایک وراثتی معاملہ ایسا آگیا کہ انہیں بھرے جرگے میں باقاعدہ کچھ اعلان کرنا پڑ گئے۔ ان کے آباؤ اجداد چترال کے مضافاتی علاقوں کے مالک تھے۔ گاؤں کے گاؤں ان کی ذاتی جاگیر تھے۔ انہی جاگیروں میں کچھ پرانے قلعے بھی ان کے تصرف میں تھے اور ظاہر ہے باقی جائداد کے ساتھ ان قلعوں کا قبضہ بھی نسل در نسل منتقل ہو رہا تھا۔ امیر جان نے جب اپنا ذاتی مکان، چند ایک جنگلات، فارم ہاؤسز وغیرہ اپنی زندگی میں ہی ولید خان کے نام کر دیے تو خاندان کے بزرگوں میں قلعوں کی منتقلی کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ قلعے ایک طرح سے سیاحوں کے لیے پکنک اسپاٹ تھے۔ خاندان کے بزرگوں نے ضمیر جان کی توجہ اس جانب دلائی کہ قلعوں کا قبضہ وہ ایک لے پالک کو نہیں جانے دینا چاہتے۔ یہ آثارِ قدیمہ خاندان کا ورثہ ہیں اور انہیں اسی خاندان میں رہنا چاہیے۔ ضمیر جان نے معاملہ بڑے بھائی کے سامنے رکھا اور انہیں بھی بات کی اہمیت کا ادراک ہوا اور نہ صرف امیر جان نے اس کی تائید کی بلکہ گاؤں کا جرگہ بلوا کر باقاعدہ اعلان کر دیا کہ قلعے اب سے امیر جان کے چھوٹے بھائی ضمیر جان کی ملکیت ہوں گے اور اسی کی نسل میں منتقل ہوں گے۔ پھر لے پالک بیٹے ولید خان کو اپنا سب کچھ تو وہ دے چکے تھے، وہ بھی محروم کہاں تھا کہ انہیں کچھ افسوس ہوتا۔

البتہ وہاں موجود کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ جرگے میں بیٹھا ولید خان اندر ہی اندر کتنا کھول رہا ہے۔ اسے بھری محفل میں لے پالک کا طمانچہ اور یہ تفریق کچھ برداشت نہیں ہوئی۔ تبھی باپ کے مرنے کے سال بھر بعد ہی اس نے عدالت میں کیس دائر کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ امیر جان کی باقی تمام جائداد کے ساتھ قلعوں کا مالک بھی وہی ہے اور چونکہ امیر جان نے ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوایا تھا اور کاغذات میں کہیں بھی ولید خان کے لے پالک ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا، تو عدالت کی طرف سے اس فیصلے کا ولید کے حق میں آنا کوئی مشکل کام نہ تھا، لیکن ولید خان کو پہلے ہی مرحلے میں کچھ مشکلات درپیش آگئیں اور وہ یوں کہ جس بھی وکیل کو اس نے اپنے کام کے لیے ہائر کیا، اسے علاقہ مکینوں کی طرف سے اصل حقیقت سے مطلع کر دیا گیا اور کم از کم تین وکیلوں کو وہ اسی چکر میں گنوا بیٹھا تھا۔ انہیں جب پتا چلا کہ وہ سردار امیر جان کا خون، اس کی حقیقی اولاد نہیں ہے اور یہ کہ جائداد کی تقسیم کا فیصلہ بھرے جرگے میں طے پایا ہے، تو وہ اس کا کیس لینے کو تیار ہی نہ ہوئے تھے لیکن پھر کسی نے وکیل جبار احمد کا بتایا۔ اس وکیل کے متعلق اسے بھرپور یقین دلایا گیا کہ وہ اس کا کیس لے لے گا۔ اور وہی ہوا۔

جبار احمد سے مل کر پہلی ملاقات میں ہی ولید خان کو سمجھ آگئی کہ اس کے لیے صرف پیسا اہم ہے۔ یہ وکیل وہ شخص تھا کہ ولید خان اگر امیر جان کا کوئی معمولی نوکر بھی ہوتا تو وہ اسے قلعے کا مالک بنا سکتا تھا، لے پالک ہونا تو پھر بڑے اعزاز کی بات تھی۔ ولید خان نے پہلی نشست میں ہی تمام معاملات ڈن کیے اور اب جبار احمد اس کا کیس لڑ رہا تھا۔

☆☆☆

"ویلکم مین!" سرفراز نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی خلیق مسکراہٹ سے امجد علی کو دیکھا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تھینک یو انکل!" امجد نے مؤدبانہ سر کو ہلکا سا خم کیا اور سرفراز کے بیٹھ جانے کے بعد خود بھی سامنے بیٹھ گیا۔

"سناؤ ینگ مین! کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"جی بس، ابھی کچھ ہفتوں سے گھر پر آرام۔" وہ

ہنس دیا۔
"ہاں، میری عابد سے بات ہوئی، وہ بھی یہی بتا رہا تھا کہ آج کل گھر پر ہے لیکن اسجد! تمہاری فیلڈ میں ایسا ہی ہے، اور اچھا بھی ہے، کام کے ساتھ آرام بھی ضروری ہے۔"
"جی سر! میری والدہ بھی اکیلی ہوتی ہیں، انہیں بھی وقت چاہیے ہوتا ہے۔ میں واقعی مطمئن ہوں۔"
"انسان مطمئن تب ہوتا ہے جب وہ اپنی من مرضی کا کام کر رہا ہو، اور مجھے معلوم ہے یہ کام تمہارا شوق ہے۔"
"جی انکل!" وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔ جانتا تھا عابد ماموں اور سر فرمان بہت گہرے دوست ہیں۔ یقیناً ماموں ہی ان سے ڈسکس کرتے تھے۔
"کبھی شہر سے باہر گئے ہو کام کے سلسلے میں؟" سر فرمان اصل مدعے کی طرف آئے۔
"آں...... جی انکل! دو سال سے یعنی جب سے باقاعدہ ڈگری لی ہے اور فیلڈ میں ہوں، دو بار شہر سے باہر گیا ہوں۔ ایک مشن پنجاب کا تھا اور ایک مرتبہ ژوب بھی جانا ہوا تھا۔ باقی زیادہ تر کام آس پاس کے مل جاتے ہیں تو آسانی رہتی ہے۔"
"کبھی ملک سے باہر بھی جانا ہوا؟"
"ایک کام مل رہا تھا کچھ سال بھر پہلے۔ کینیا جانا تھا، ایک بزنس مین کے ساتھ گھپلے کا معاملہ تھا لیکن مجھے معذرت کرنا پڑی کیونکہ آپ کو معلوم ہے امی اکیلی ہوتی ہیں۔"
"ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن آج اپنا سمجھ کر ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں اسجد کیونکہ تمہاری صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ تم ایک زیرک، معاملہ فہم اور سمجھ دار نوجوان ہو۔ آگے جانے کی، کسی مقام تک پہنچنے کی جو پوٹینشل تم میں دکھائی دیتی ہے، وہ قابل تعریف ہے لیکن اگر تم آپ ہی اپنی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بنو گے تو یہ تمہارے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہے۔ جو پیشہ تم نے اپنے لیے چنا ہے، اس کی یہ ضرورت ہے کہ تمہیں کبھی بھی، کہیں بھی سفر کے لیے نکلنا پڑ سکتا ہے۔ اپنی والدہ کی حفاظت کے لیے ایک بہتر بندوبست کر لینا وقت کی ضرورت ہے تاکہ تم کھل کر اپنے کام پہ فوکس کر سکو۔"
"جی سر! ٹھیک ہے۔ میں خود بھی اس سلسلے میں پریشان رہتا تھا لیکن آپ کی نصیحت کے بعد اس پہ کام کرنا اب میری پہلی ترجیح بن گیا ہے۔"
"گڈ...... اور اب ہم اس معاملے پہ بات کرتے ہیں جس کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"پشاور کے ایک انٹیلی جنس آفیسر ہیں، میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ انہیں ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی ضرورت ہے جو تجربے سے مزید ہو اور باقاعدہ تربیت یافتہ ہو۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بلاجھجک تمہارا نام دے دیا کیونکہ تمہارا ایک کلین ریکارڈ، تمہارا اب تک کا کام، تمہاری ڈگری اور ریپوٹیشن بھی بہت اچھی ہیں۔ وہاں کے ایک پرائیویٹ کالج کے پرنسپل ہیں جنہیں اپنے ادارے میں منشیات فروشی کے بڑھتے رجحان پر سخت تشویش ہے۔ انہوں نے بارہا معاملے کو پولیس میں دیا، پولیس نے اس سلسلے میں کام تو بہت کیا، بارہا طلبا گرفتار کیے گئے، کئی طرح افراد بھی ہاتھ لگے لیکن پرنسپل صاحب کا کہنا ہے کہ معاملے کا بار بار پولیس میں جانا ان کے ادارے کی ریپوٹیشن پر اثر انداز ہو رہا ہے، کیونکہ اس طرح تمہیں پتا ہے بات چھپی نہیں رہتی۔ لہٰذا اس بار وہ معاملے کو پوشیدہ رکھ کر حل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ایک ایسے ڈیٹیکٹو کی خدمات درکار ہیں جو اس ریکٹ کا پتا چلا لے جو اس پورے فساد کی جڑ ہے۔"
"ہوں...... میں سمجھ گیا ہوں سر!"
"تم اگر یہ کام لینے پر آمادہ ہو تو تمہیں پشاور جانا ہوگا۔ پرنسپل صاحب سے مل کر مکمل بریفنگ لینا ہوگی، پھر جس طرح مناسب سمجھو، اپنے کام کا آغاز کرو۔"
"جی سر! بہت شکریہ۔ میں اس سے ملتے جلتے ایک دو ٹاسک پہلے کر چکا ہوں۔ میں یہ کام لینے کے لیے تیار ہوں اور ان شاء اللہ اگلے دو دنوں میں ہی پشاور کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"
"ہوں، یہ وہاں کے پرنسپل کا کارڈ ہے۔ تم نکلنے سے پہلے مجھے بتا دینا، میں وہاں تمہاری آمد سے مطلع کر دوں گا۔" سر فرمان نے اس سے مصافحہ کیا اور اسجد سر جھکا کر اجازت لیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اپر دیر کے مضافات میں وہ پہاڑی کے پار کا گاؤں خوبصورتی اور سکون میں اپنی مثال آپ تھا۔ شمیر جان کا چترال جاتے ہوئے جب بھی یہاں سے گزر ہوتا، گزرے وقت کی یادیں ان کے پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتیں۔ یہ شہر اس کا ننھیال تھا۔ چترال اور اس کے مضافاتی گاؤں کی ایک دیہاتوں کے مالک جب گل آفریدی کی سسرال اپر دیر سے تھی، تبھی امیر جان اور شمیر جان کا بچپن چترال اور اپر دیر میں گزرا تھا۔ آنے والے وقتوں میں جائیداد کی تقسیم وغیرہ کے بعد شمیر جان اور امیر جان نے اپنے اپنے انداز میں

اپنے معاملات چلائے۔ اب ضمیر جان کی ایک حویلی چترال میں تھی اور ایک اپنے سسرالی شہر یعنی لوئر دیر میں تھی۔ باقی آبائی زمینیں، کچھ جنگلات اور چند ایک پرانے قلعے اب بھی چترال میں تھے۔ ضمیر جان کے دو بیٹے تھے، دونوں کی شادیاں چترال میں اپنے رشتے داروں میں ہوئی تھیں۔ وہ دونوں وہیں کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ ضمیر جان کا لوئر دیر سے چترال آنا جانا لگا ہی رہتا تھا لیکن اس مرتبہ وہ بطور خاص درمیان میں اپر دیر رکے تھے کیونکہ انہیں اپنے نام نہاد بھتیجے ولید خان سے ملنا تھا۔ وہ جو احسان فراموش، بے ضمیر اولاد نکلا تھا۔ کتنا کچھ باپ دے کر گیا۔ نعمت کا مفت ہاتھ آجانا بھی آزمائش سے کم تو نہیں ہوتا، لیکن ولید خان جیسے ناقدروں کو بھلا کیا احساس تھا۔

وہ ایک گہری سانس کھینچ کر اندر ڈیرے میں آئے۔ چند ایک مہمان موجود تھے۔ ضمیر جان مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ ولید کے ملازم بھاگ کر آئے۔ انہیں بڑی عزت سے سلام کیا اور ولید کو بلانے اندر کہیں بھاگ گئے۔ ولید کی آمد کچھ دس بارہ منٹ بعد ہی ہو گئی۔ مل تو ایسے رہا تھا جیسے جنموں کا بچھڑا ہوا ہو۔ ضمیر جان کئی بھاری گالیاں لبوں میں بھینچ کر رہ گئے۔ ضمیر جان نے مہمانوں کے جانے تک انتظار کیا اور جونہی دونوں اکیلے ہوئے، فوراً اور دو ٹوک انداز میں مدعے پر آئے۔ اتنا ان کے پاس بھی وقت نہیں تھا کہ ولید کی صحبت میں ضائع کرتے۔

”چچا جان! آپ بار بار عدالت کا حوالہ اس طرح دے رہے ہیں جیسے میں نے غنڈے ہائر کر لیے ہوں۔ ”عدالت“ تو ایک سیدھا لیگل راستہ ہے۔“

”اور جرگہ؟“ ضمیر جان نے ابرو اٹھا کر فوراً یاد دلایا۔ ”جب تمہارا مرحوم باپ بھرے جرگے میں اعلان کر چکا ہے تو ایسے میں تمہارا یہ عمل؟“

”میرے باپ نے مجھ سے مشورہ تک نہیں کیا تھا...... کیسے مان لوں ایسے فیصلے کو۔“ ولید کے اکھڑ رویے کی وجہ سے ضمیر جان اسے تاسف سے دیکھنے لگے۔

”بہت افسوس کا مقام ہے ولید! تم اس باپ کے متعلق یہ بات کہہ رہے ہو جس نے اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دیا۔ آج تم جو ہو، اسی کی وجہ سے ہو۔ یہ گھر، یہ ڈیرا، یہ ساری جائیداد۔ اور تم...... تم شکوہ کر رہے ہو کہ اس نے تم سے مشورہ طلب نہیں کیا تھا؟“

”مجھے مت بتائیں چچا جان کہ میں کیا تھا یا مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ ولید غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اور ہاں، جس وجہ سے آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے، کہہ تو میں بھی سکتا ہوں وہ قلعے بھی کون سا آپ کی ذاتی ملکیت ہیں۔ گلگت تک آپ کے قلعے پھیلے ہیں لیکن نظر تو آپ بھی ان دو پرانے بوسیدہ قلعوں پر رکھے ہوئے ہیں جو میرے باپ کے تصرف میں تھے۔“

”سوالوں کے جواب دینے تو بچے میں بھی نہیں آیا تھا۔“ ضمیر اٹھ کر کھڑے ہوئے تو چہرے پر اس سے بھی زیادہ غصہ اور جلال تھا۔ ”بتانے آیا تھا کہ جرگے کے فیصلوں کی عزت کرو، لیکن وہ کہتے ہیں نا...... شرافت اور نجابت خون میں ہوتی ہے۔ تمہیں سن کر یقین بھی آ گیا اور اچھا ہوا تمہیں سن لیا۔ میں بھی اگلے کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیتا کہ ”پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ امید ہے میری آمد کا مطلب تمہاری سمجھ میں بھی آ گیا ہو گا۔“ انہوں نے غصے کو ہلکی طنزیہ ہنسی میں تبدیل کیا اور شال جھٹک کر کندھے پر ڈالتے باہر نکل گئے۔ انہوں نے ملازم کی لائی چائے کی ٹرے کی طرف دیکھا تک نہیں۔

”ہونہہ۔“ ولید جان نے کھسیاہٹ چھپانے کے لیے ہنکارا بھرا۔ ”بتاؤں گا تو اب میں آپ کو...... چچا حضور!“ وہ چچا کے جانے کے بعد منہ میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

پشاور سے اسجد کو ایک گہرا دلی لگاؤ تھا۔ یوں تو وہ لوگ بنیادی طور پر کوہاٹ سے تھے۔ اس کے بابا نے وہاں اپنے باپ کا کپڑے کا کاروبار سنبھالا۔ شادی ہونے تک، اسجد کی پیدائش تک بھی وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسی کام سے منسلک رہے لیکن پھر کچھ ذاتی اختلافات نے کام الگ کرنے پر مجبور کیا تو دکان بڑے بھائی نے خود مکمل سنبھال لی اور اس کے والد بہرام احمد خان کے ہاتھ کچھ رقم ہی آئی۔ انہوں نے اپنی سمجھ اور کچھ دوستوں کے مشورے سے کوہاٹ چھوڑا اور فیملی کو لے کر پشاور آ گئے۔ اسجد تب چار سال کا تھا۔ یہاں آتے ہی اسے اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اس کا پہلا اسکول اور وہاں گزرے تین سال...... کیونکہ جب وہ ساتویں سال میں تھا تو اس کے بابا کا قتل ہو گیا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ کوہاٹ واپس گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور آج وہ کئی سالوں بعد ایک نسبتاً لمبے عرصے کے لیے پشاور آ رہا تھا۔

یہاں آ کر پہلا دن پرنسپل صاحب سے اپنے کام کے معاملات طے کرنے میں گزر گیا، جس کے آخر میں یہ طے پایا کہ کام کے مکمل ہونے تک اب ان دونوں کی اگلی ملاقات نہیں ہو گی۔ رہائش کے لیے پرنسپل صاحب نے ایک مکان بھی فائنل کیا ہوا تھا۔ اسجد ان کے ہاں سے اپنے

کام کی ایڈوانس رقم اور مکان کی چابی لے کر اسی وقت نکل کھڑا ہوا۔

پچھلے پہر جبکہ سورج مغرب کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا، وہ اپنے کرائے کے نئے مکان میں آیا۔ ایک بستر اور کچھ ضروری سامان پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے نہا کر کپڑے تبدیل کیے اور علاقے کو سمجھنے کے لیے اسی وقت باہر نکل آیا۔ اس کا مکان بوائز کالج کے ایریا میں ہی تھا۔ یہاں گلی اور اسکول، کالج اور ہاسٹل وغیرہ بھی تھے۔ وہ اس وقت بوائز کالج کی عمارت کا چاروں جانب سے جائزہ لیتے ہوئے اس کا نقشہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کالج کے دو بڑے گیٹ تھے، ایک تیسرا ایگزٹ ہاسٹل کی طرف سے تھا۔ کالج کے باقی دو گیٹ بند ملے اور اس جانب کوئی دکھائی بھی نہیں دیا تھا۔ ہاسٹل کی رونقیں البتہ پچھلے پہر بھی بحال تھیں کیونکہ یہاں لڑکوں کی رہائش تھی۔

بلڈنگ کو چہار جانب سے اس کا دیکھنے کا ڈھنگ بھی نہایت معمول کا تھا۔ کسی وقت وہ کسی ریڑھی پر رک کر کچھ خریدنے لگتا، کبھی چلتے چلتے بلاوجہ موبائل کان سے لگا کر لب ہلانے لگتا۔ کہیں سستا کر رک جاتا تو کہیں تیز واک شروع کر دیتا...... اور اب کالج کی عمارت کو تفصیل سے سمجھ لینے کے بعد وہ پیدل ہی قریبی بازار کی طرف نکل آیا۔ اسے شام کے لیے کوئی اچھا معیاری ریسٹورنٹ دیکھنا تھا جہاں کھانا کھانے آیا جا سکے۔

وہ اس تنگ بازار میں داخل ہوا تو رش کچھ معمول سے زیادہ ہی تھا۔ کہیں رکشے اور سائیکلیں پھنسی ہوئی تھیں تو کہیں پیدل چلنے والوں کا رش تھا۔ وہ نہایت کوفت بھرے انداز میں دکانوں کے بورڈز دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی خوشبوئیں بتاتی تھیں کہ علاقہ زیادہ تر ریسٹورنٹس پر ہی مشتمل ہے۔ نظر چونکہ اوپر تھی تو کوئی اچانک زور سے اس کے سینے سے آلگا۔

"اف" کی آواز نکالتے جہاں وہ دو قدم پیچھے ہوا، وہیں ایک کاسنی دوپٹے والی لڑکی اپنا سر سہلا رہی تھی۔ سر جھکانے سے اس کے بال چہرے پر آگرے تھے جس کی وجہ سے چہرہ دیکھنا مشکل تھا۔

"اوہ...... آئی ایم سوری!" وہ جو دھکا لگنے سے ایک دم اشتعال میں آیا تھا، مقابل ایک خاتون دیکھ کر غصے پر فی الفور قابو پا گیا۔

لڑکی نے پہلی بار سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں میں سخت ناگواری تھی۔ وہ ماتھا سہلاتے ہوئے اس کے بازو کی سائڈ سے جھانکنے لگی۔ اسجد نے نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا۔ نہ جانے وہ کیا دیکھ رہی تھی۔

"سنیں بھی...... !" لڑکی جتنا اس کی پشت پر کچھ دیکھنے کی مشتاق تھی، اسجد مزید آڑے آ گیا تھا۔ تبھی وہ اس کا بازو اپنے ہاتھ سے سائڈ پر کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھی۔ اسجد بازو کی اس جگہ کو حیرت آمیز خوشی سے چھوتے پھر اسے دیکھنے پر مجبور ہوا لیکن وہ چاروں جانب متلاشی نظروں سے کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اسجد نے پہلی بار غور کیا کہ وہ بری طرح حواس باختہ تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آس پاس سے لوگ گزر رہے تھے لیکن نہ صرف وہ لڑکی اپنی جگہ پر بھی چاروں طرف بے چینی سے کسی کو کھوج رہی تھی بلکہ اسجد کے لیے بھی آگے بڑھنا ممکن نہ رہا تھا۔

"ہم...... میری بچی گم ہو گئی ہے۔" وہ اس بار بڑے ہی بے ساختہ دوبارہ اس کے پاس آئی تھی کیونکہ قریب سے گزرتے ہجوم میں اس وقت وہی تھا جس کی صورت سے وہ آشنا ہو پائی تھی۔

"اوہ...... !" اسجد بھی قریب آیا۔ "پریشان نہ ہوں، وہ آپ کو ڈھونڈتی ہوئی یہیں آئے گی۔ آپ ادھر سائڈ پر رک جائیں۔" اس نے دائیں ہاتھ سے ایک بند دکان کے شٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اونچی جگہ ہے اور یہاں رش بھی نہیں ہے۔ یہ دو اسٹیپ چڑھ کر یہاں سے دیکھیں۔" اسجد نے اشارہ کیا تو وہ فوراً دکان کے اسٹیپس چڑھ گئی اور پلٹ کر دور دور تک دیکھنے لگی۔ اسجد تو اب جیسے کہیں جانا بھول ہی گیا تھا۔ بلاوجہ اس کا چہرہ تکتے ہوئے حیرت سے اس کی سرمئی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کا ایسا رنگ اس نے اتنے قریب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اور اک بھی کچھ ابھی ابھی اندر رچا گا اور......

"مل گئی میبو...... !" وہ ایک چیخ مار کر ہاتھ ہلاتے ہوئے دکان سے اتری اور بنا اس کی جانب توجہ کیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسجد نے جھینپ کر لب دانتوں میں دبائے اور سر کھجاتے ہوئے ایک جانب کو چل دیا۔ یہ احساس ابھی ابھی ہوا کہ کچھ دیر کے لیے وہ آس پاس کے ماحول کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ مزید آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

"کون ہے یہ جبار احمد؟" ضمیر جان ڈاڑھی کھجاتے ہوئے تعجب سے شیر دل کو دیکھ رہے تھے۔

"بدنام زمانہ وکیل ہے خان جی! اسونی رقمیں لیتا ہے۔ بہت شاطر آدمی ہے۔ جھوٹے کیس جتوانے کا ماہر۔"

"کہاں رہتا ہے؟ کچھ اتا پتا کرو، آج ہی۔" ضمیر

جان حقے کی نے کو مسلسل گڑگڑائے جا رہے تھے جو ان کی اندرونی بے چینی کی واضح غمازی کر رہی تھی۔

''نمبر، پتا سب نکال لایا ہوں خان جی!'' شیر دل نے سائڈ جیب سے اسی وقت ایک پرچی نکالی جس پر جبار احمد کا نمبر اور ایڈریس لکھا تھا۔

''کمال ہے۔ یہیں کا ہے۔ پہلے تو کبھی نام نہیں سنا۔'' وہ عینک لگا کر بغور اس کا ایڈریس پڑھ رہے تھے۔

''خان! پہلے کبھی عدالت کے کام ہی نہیں پڑے۔''

''اوئے مڑا! عدالت کا کام تو مجھے اب بھی نہیں پڑا لیکن وہ بدبخت ولید ہم کو گھسیٹ رہا ہے۔''

''خان! کس کی مجال ہے آپ کو گھسیٹے۔ آپ بھی اس کو سبق سکھا دو۔''

''ہم...... یہی سوچ رہا ہوں۔'' ضمیر جان کسی گہری سوچ میں تھے۔

''خان! یہ نمبر اور پتے کا کیا کرنا ہے؟'' شیر دل ضمیر کا باڈی گارڈ بھی تھا اور بہت پرانا بھروسے مند دست راست بھی۔ ضمیر جان ہمیشہ بلا تکلف ہر معاملہ اسی سے ڈسکس کیا کرتے تھے۔

''لاؤ، میرا موبائل پکڑاؤ ذرا، ابھی بتاتا ہوں۔'' ضمیر جان اچانک کسی نتیجے پر پہنچے پہلے مسکرائے پھر ہاتھ آگے بڑھایا تو شیر دل نے بھاگ کر میز پر رکھا موبائل خان جی کے ہاتھ پر رکھا اور ضمیر جان نے فوراً ہی چٹ پر لکھا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو......!'' ایک مردانہ آواز نے نہایت روکھے لہجے میں آغاز لیا۔

''جبار احمد...... وکیل؟'' ضمیر جان نے ڈائریکٹ ہی پوچھا۔

''جی، جی۔ جبار بات کر رہا ہوں۔''

''سر جی! ایک کیس لے رہے ہیں آپ...... اپر دیر کے ولید خان کا کیس ہے۔''

''آپ کون؟'' بڑے محتاط اور چونکنے انداز میں دریافت کیا گیا۔

''کچھ لینا دینا ہمارا ابھی باقی ہے، لیکن آپ نے کیس کو تسلی سے سمجھا بھی ہے؟''

''آپ ہیں کون؟ میں کسی انجان سے اپنے پیشے کی باتیں کیوں ڈسکس کروں؟'' جبار احمد کا لہجہ کچھ اور سرد اور روکھا ہوا، اور سرد لہجے تو ضمیر جان سے برداشت بھی کہاں ہوتے تھے۔

''چچا ہوں ولید خان کا...... اصولی طور پر اب وہ فورٹ میری ملکیت ہیں۔''

''اصولی کیسے...... جبکہ کوئی تحریری ثبوت کہیں ہے ہی نہیں۔ پھر خان جی! کیس تو بڑا ہی سیدھا سا ہے۔ ولید خان اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس سے پہلے وہ دو فورٹ امیر جان کی ملکیت تھے تو اس کے بعد قانوناً اس کے بیٹے کے ہو گئے۔''

''یہ قانون کسی اور کو سمجھانا وکیل!'' ضمیر جان ہنسا۔ ''لے پالک کو آباؤ اجداد کا ورثہ تھما رہے ہو۔ عدالتی باریکیوں سے تم کیس تو نکال لے جاؤ گے، اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''دھمکا رہے ہیں؟'' جبار احمد لہجے کی معنی خیزی کو بھانپ کر چلا اٹھا۔

''ہم سردار لوگ دھمکیوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اطلاع دینا میرا اصول ہے۔ میں نے اپنی نبھا دی، آگے جو تمہارا دل چاہے۔'' ضمیر جان نے اسے سننے کی زحمت بھی نہیں کی اور کال منقطع کر دی۔

''بوت صحیح کیا خان جی! بڑا اچھل رہا تھا ولید خان۔''

''دیکھتے ہیں اب یہ وکیل کیا کرتا ہے۔'' ضمیر جان پھر کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

''سیانا ہوگا تو ہاتھ کھینچ لے گا خان جی!'' شیر دل اب نیچے چوکی پر بیٹھا ضمیر جان کے گھٹنے دبا رہا تھا۔

''لیکن کب تک...... میرا مطلب ہے، ولید کے دماغ میں جو کیڑا گھسا ہے، اس کا کیا یہی حل ہے کہ ہم وکیلوں کو پیچھے ہٹاتے رہیں۔ وہ بے غیرت، بے حیا تو پھر بھی باز نہیں آئے گا نا۔''

''خان! آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہوگا۔ آپ کا حق آپ کے ہی پاس رہے گا۔ کوئی چھین نہیں سکتا۔ اللہ دیکھ رہا ہے نا۔'' شیر دل اپنے خان جی کے چہرے پر چھپی پریشانی دیکھ رہا تھا۔ خان جی کو منہ سے بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ان کا دل پڑھ سکتا تھا۔ خان جی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان سے سوا دکھی تھا۔

☆☆☆

سفید شلوار قمیص پر اس نے گہری گرے واسکٹ پہنی۔ موسم آج خوشگوار تھا، پچھلی شام آندھی اور اس کے پیچھے آنے والی بارش سے یہاں کا موسم واضح تبدیل ہوا تھا، ورنہ تو کچھ دنوں سے گرمی نے بے حال کر رکھا تھا۔ امجد نے ضروری سامان جیبوں میں ڈال کر چابی اٹھائی اور گھر سے نکل آیا۔ آج اس کا رخ قریبی پولیس اسٹیشن کی جانب تھا۔ پرنسپل سے ملنے والی فائل میں کچھ ایسی رپورٹس بھی منسلک

urdunovels.com

تھیں جو تھانے سے لی گئی تھیں۔ کالج کے چند فنیات فروشی کے معاملات باقاعدہ پولیس میں بھی گئے تھے۔ اسجد کو پہلے پہل وہیں سے اپنی تحقیقات کا آغاز کرنا تھا۔ ان پولیس افسران سے ملنا تھا جنہوں نے اس سے قبل معاملے کی تحقیقات کی تھیں۔ اس سے اسجد کو آگے بڑھنے میں خاصی مدد مل سکتی تھی۔

بڑی سڑک اس کے گھر سے نکلنے پر دو کشادہ گلیاں پار کرتے ہی آجاتی تھی۔ وہاں تک وہ چل کر آیا تو سڑک کے پار وہ لیڈیز ہاسٹل تھا جس کے پیچھے گرلز کالج اور ایک یونیورسٹی تھی۔ اس نے قریب آتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا لیکن اندر کوئی سواری تھی شاید۔ اسجد نے ہاتھ فوراً پیچھے کھینچا مگر ٹیکسی عین اس کے نزدیک رکی اور ایک لڑکی باہر نکلی۔ مطلب، سواری نے بھی وہیں اترنا تھا اور ٹیکسی اب اس کے لیے فارغ تھی۔

اسجد نے ایک سرسری نظر اس سفید چادر والی لڑکی پر ڈالی جس نے چہرے کو بلیک ماسک سے کور کر رکھا تھا۔ سلیقے سے اوڑھی چادر اور آدھے ڈھکے چہرے میں اگرچہ کسی کو پہچاننا آسان نہیں ہوتا جبکہ اس چہرے کو آپ نے اس سے قبل دیکھا بھی ایک ہی بار ہو۔ اسجد کا دل جگہ سے سرکا۔ وہ تو وہی تھی...... پر جب تک دل نے اسے پہچانا وہ بے پروا، بنا اردگرد نگاہ ڈالے رخ پھیر چکی تھی۔ اسجد غائب دماغی سے اندر بیٹھا، ٹیکسی ڈرائیور سے پولیس اسٹیشن کا کہہ کر نظریں پیچھے گھمائیں۔ ٹیکسی والے نے ٹیکسی آگے بڑھائی اور وہ بے چینی سے اسے دیکھ رہا تھا جو اب سڑک پار کر کے لیڈیز ہاسٹل کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ اسجد کا دل سکون کی ٹھنڈی جھیل میں تیرنے لگا۔ اتنے بڑے شہر میں وہ دشمنِ جاں اس کے کتنے قریب مقیم تھی۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر مسکراہٹ لبوں میں دباتے سیدھا ہو بیٹھا۔

اس ''اسپیشل کیس'' کو کسی فرصت کے وقت پر چھوڑتے ہوئے ابھی اسے موجودہ معاملے پر دھیان دینا تھا۔ پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہ تھا۔ اسجد نے راستے پر دھیان دیا اور دل میں سوچا، آئندہ یہاں آنے کے لیے بجائے ٹیکسی کے، واک کو ترجیح دی جا سکتی تھی۔

وہ اندر آیا تو سامنے اے ایس آئی خرم خان بیٹھا تھا۔ اسجد نے مصافحہ کر کے اپنا کارڈ دکھایا جس پر خرم نے ہلکا سا سر ہلا کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس وقت کسی آدمی سے بات چیت میں مصروف تھا۔ کچھ دیر دوسری کرسی پر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر شخص سے باتوں میں مصروف رہا۔ اسجد نے اس دوران آفس کا جائزہ لیا۔ پولیس اسٹیشن بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی ستائش کن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جی سر! کیسے آنا ہوا؟'' خرم کی آواز پر اسجد نے چونک کر دیکھا۔ دوسرا شخص اجازت طلب کر کے نکل رہا تھا۔

''ہوں۔'' اسجد نے گود میں رکھی فائل میں سے کچھ رپورٹس نکال کر خرم کے سامنے رکھیں۔ ''یہ کچھ رپورٹس فائل ہوئی تھیں یہاں، تقریباً تین ماہ پہلے۔ جاننا ہے کہ اس پر مزید بھی کچھ کام ہوا؟''

''دکھائیں۔'' خرم نے رپورٹس ہاتھ میں لے کر ان کو دھیان سے پڑھا۔ ''اوہ...... یہ کیس......؟'' اس نے لبوں کو سیٹی کے انداز میں سکوڑ کر اسجد کو دیکھا۔

''ایسے کیس کا ایک پرائیویٹ ڈیٹیکٹو کو جانا......؟''

اس کا انداز کچھ چونکا ہوا سا تھا۔ اسجد نے اس کی بدلتی کیفیت کو توجہ سے دیکھا لیکن کچھ بھی اخذ کرنا مشکل تھا۔ اس نے بس سر ہلا دیا۔

''تو آپ...... یہاں کیا جاننے آئے ہیں۔ آئی مین...... اب ہمارا اس سب سے کیا لینا...... آپ کیجیے اپنے انداز میں تفتیش۔''

''یہ میں ''اپنے انداز'' کی تحقیق ہی کر رہا ہوں۔'' اسجد کا لہجہ خرم کی بدتمیزی پر سخت ہوا اور اس نے چبا چبا کر جواب دیا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ بجائے اچھے طریقے سے تعاون کرنے کے، اسے ایسے رویے سے واسطہ پڑے گا۔ ایک سرکاری پوسٹ پر بیٹھے بظاہر ذمہ دار شخص کا ایسا غیر سودمندانہ رویہ۔ وہ بمشکل اپنی ناگواری کو ضبط کر رہا تھا۔

''سوری سر! آج تو آپ کی کسی متعلقہ بندے سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ایس پی صاحب نے ایک ہنگامی میٹنگ بلائی ہے۔ میں بھی بس سیٹ چھوڑنے والا تھا۔ آپ اگر کل...... بلکہ پرسوں آجائیں تو......!'' وہ کہتے ساتھ ہی اپنی سیٹ سے بھی اٹھ کھڑا ہوا تو اسجد کو مزید سبکی محسوس ہوئی۔ نہایت بے دلی سے مصافحہ کر کے وہ اس سے پہلے ہی پلٹ کر باہر نکل گیا۔

خرم نے ہنس کر اس کی پشت دیکھی اور گھڑی ڈھیلی کر کے سامنے رکھتے ہوئے خود بھی واپس بیٹھ گیا، کیونکہ اس نے تو کہیں جانا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

''اوئے کیوں پریشان ہوتے ہیں وکیل صاحب! میرا چچا بس بڑھکیں ہی مار سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس بھی آیا تھا۔''

urdunovels.com

"اچھا۔" جبار احمد چونکا۔ دونوں اس وقت جبار کے چیمبر میں بیٹھے تھے۔ ولید خان پچھلی شام ہی لوئر دیر آیا تھا۔ یہاں اس کے کئی یار دوستوں کے ڈیرے تھے۔ لوئر دیر آکر بھی نہ بھی وہ چچا کے ہاں ٹھہرا، نہ ملنے گیا۔ جبار نے بڑی پریشانی میں اسے کال کرکے بلایا تھا کہ اس کے چچا نے کال پر اسے دھمکیاں دی تھیں۔

"ہاں، مجھے بھی یہی سب کہنے آیا تھا کہ فورتھ پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ اب ذرا آپ ہی مجھے بتائیں جبار صاحب! جس باپ کی کوٹھیاں، جنگلات، زرعی زمینیں سب میری ہیں، اس کی کوئی ایک چیز ایسی کیوں ہے جو اس کے بعد میری نہیں ہے...... ہے نا؟"

"ہوں...... یہ تو ہے۔" جبار نے جواب تو دیا لیکن قدرے بے دلی سے، جس پر ولید خان نے سوچتی نگاہوں سے وکیل کو دیکھا۔ اس کی غائب دماغی اس کے ذہنی الجھاؤ کا پتا دے رہی تھی جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے چچا کی باتوں کے اثر میں تھا۔

"یہاں لوئر دیر میں میرے تین چار پلاٹس ہیں۔ مالاکنڈ روڈ پر دریا کے سامنے بڑی اچھی جگہ ہے۔ بالکل نئی رہائشی کالونی ہے۔ بڑا پروجیکٹ شروع ہوا ہے۔ اسکول، اسپتال، مال وغیرہ بھی بنائیں گے۔ پانچ چھ سالوں میں تو نقشہ ہی الگ ہوگا۔" ولید نے کہنا شروع کیا تو جبار پہلے پہل کچھ کھویا کھویا سا ہی تھا لیکن پھر جوں جوں سنتا گیا، اس کے کاروباری ذہن کی گرہیں بھی کھلنا شروع ہو گئیں۔

"اچھا...... چھا......!" وہ اب مکمل توجہ سے سن رہا تھا۔

"ایک کنال کا بڑا پلاٹ ہے۔ قیمت سن کر تو دنگ رہ جاؤ گے سر!" ولید خان نے ابرو اچکائی۔ "آپ بس میرا کیس جتوا دو۔ جہاں باقی اتنا کچھ مل رہا ہے، سمجھو یہ پلاٹ بھی آپ کا ہوا۔" وہ اس مرتبہ بات کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی دور سے یہاں تک چل کر آیا بھی تو اسی لیے تھا۔ بڑی مشکل سے ایک وکیل راضی ہوا تھا، اب وہ بھی جاتا دکھائی دے رہا تھا اور اپنا تو وہ ہونے نہیں دے سکتا تھا...... اور ہوا بھی نہیں کیونکہ وہ بھی جبار احمد تھا۔ ایک کنال کا پلاٹ بھی اپنے شہر میں، ایک اتنی اچھی رہائشی کالونی۔ انکار اور مزاحمت یاد بھی کیسے رہتی۔ فوراً بڑے ہی جذباتی انداز میں سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆☆☆

امجد اس وقت عصر کی نماز قریبی مسجد سے ادا کرکے گھر لوٹا تھا۔ آتے ہی ای سے کال پر بات کی۔ شام کو قریبی بازار سے کھانا پیک کروا کے لے آتا اور گھر میں سکون سے بیٹھ کر کھاتا۔ ہوٹلوں کے رش اور ہنگامے میں اسے کھانے کا مزہ بھی نہ آیا تھا۔ رات کو وقت گزاری کے لیے سوچا ایک سیکنڈ ہینڈ ٹی وی خرید لائے گا لیکن اگر سوہائل اٹھا لیتا یا کیس کی فائل کھول کر بیٹھ جاتا تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا اور مغرب کی اذان ہونے لگتی۔ اس وقت وہ عصر کی نماز ادا کرکے لوٹا تھا۔ اس نے نماز کی ٹوپی میز پر رکھی ہی تھی کہ ڈور بیل کی آواز پر چونکا۔

ابھی تو وہ گھر آیا تھا۔ معلوم نہیں پیچھے پیچھے کون آگیا۔ وہ تو علاقے اور آس پڑوس سے بھی واقف نہیں تھا۔ دل میں ہلکی سی حیرت لیے دروازے پر آیا اور کنڈی کھولی لیکن مقابل کو دیکھ کر ہلکی حیرت، گہرے تعجب میں تبدیل ہوئی۔

"آ...... آپ؟"

"ہائے سر!" اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا پھر اس کی پشت پر جھانکنے کی کوشش کی۔ "اکیلے رہتے ہو سر؟"

"آں...... ہاں۔" وہ چونکا پھر سائڈ پر ہوا اور وہ آنے والا تیزی سے اندر آگیا۔

"گھر تو اچھا مل گیا، چھوٹا سا بہت مناسب اور علاقہ بھی خوب ہے۔" وہ ہنس کر مڑا لیکن امجد کے انداز میں کوئی گرمجوشی، کوئی تپاک بالکل نہیں تھا۔ اس کے سرد سپاٹ چہرے پر صبح والی ناگواری کی چھاپ واضح تھی۔ خرم اکنور کرکے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کچن میں گھس گیا۔

"چائے تو ابھی نہیں پی ہوگی آپ نے؟" وہ ماربل کی سلیب پر رکھے اسٹوو کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی کھنگالتے ادھر ادھر کیتلی ڈھونڈی، دو کپ برابر کیے اور ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے دودھ کا پیک نکال کر تیز ہاتھوں سے سب کچھ کیتلی میں ڈال کر اسٹوو پر چڑھا دی۔ پلٹ کر مسکراتے ہوئے امجد کو دیکھا لیکن وہ غصہ ضبط کیے اس کی یہ بیکار کی بے تکلفی دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس غرض سے یہ سب کچھ کر رہا تھا اور یہاں تک آنے کے پیچھے اس کے مقاصد کیا تھے، لیکن جو بھی تھے، امجد کا بلڈ پریشر بڑھا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر اتنا کھول رہا تھا کہ سوال پوچھنے کو اس کا جی نہیں چاہا۔

خرم بنا اس کے رویے کی پروا کیے، کچھ ہی دیر میں دو کپ چائے اور شاپر میں سے بیکری کی بنی تازہ کوکیز اور پانچ چھ سموسے، چٹنی وغیرہ نکال کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ لیجیے جناب! گرما گرم چائے۔" اس نے بھاپ اڑاتا کپ امجد کے سامنے رکھا اور اپنا کپ اور سموسہ اٹھا کر بے تکلفی سے یوں کھانے بیٹھ گیا گویا یہ سارا اہتمام اسی بھوک کو مٹانے کے لیے ہی کیا تھا۔ امجد نے کچھ دیر تک تو

اسے گھورتی نظروں سے دیکھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا کپ ہاتھ میں لے لیا۔

”یہاں کا پتا کیسے ملا؟“

”دیکھیں سراسراغ رساں آپ ہیں اور اسے بچے ہمارے پاس ہوتے ہیں۔“ اس نے قہقہہ لگایا جس پر امجد نے آنکھیں چھوٹی کر کے سخت بیزاری سے اسے دیکھا۔

”اصل میں اسی وقت میں نے اپنے ایک بھروسے کے حوالدار کو پیچھے لگایا تھا۔ سوری!“ وہ ہنستے ہوئے معذرت کر رہا تھا جس پر امجد کو مزید بیکی محسوس ہوئی۔ صبح اس کا پیچھا کیا جا رہا تھا اور اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔

”اس سب زحمت کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ اس نے بڑے چائے، سموسوں اور بسکٹس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ چائے......!“ وہ کچھ سوچ کر ہنسا۔ ”یہ تو ایک معذرت ہے۔ آپ جیسے ذمے دار شہری کے ساتھ اپنے نامناسب رویے کا چھوٹا سا ازالہ۔“

”تو کیا ضرورت ہوتی ہے ایسا رویہ اپنانے کی جس کے بعد معذرت کی نوبت آئے؟“ وہ اب چائے کے ہلکے ہلکے سپ لے رہا تھا۔

”جی بس کچھ اسی لیے تو حاضر ہوا تھا۔“ خرم بھی سنجیدہ ہوا۔ ”صبح میں واقعی یہی چاہتا تھا کہ آپ وہاں کسی سے نہ ملیں اور آپ کی پہلی ملاقات مجھ سے ہوتی، اس پر بھی اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا۔ آپ نے اپنا کارڈ بھی شاید میرے علاوہ تو کسی کو نہیں دکھایا...... ہے نا؟“ وہ اب گہری سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ امجد بھی اسے دھیان سے سننے لگا۔ اس نے نفی میں ہلایا کیونکہ کارڈ اس نے صرف خرم کو ہی دکھایا تھا۔

”اپنی یہاں آمد اور اس کیس کی تحقیقات کی بات یہاں کسی کو معلوم نہ ہونے دیں۔“ خرم کا لہجہ سرگوشیانہ سا ہو گیا تو امجد چونکا۔

”یعنی......؟“

”صبح میرے لیے تھانے میں تفصیل بتانا ممکن نہیں تھا، اس لیے مجبوراً تانے والا رویہ اپنایا تاکہ آپ ہنا کسی اور سے ملے جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں۔ آج صبح کہیں کوئی ایس پی کی میٹنگ نہیں تھی، جس کی سربراہی کرنے کے لیے ایس آئی جہانگیر سلیم بھی موجود تھے لیکن یہ اللہ کا کرم ہوا کہ میری کم ٹائم کی پلاننگ بھی کامیاب رہی اور آپ آف سوالات کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے۔“

”یہی وجہ تو بتاؤ؟“ امجد اب جھنجلا اٹھا تھا۔

”آپ جس کیس کی انویسٹی گیشن کر رہے ہیں، وہ قریب ایک سال پہلے ہمارے پاس آیا تھا۔ میں اس وقت بالکل نیا آیا تھا۔ میری یہ پہلی اپائنٹمنٹ ہے اور مجھے ابھی ڈیڑھ سال ہی ہوا ہے۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت مجھے فائل چھڑی سی پتے ہوئے تھے۔ مجھ سے اگرچہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن شکایت چونکہ اسی تھانے میں درج ہوئی تھی تو بہت سے معاملات مجھ سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔ میں بہت ایکسائٹڈ تھا کہ جلد ہی ہم اس ریکٹ کو دھرلیں گے جو کالج کے معصوم بچوں میں یہ زہر بے دھڑک بانٹ رہے ہیں۔ کالج کے یہ سب بچے بچیاں جنہیں کراتے ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں تو سوچتا ہوں اس انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے کہ ہمارا مستقبل کس تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے کچھ جذباتی سا ہو گیا لیکن اب اس کی کی باتیں امجد کو ناگوار نہیں لگ رہی تھیں، وہ اسے بہت توجہ اور انہماک سے سن رہا تھا۔

”لیکن ایسا ہو نہیں پایا سر...... کیونکہ ہمارے ہی محکمے کے کچھ افسران نہ صرف اس خفیہ ریکٹ سے واقف ہیں بلکہ اس کی پردہ پوشی بھی کر رہے ہیں۔“

”اوہ...... لیکن......!“

”میں نے جب آپ کو سنا اور یہ فائل دیکھی تو جہاں ایک سکون، ایک خوشی سی محسوس کی کہ ایک پرائیویٹ ایجنسی اس پر کام کر رہا ہے۔ وہیں اس بات سے بے حد بے سکونی ہوئی کہ اگر یہاں اس بات کا پتا چل گیا تو فوراً عملہ اس ریکٹ کو ہوشیار کر دے گا۔ پتا ہے پھر کیا ہوتا ہے؟“ اس نے گلا کھنکھارا۔

”جب تک آپ یہاں انویسٹی گیشن کر رہے ہیں، ہر نشان، ہر مشکوک چیز یہاں پیچھے ہٹا دی جائے گی جیسے خون کے ثبوت مٹانے کے لیے کوئی اس جگہ کو پانی سے دھو ڈالے۔ یہ لوگ خود ہی مجرموں کو اندر کروا کے بھیج کر آپ کے ساتھ بھرپور تعاون شروع کر دیں گے اور کچھ ماہ کی لاحاصل بھاگ دوڑ کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، سوائے وقت کے زیاں کے۔“

”اوہ......!“ امجد کے ہونٹ گولائی میں سکڑے اور چہرہ تشویش سے پُر تھا۔ اس پہلو پر تو اب سے پہلے اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ پولیس ایک ذمے دار محکمہ تھا اور محکمے تو محترم ہی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے انسان اپنے عمل سے اس کی ساکھ پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ سامنے بیٹھا خرم خان بھی تو اسی محکمے کا ایک کارکن تھا اور اسے سن کر دل کو ایک تقویت، ایک حوصلہ سا ملا تھا۔ جب تک دنیا میں اچھے انسان باقی ہیں، برائی کے

ہونے والی بھابی کو۔ بس پھر جب میاں بیوی ایک ہو جائیں گے، کوئی ضرورت نہیں ایسے سسر کو خاطر میں لانے کی۔"

"یہ آسان ہے کیا؟" خرم جیسے سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ تو تم نے دیکھنا ہے۔"

"چھوڑیں، سوچتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "فی الحال میرا خیال ہے پچھلے معاملے پر آتے ہیں۔"

"ہوں۔ یہ ضروری ہے۔" اسجد برتن اٹھاتے ہوئے کچن میں آ گیا۔ باقی سامان خرم سمیت لایا تھا۔ اسجد نے قہوے کی تیاری شروع کی۔

"کیا لگتا ہے، اب کہاں سے کام شروع کریں گے؟" خرم کی پرسوچ نظریں اسجد پر جمی تھیں۔ وہ سیمنٹ کی سلیب سے ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے وہیں کھڑا ہو گیا۔

"میں نے فائل کو پچھلی رات پھر بار بار دیکھا ہے۔ جن والدین نے شکایت درج کی تھی، اگر ان سے رابطہ کیا جائے!؟"

"ہاں بالکل۔" خرم نے فوراً تائید کی۔ "پیرنٹس کی شکایات تو اب تک آ رہی ہیں بلکہ یہ سلسلہ کچھ تیز ہوا ہے۔"

"ہوں۔ یہی بات ہے لیکن ہمیں تازہ شکایات کے بجائے کچھ پرانی شکایات پر توجہ دینا ہو گی۔"

"ایسا کیوں...... جبکہ تازہ ترین شکایات تو ابھی حال کی ہیں اور جس کا مطلب کہ مجرم بھی کہیں آس پاس......"

"تازہ شکایات کو دیکھنے کے لیے مجھے کالج جانا پڑے گا اور پرنسپل صاحب کا تو مقصد ہی اس سارے معاملے کو خفیہ طریقے سے حل کرنے کا ہے۔"

"تو تمہیں لگتا ہے، اساتذہ بھی انوالو ہو سکتے ہیں؟" خرم حیران تھا۔

"خارج از امکان تو اس پہلو کو بھی نہیں کر سکتے۔ ویسے اساتذہ کی جھنجلاہٹ کی زیادہ وجہ ادارے کی ریپوٹیشن پر سوالات وغیرہ ہوتے ہیں۔ تعاون نہ کرنے کی وجہ ضروری نہیں کہ مشکوک ہی ہو۔"

"آپ کا کام ویسے ہے کافی مشکل۔" وہ پھر ہنسا جس پر اسجد نے ابرو اٹھائے۔

"ہاں۔ آپ کی طرح نہیں کہ لٹھ اٹھایا اور دھوبی گھاٹ سمجھ کر مجرم کو کپڑے کی طرح دھنا شروع کر دیا۔"

"کیا کریں، ہماری بھی مجبوری ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"کیا لگتا ہے خرم! محکمے میں کتنے لوگ ملوث ہو سکتے ہیں؟ میں صرف اس منشیات والے معاملے کی بات کر رہا ہوں، باقی معاملات کی نہیں۔"

"ہاں۔ اگر ایک سال پیچھے جاؤں تو ایس پی تحریر کو بہت مستعد اور فعال دیکھا تھا۔ وہ بھرپور جذبے سے کام کرنا چاہتے تھے لیکن یہ جہانگیر سلیم...... بالکل بھروسے لائق نہیں ہیں اور بھی کئی معاملات میں اپنی ٹانگ اس انداز میں اڑا چکے ہیں جس سے ان کی کارکردگی پر سوال اٹھتے ہیں، لیکن آپ کو پتا ہے عہدہ بڑا ہو تو ہاتھ بھی کم لمبے نہیں ہوتے۔"

"اسی لیے سوچ رہا ہوں۔ بچ بچا کر ہی چلنا ہے تو ان تک پہنچیں جو شکار ہوئے اور جن سے کچھ معلوم بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ وہ تم کہہ رہے تھے کہ پرانے اسٹوڈنٹس؟"

"دو تین طلبہ ایسے ہیں جو اب کالج سے جا چکے ہوں گے۔ مجھے انہی سے ملنا ہے۔"

"اوہ۔" خرم نے بات سمجھ آنے پر سر ہلایا۔ "یہ ویسے بالکل ٹھیک ہے۔ تو کل......؟"

"ہاں، ان شاء اللہ۔"

"میری کسی بھی قسم کی ہیلپ چاہیے ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"شیور۔ ویسے بھی اجنبی شہر میں تو ایک مورل سپورٹ کا میسر آنا بھی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ باقی آئی نو، مجھے کہیں بھی ضرورت پڑی، میں نے تمہیں ہی آواز دینا ہے۔"

دونوں چلتے ہوئے دروازے کے باہر تک آ گئے۔ خرم پیدل یہاں تک آیا تھا۔ کوئی سواری اسے مین روڈ سے ہی ملنا تھی۔ اسجد بھی اس کے ساتھ سڑک تک آ گیا۔

"سنو، یہ سامنے ہاسٹل ہے کیا؟" اسجد نے سرمئی آنکھوں والی کی رہائش گاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاسٹل ہی سمجھ لیں۔ ویسے ایک پرائیویٹ بلڈنگ ہے۔ کام کرنے والی خواتین رہتی ہیں زیادہ تر۔ اسٹوڈنٹس بھی ہیں کچھ۔ کیوں...... خیریت؟"

"نہیں۔ ویسے ہی معلومات کے لیے۔ اتا پتا رکھنا چاہیے نا۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کا تو بنتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے دور ہوتا گیا اور اسجد ایک نظر سامنے والی بلڈنگ پر ڈالتے ہوئے واپسی کے لیے پلٹ آیا۔

☆☆☆

شمشیر اعظم انجینئرنگ کے دوسرے سمسٹر میں تھا۔ قریب ڈیڑھ سال پہلے جبکہ وہ بارہویں جماعت کا طالب علم تھا، نشے کی لت نے اس کی زندگی تقریباً تباہی کے دہانے پر لاکھڑی کی تھی۔ اعظم وزیر ایجوکیشن آفس میں ہیڈ کلرک تھے۔ بیوی نے ہی اس جانب توجہ دلائی کہ بیٹے کی عادات، اس کی صحت معمول سے بالکل ہٹ کر تھی۔ نشے کی علامات

urdunovels.com

بھی جلد ظاہر ہونے لگیں، جس بنا پر اس کا علاج اور پھر پولیس میں شکایت درج کروائی گئی۔ چند ایک یار دوستوں نے تسلیم کیا کہ کالج کے کچھ لڑکوں کی وجہ سے نشہ آور سگریٹس کالج کے اندر آتے ہیں۔ امجد نے شمشیر کے متعلق پتا کروایا۔ وہ بھی پشاور میں ہی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ شکایت میں اس کے والد کا نمبر اور ایڈریس موجود تھا۔ ایک دوسرے لڑکے ثاقب کا ایڈریس بھی موجود تھا لیکن اس نے شمشیر سے کام کا آغاز کیا۔

امجد شام کے وقت جب ان کے دروازے پر پہنچا تو شمشیر کے چھوٹے بھائی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ والد صاحب کی ٹرانسفر صوابی ہو چکی ہے، وہ یہاں نہیں ہیں۔ شمشیر البتہ اندر موجود تھا اور اب وہ شمشیر کے سامنے بیٹھا تھا۔

"شمشیر! میں آپ کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں لیکن پہلی نظر آپ پر ڈالتے ہی ایک اطمینان سا محسوس ہوا۔ ایک بچہ جسے قریب ڈیڑھ سال پہلے نشے کی لت نے بیمار کر دیا تھا۔ اگر خدانا خواستہ ارد گرد والے بھی کوتاہی برتتے تو شاید آج میری ملاقات بستر پر پڑے شمشیر سے ہو رہی ہوتی، لیکن آپ کی قابلِ رشک صحت میرے لیے بہت حوصلہ افزا ہے۔ آپ کو دیکھ کر ہی میں اپنے مقصد اور مشن کی کامیابی کے لیے بڑی ہمت محسوس کر رہا ہوں، لیکن شمشیر! مجھے آپ کا تھوڑا سا تعاون چاہیے۔"

"مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔ تعاون کے لیے بھی حاضر ہوں اور دل سے دعا گو ہوں کہ نہ صرف اداروں بلکہ پورے ملک سے یہ لعنت کسی طرح ختم ہو جائے۔" امجد نے چونکہ اپنا کارڈ دکھا کر تھوڑا سا اپنی آمد کا مقصد واضح کر دیا تھا اس لیے شمشیر پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔

"کچھ بھی پوچھنے سے پہلے آپ کو یقین دہانی کراتا ہوں کہ آپ کا نہ تو نام کہیں استعمال ہوگا، نہ ہی آپ کو کسی قسم کے بیان کے لیے کہیں طلب کیا جائے گا۔ آپ کی ہماری بات چیت آج ہی شروع ہو کر آج ختم ہو جائے گی۔ بشرطیکہ آپ خود کہیں اس کا ذکر نہ کر دیں۔"

"جی، جی۔ میں سمجھ رہا ہوں۔"

"تو شمشیر......! چند لفظوں میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں اور امید ہے انہی چند لفظوں سے ہی آپ کو میری بات پوری سمجھ میں آجائے گی اور وہ یہ کہ ہمارا مقصد نشہ پھیلانے والے نا سمجھ نادان لڑکوں کی گردن پکڑنا نہیں ہے۔ مجھے اس ریکٹ تک پہنچنا ہے جس کی بیخ میری آپ کی سوچ سے کہیں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے آپ اگر ڈیڑھ دو سال پیچھے جائیں تو بہت سوچ کر جتنا کچھ یاد آ سکے، سب مجھ سے شیئر کریں۔"

"جی، میں سمجھ گیا۔" شمشیر نے سر ہلاتے ہوئے گلا کھنکھارا اور بس چند منٹ کے لیے پیچھے موجودہ ماحول سے نکل کر کہیں پیچھے کا سفر کیا۔

"ہمارے کلاس فیلوز تھے جنید اور برہان...... جیسے ہوتے ہیں نا، بلاوجہ ہر شرارت کا موجب، ہر گنتر و دری میں پیش پیش۔ بلا لحاظ کلاس میں بڑھ بڑھ کر جملے پھینکنے والے، اساتذہ تک کو زچ کرنے والا ٹولا۔ تو وہ دو اس ٹولے کے بھی سرغنہ تھے۔ میرا ان کے ساتھ دوستی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ مجھے شریف بچہ سمجھ کر تنگ کھینچنے والا رویّہ اپناتے تھے۔ ایسے رویّے سے بندہ اپنا اعتماد مزید کھونے لگتا ہے۔ تو بس کچھ اسی اعتماد کو بحال کرنے کے لیے اور خود کو ہوشیار ظاہر کرنے کے چکر میں انہی کے کہنے پر سگریٹ نوشی شروع کی تھی۔ اڑتی اڑتی سنتے تھے کہ سگریٹ عام نہیں ہے لیکن جب تک سمجھ آتی، عادت بگڑ چکی تھی بلکہ لت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ تو میرے پیرنٹس کی توجہ کا اثر ہے کہ میں اس عذاب سے نکل آیا تھا، لیکن جس بات کی جانب آپ نے اشارہ کیا ہے، میں اب اس پر آتا ہوں۔ کیونکہ جنید اور برہان بھی محض آلۂ کار تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، جب میں باقاعدہ اس غلط صحبت کا حصہ بن گیا تھا۔ میں نے کالج سے باہر جنید اور برہان کو جن لوگوں سے ملتے دیکھا، ان میں سے ایک کا نام اور حلیہ بھی آپ کو بتا سکتا ہوں اور ایک درمیان کی کڑی کالج کی کینٹین والے انکل سراج ہیں۔ سراج انکل کو میں نے باقاعدہ رقم لے کر نہ صرف سگریٹ بلکہ کچھ مشکوک پیکٹس بھی پہنچاتے دیکھا ہے۔"

"ہوں...... گڈ!" امجد ساتھ ساتھ ایک پیپر پر نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ "اور وہ باہر کا آدمی؟"

"جی سر! اس کا نام رئیس خٹک ہے لیکن سب اس کو رومی کہتے ہیں۔ اونچا لمبا، سفید ڈاڑھی والا آدمی ہے۔ اس کی آنکھیں سبز ہیں، سر آگے سے گنجا ہے۔ اس کی پہچان بہت آسان ہے۔"

"کچھ یاد ہے، کہاں اٹھتا بیٹھتا تھا؟ کوئی ایریا...... کوئی جگہ؟"

"بہت آسان ہے...... وہ آج بھی کالج کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ میں آج بھی اسے دیکھوں تو راستہ بدل جاتا ہوں۔ بابا کی طرف سے سخت پابندی ہے۔"

urdunovels.com

''ہوں......گڈ......اور کچھ شمشیر؟''

''سر! مجھے چونکہ ایک ہی برس ہوا ہے کالج سے نکلے، تو بہت سے جاننے والے اب بھی ہیں۔ کچھ جونیئر کلاس کے دوست بھی ہیں۔ ان سے پتا چلتا رہتا ہے کہ یہ کام تو نہ صرف اب بھی جاری ہے وہاں بلکہ زیادہ پھیل رہا ہے۔ یہ تو بہت خطرناک ہے۔''

''بالکل صحیح سنا شمشیر......! اور خطرناک بھی یقیناً ہے۔ ہمارا مستقبل ایسے ہاتھوں میں قطعی نہیں جانا چاہیے۔ باقی پُرامید رہو، میری یہاں آمد تمہارے خدشات کو مٹانے کی کوشش ہے۔''

''سر! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی...... اور میں پرامید ہی نہیں، پریقین بھی ہوں۔''

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ امجد اس سے مل کر باہر نکل آیا۔ شمشیر سے ملاقات بہت سودمند رہی تھی۔ ایک ہفتے کے دوران پہلی بار ایسے لگا کہ آگے بڑھنے کے لیے کوئی سرا میسر آیا ہے۔ اس روز وہ بہت کچھ پلان کرتا ہوا گھر تک آیا تھا۔ حتیٰ کہ سوتے وقت بھی ذہن ایک ساتھ کئی تانوں بانوں میں الجھا تھا۔

☆☆☆

عدالت میں پیشیاں لگنی شروع ہو گئی تھیں۔ ضمیر جان کو بھی حاضر ہونے کا نوٹس موصول ہوا اور حالانکہ پہلے پہل ان کا خیال تھا کہ وہ ہرگز عدالت نہیں جائیں گے لیکن ولید پر اپنا غصہ نکالنے کی یہ تدبیر کچھ خاص کارگر نہ تھی۔ ان کے خیرخواہوں کا ماننا تھا کہ نہ صرف جانا چاہیے بلکہ ایک وکیل مقرر کر کے اپنا موقف بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ چپ بیٹھے رہنے سے تو یکطرفہ جیت کا ماحول خود اپنے ہاتھوں فراہم کرنے کے مترادف تھا۔ تبھی ضمیر جان نے بھی ایک وکیل ہائر کر لیا تھا۔ دو مرتبہ ولید سے عدالت میں بھی آمنا سامنا ہوا۔ ضمیر جان اب اس سے بات تک کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ قانونی کارروائی طویل اور سست تھی۔ ضمیر جان جتنا جھنجلائے ہوئے تھے، ولید اتنا زیادہ پرسکون اور مطمئن دکھائی دیتا اور اس کا یہ اطمینان ضمیر جان کا سارا چین سکون چھینے ہوئے تھا۔ جبار احمد ایک نہایت شاطر وکیل ثابت ہو رہا تھا۔ ہر پیشی پر ضمیر جان کی امیدیں کمزور سے کمزور تر ہو رہی تھیں۔

''اگلی پیشی پر فیصلہ سنایا جائے گا۔'' شیر دل نے ہلکی سی سرگوشی میں بتایا۔

''اتنی جلدی......؟'' ابھی ابھی تو وہ عدالتوں کی سُستی اور طوالت پر جھنجلا رہے تھے اور اب نہ جانے ایک گھبراہٹ سی کیوں محسوس کی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور چپ چاپ باہر کی راہ لی۔ شیر دل بھی بھاگ کر پیچھے ہو لیا۔ معلوم نہیں خان جی اچانک افسردہ کیوں ہو گئے تھے۔

☆☆☆

''یہ...... تاتی کی کال آ رہی ہے۔'' گل افشاں دور مخمل پر لگا اس کا موبائل اٹھائے نزدیک آئی تو وہ ایک دم بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ اردگرد دیکھا پھر آنکھ کے اشارے سے گل افشاں کو اپنے مزید قریب بلایا۔

''میرا باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم بھی احتیاط کرو اور......!'' اس نے جلدی سے دراز کھول کر اپنے تکیے سے کچھ رقم نکالی۔

''ماریہ سے کہو، میم عشرت کو بتا کر سامنے اسٹور سے دودھ اور انڈے لیتی آئے۔ میں تاتی کو کال کر کے کہتی ہوں کہ پیکٹ ماریہ کو دے دے۔''

''تو...... ماریہ......؟'' گل افشاں کو بات اب بھی پوری سمجھ نہیں آئی تھی۔

''اسے کہو، کچھ کاسمیٹکس منگوائی تھیں۔ میرا کہنا کہ اس کا سامان ہے۔ وہ خود تو سردرد میں پڑی ہے۔ یہ سامان بھی لے آؤ اور پارسل بھی۔'' سرگوشی میں پوری بات سمجھاتے ہوئے اس نے گل افشاں کو باہر دھکا دیا اور فوراً ہی کال ملا کر تاتی کو ماریہ کے بارے میں بتایا۔ گل افشاں بھی تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گئی۔

''عشرت باجی کو شک ہے ہم پر؟'' گل افشاں کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

''ہم پر تو نہیں لیکن دلیر خان بتا رہا تھا تاتی کو اس علاقے میں مزید بھیجنا خطرے سے خالی نہیں۔ کہہ رہا تھا آئندہ کاشف نام کا نیا بندہ آیا کرے گا۔ وہ تو بلکہ آج بھی کاشف کو ہی بھیجنے والے تھے لیکن وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے شہر سے باہر چلا گیا۔ پرسوں کچھ اور سامان بھی آنا ہے۔ کاشف ہوا تو میں خود ہی جاؤں گی۔'' وہ اب بال سمیٹتے پلنگ سے اتر آئی تھی۔

ماریہ کی واپسی بیس منٹ تک ہو گئی۔ گل افشاں نے بند پارسل جلدی سے اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا۔

''کیا ہے یہ؟'' ماریہ خود بھی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''میری بہن اپنا بیوٹی پارلر کھول رہی ہے نا، تو میک اپ کا کچھ سامان ہے۔ یہاں تو تمہیں پتا ہے ہر رینج کی چیز مل جاتی ہے۔ یہ میرے بہنوئی کا دوست تھا۔ اکثر سامان وغیرہ دے جاتا ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرا کر وضاحت دیتی

UrduNovels.com

"آپی نے سختی سے منع کیا تھا گھومنے سے۔ کبھی ان تم چیزوں سے چھیڑ چھاڑ کروگی۔" وہ ہنس کر صفائی دیتے ہوئے پیچھے بیٹھ گئی اور ماریہ کے سامنے ہی بند پارسل بیگ میں رکھ دیا۔ وہ بھی بے پروائی سے اپنے کسی کام میں لگ گئی۔ گل افشاں اور اس نے ایک دوسرے کو معنی خیزی سے دیکھ کر طمانیت کا سانس بھرا۔ ایسے پارسل : پہ بھی موصول ہوتے، دونوں کو بڑی احتیاط سے پیش آنا پڑتا۔

☆☆☆

رئیس تک تو بڑی ہی آسانی سے دستیاب ہو گیا۔ امجد کو دوسرے دن کی لمبی واک کے دوران ہی وہ ایک چائے کے ہوٹل میں بیٹھا نظر آ گیا۔ یہ خیال بھی امجد کو پچھلے دنوں آیا کہ شام کی واک کے لیے کسی ویران لمبی سڑک کے بجائے اسے بازار اور رونق والے علاقوں کا انتخاب کرنا چاہیے، اس سے ماحول اور اردگرد کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع مل سکتا تھا۔ آج وہ واک کرتا ہوا اس چائے کے ہوٹل کے سامنے والے ڈھابے میں جا بیٹھا۔ نزدیک کا چشمہ لگا کر سامنے میگزین کھول کر خود کو اپنا کا فارغ بھی ظاہر کیا۔ بھائی شوکت سے اس نے شروع کے دو دنوں میں ہی سلام دعا بڑھا لی تھی۔ بلاوجہ سستا سگریٹ خرید کر خود کو ایک لوئر مڈل کلاس شہری ثابت کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ رئیس عرف رودی سامنے کے ڈھابے پہ موجود تھا اور امجد کو آج اس کا پیچھا کرنا تھا۔ اس نے چائے ختم کر کے بل کی رقم بھی مٹھی میں پکڑی تھی تاکہ بنا وقت ضائع کیے فوراً پیچھا کیا جا سکے۔ رودی وہاں سے کوئی پندرہ منٹ بعد اٹھا۔ امجد نے جلدی سے ادائی کر کے ہوٹل چھوڑا اور بازار کے رش میں محتاط انداز میں اس کا پیچھا کرنے لگا۔ بازار ختم ہونے پر بھی وہ پیدل سڑک کنارے چلنے لگا۔ امجد نے بھی اپنا حلیہ آج کل خرم جیسا بنا لیا تھا۔ سر پہ چھجے والی ٹوپی اور چہرے پہ ماسک لگا کر پہچان میں آنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ رئیس نے چلتے چلتے دو تین مرتبہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔ امجد ایسے لوگوں کی طبیعت کو اچھی طرح سمجھتا تھا، اس لیے پہلے ہی چوکنا تھا۔ مشکوک کاروائیوں میں ملوث افراد اسی طرح آس پاس پہ نظر رکھتے ہیں۔ لیکن امجد کی خوش قسمتی نے دونوں مرتبہ اسے بچا لیا۔ پہلے جب رئیس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اس وقت سڑک کنارے مکئی اور جوس والوں کے ٹھیلوں کے پاس سے گزر رہا تھا اس لیے رئیس کو وہ بھیڑ کا حصہ ہی لگا۔ دوسری مرتبہ جب رئیس پلٹا تو امجد کے قریب ایک رکشا رکا ہوا تھا اور اس میں سے دو مردانہ سواریاں نکلی تھیں۔ اس وقت بھی ایسا لگا جیسے ابھی ابھی وہ سب رکشے سے اترے ہیں۔

تیسری مرتبہ جب رئیس نے پیچھے دیکھا تو امجد خود ہی مڑ کے سے بہت پیچھے اتر کر رہ گیا، کچھ دکانوں کے بالکل نزدیک تھا جبکہ رئیس کی نظر صرف گاڑی پہ تھی جو مڑ رہی تھی۔

پیچھے پیچھے وہ دونوں … کافی دور نکل آئے تھے۔ رئیس اب سڑک سے اتر کر ایک … کی طرف مڑ گیا تھا۔ امجد نے پیچھے سے موڑ کاٹا تو رئیس قریب … ایک مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اس وقت اگر امجد نے پیچھے … دیکھا بھی ہوتا تو اندھیرے کی وجہ سے … جانے یہ اس کا … مکان تھا … تھا، لیکن بہر حال یہ تو طے تھا کہ … ایک ٹھکانہ ضرور ہے اور اس کا … میں اس نے خرم کو وہاں بلا کر رئیس کے حق میں … شمشیر سے حاصل شدہ معلومات بھی وہ سب خرم سے شیئر کر رہا تھا۔

"وہ … روڈی" خرم نے سر ہلایا۔ "ہاں یہ … نام سنا ہوا ہے۔ تھانے میں … ویسے یہ اور اس کے چند ساتھی موٹر سائیکل چوری کے کئی کیسوں کے اندر پکڑے گئے ہیں۔"

"اور ساتھیوں کے نام بتا سکتے ہو؟"

"ہاں، کل تھانے جا کر بتا سکتا ہوں۔"

"ہوں … اوکے پھر کل بات ہوتی ہے۔" امجد نے کال منقطع کر دی۔ اب تو کل تک وہ … آگے کے لیے کچھ پلان کر سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی واقعی اللہ پاک کی بڑی مدد ہوئی تھی جو آتے ہی اسے خرم جیسا ساتھی میسر آ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد تو ہمیشہ شامل حال رہی تھی۔ ایسے ویسے بھی کم سہارا نہ تھے۔ وہ کچھ سکون اور بہت حد تک ایک جوش سا محسوس کرتا گھر واپس آ گیا۔

☆☆☆

خرم کے واٹس ایپ میسج آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ڈیوٹی پہ موجود تھا تو بجائے کال کرنے کے اس نے سب کچھ اسے لکھ کر بھیج دیا تھا۔ ساتھ کچھ تصویریں بھی تھیں۔ رئیس کی تصویر دیکھ کر بھی کنفرم ہو گیا کہ وہ غلط آدمی کے پیچھے نہیں گیا تھا۔ خرم نے چار تصاویر اور بھی بھیجی تھیں۔ یہ سب رئیس کے ساتھی تھے۔ ان کے نام بھی درج تھے۔ خرم نے لکھا تھا کہ ان سب کو موٹر سائیکل اور موبائل چھینی میں دھرا گیا تھا۔ کچھ دن کی جیل بھی کاٹ چکے تھے۔

امجد نے تصویریں دیکھنے کے دوران ہی کچھ پلان کیا۔ کام ذرا بہت ہی احتیاط طلب تھا لیکن اب وہ مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ بار بار تصاویر اور ان کے

تعارف کو دیکھ کر ذہن میں بٹھایا اور چہرہ ماسک سے ڈھانپ کر ٹوپی پہن کر باہر نکل آیا۔ اب اس کا رخ پچھلی ذات والی اس گلی کی طرف تھا جہاں اس نے ریکس کو جاتے دیکھا تھا۔ دن کے وقت یہاں رش معمول سے کم تھا۔ اس نے مختلف گلیوں میں راستے بدل بدل کر چار الگ الگ لوگوں سے الگ الگ اوقات میں ان چار لوگوں کے متعلق پوچھا، جیسے کہ وہ کسی کا پتا پوچھتا پھر رہا ہے۔ اسے شک سا گزرا کہ ہوسکتا ہے پچھلی رات جس مکان میں ریکس داخل ہوا، وہ اس کا اپنا گھر نہ ہو بلکہ ایسے کسی ساتھی کا ہو، تبھی عام راہ گیروں سے عام انداز میں سوال پوچھے اور ان چار ناموں میں سے اسے کاشف عرف کاشی کے متعلق بتایا گیا کہ ہاں وہ یہیں رہتا ہے۔ اسجد کا دل چاہا کہ اسے تصویر بھی دکھا دے لیکن اپنی محتاط طبیعت کے باعث رک گیا۔ وہ کسی بھی راہ چلتے کو اپنے بارے میں مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا، البتہ جو دروازہ اس آدمی نے بتایا، وہ پچھلی رات والے مکان کا نہیں تھا۔ اب اسجد مخمصے میں پڑ گیا کہ معلوم نہیں یہ کاشی ان کاموں میں ملوث ہے بھی کہ نہیں۔

''آں...... بھائی صاحب......!'' اسجد نے اس آدمی کو کچھ سوچ کر پیچھے سے آواز لگائی، جس پر وہ ادھیڑ عمر شخص مڑا۔ ''یہ کاشی کام سے کب لوٹتا ہے، کچھ اندازہ ہے؟''

''کام وام تو کچھ نہیں کرتے یہ لڑکے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی مکان کے اندر گیا ہے۔ آپ دروازہ بجا کر پوچھ لیں۔''

''اوہ...... اچھا، اچھا۔'' اسجد نے فارمل سی مسکراہٹ دی۔ ''بہت شکریہ جناب! میں مل لیتا ہوں۔'' اس نے دکھاوے کے لیے آہستہ روی سے مکان کی طرف قدم بھی بڑھا دیے۔ حالانکہ دروازہ بجانے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے کاشف سے ملنا ہی نہیں تھا۔

اسجد نے دروازے کے قریب جا کر بلاوجہ موبائل فون کان سے لگا کر لب ہلانا شروع کر دیے تاکہ وہ آدمی دور چلا جائے اور جونہی گلی کے موڑ سے وہ غائب ہوا، اسجد ایک گہرا سانس لیتے ہوئے تیز قدموں سے اس گلی کے دوسرے اینڈ پر آیا۔ اس اینڈ پر بڑا روڈ تھا جس کے کنارے آج بھی قلفی اور جوس والوں کے ٹھیلے کھڑے تھے۔ اسجد کو کسی طرح یہیں کہیں ٹائم پاس کرنا تھا اور کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اسے سڑک کے پار والے ٹھیلے کے نزدیک ایک پرانا بنچ ایسا دکھائی دیا کہ جس پر بیٹھنے سے اسے سامنے والی لمبی گلی صاف دکھائی دے سکتی تھی۔

اس نے جلدی سے روڈ کراس کیا اور اب وہ گنے کا رس بنانے والے ٹھیلے کے نزدیکی بوسیدہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک گلاس جوس کا آرڈر بھی دے دیا۔ جوس کا گلاس ختم کر کے بھی وہیں بیٹھا رہا۔ کبھی کبھار ٹھیلے والے سے موسم، ماحول، کام کاج کی بات بھی کر لیتا۔ وہ بھی باتونی آدمی تھا، صاحب سے بات کر کے بڑا فخر محسوس کر رہا تھا۔ اسجد نے باتوں باتوں میں جتا نا کہہ دیا کہ میرا دوست یہاں تک کار لے کر آ رہا ہے، اس لیے اس کا ویٹ کر رہا ہوں...... اور اب وہ آرام سے کافی دیر بے فکر ہو کر بیٹھ سکتا تھا۔

اسجد کا انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ قریب پینتیس چالیس منٹ بعد دور گلی میں اسی دروازے سے ایک لڑکا باہر نکلا اور وہ کاشف ہی تھا۔ اسجد نے جلدی سے موبائل کان سے لگایا۔

''ہاں آصف! کدھر ہو؟'' اس نے اونچی آواز میں ٹھیلے والے کو سنانے کے لیے کہا۔ اس نے بھی چونک کر دیکھا۔ اس دوران اسجد کی نظر کاشف پر تھی جو گلی سے نکل کر روڈ پر آیا اور اس کا رخ بائیں ہاتھ پر بڑے چوک کی طرف تھا۔

''میں تو یہاں سڑک کنارے تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔ اچھا اچھا...... تم چوک کے اس طرف ہو۔ اوکے...... اوکے۔ میں خود آ رہا ہوں، وہیں ویٹ کرو۔'' اس نے اپنے وہاں سے نکلنے کی اچھی طرح وضاحت کرتے ہوئے ہاتھ لہرا کر ٹھیلے والے کو فارمل اجازتی سلام پھینکا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

کاشف سڑک کے اس پار تھا اور اسجد مخالف سمت میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے چوک پر پہنچا۔ کاشف ایک جانب کو مڑ گیا تھا۔ اسجد بھی احتیاط سے سڑک پار کرتے ہوئے دوسری جانب آ گیا اور اب وہ کاشف سے پچیس تیس قدم پیچھے تھا۔ کاشف اب روڈ سے اتر کر بازار میں داخل ہو گیا۔ اسی بازار کے دوسرے اینڈ والے روڈ پر اسجد کا گھر بھی تھا۔ کاشف اس طویل بازار کے سینٹر تک پہنچ کر ایک چھوٹی بند مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔ اسجد دانستہ ایک شاپ کے باہر چپلیں دیکھنے لگا۔ نظر اس کوچے پر جما رکھی تھی۔ قریب پانچ سات منٹ بعد کاشف وہاں سے نکلا اور مزید آگے بڑھ گیا۔ اسجد نے نوٹس کیا کہ پہلے وہ خالی ہاتھ تھا اور اب اس کے پاس ایک شاپر تھا۔ بازار ختم ہونے پر کاشف روڈ کراس کر کے دوسری جانب آ گیا۔ یہ ساری جگہیں چونکہ رش والی تھیں تو پیچھا کرنے میں احتیاط کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔

روڈ کراس کر کے وہ دونوں اب جس سڑک پر آ گئے تھے، یہ راستہ اسجد کے گھر کو ہی جاتا تھا۔ کاشف اب روڈ

کھڑے آگے بڑھ رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں اس نے موبائل جیب سے نکال کر کان سے لگالیا۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا اور کال آف کرنے کے بعد وہ چند قدم چل کر وہیں رک گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ کبھی وہ اپنی گھڑی دیکھتا اور کبھی اس لیڈیز ہاسٹل کے دروازے کو جہاں وہ سرمئی آنکھوں والی رہتی تھی۔ امجد نے بھی قدم روک لیے تھے۔ وہ اس وقت ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے تھا اور سائڈ پر کھڑی ایک بائیک پر ٹیک کر بظاہر اپنا موبائل دیکھنے لگا تھا۔ کاشف کی پشت اس کی جانب پڑ چکی تھی۔ امجد کو معلوم ہی نہ ہوسکا کہ لیڈیز ہاسٹل سے کوئی لڑکی نکل کر کاشف کے نزدیک آچکی تھی۔ اس نے تو جب کاشف کو کسی سے بات کرتے دیکھا تو سمجھ آئی کہ اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

کاشف نے شاپر اسے تھمایا اور تیزی سے واپس آتے امجد کے قریب سے بھاگتا ہوا بازار کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ اتنی سی دیر میں بھی سمجھ میں آیا کہ کاشف کے ہاتھ اب خالی تھے اور شاپر لڑکی کے پاس تھا اور وہ لڑکی اب لیڈیز ہاسٹل کی طرف بڑھ رہی تھی اور ظاہر ہے کہ چند ہی سیکنڈز میں وہ بھی ہاسٹل کے گیٹ میں داخل ہوجاتی۔

کبھی کبھار سوچنے کی مہلت بہت مختصر ہوتی ہے اور اسی میں کچھ طے کرنا ہوتا ہے۔ وہ بھی کاشف کے پیچھے جانے کے بجائے لڑکی کے نزدیک آیا۔

"ایکسکیوزمی!"

"ہوں۔" لڑکی چونک کر پلٹی۔ اس نے ایک ہلکی گلابی سی چادر اوڑھ رکھی تھی، چہرے پر آسمانی ماسک تھا، لیکن آنکھیں...... حیرت سے امجد کو دیکھتی وہ نگاہیں تو امجد لاکھوں کے مجمعے میں پہچان سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بالکل جامد ہوا۔ وہ سرمئی آنکھوں والی لڑکی کاشف سے لیا شاپر ہاتھوں میں دبائے تعجب یا شاید تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ امجد کو سنبھلنے میں چند سیکنڈز لگ گئے۔ دماغ کچھ دیر کے لیے واقعی خالی ہوا تھا لیکن اب وہ مکمل ہوش میں تھا۔ چل کر فوراً اس کے نزدیک آیا۔

"کاشف کہہ رہا ہے، یہ وہ شاپر نہیں ہے۔ ابھی وہ دوسرا لا رہا ہے۔ یہ واپس کرنا ہوگا۔" اس نے ہلکا سا مسکرا کر بات کا اثر کم کیا۔

"کیا......؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھے جارہی تھی اور اسی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امجد نے نہایت سہولت سے اس کے ہاتھ والا شاپر اپنے قبضے میں لے لیا۔ تیز نگاہوں سے اندر جھانکا تو اندر بھی ایک ویسا ہی پیکٹ تھا جس پر پیلے رنگ کی ٹیپ سختی سے لپیٹی گئی تھی۔ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اندر کیا ہوسکتا ہے۔ پارسل دیکھنے میں ہی کافی مشکوک تھا اور یہ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ کس صدمے سے ابھی ابھی دو چار ہوا ہے۔ لیکن کچھ لمحے ایسے اچانک ہماری زندگی میں آتے ہیں کہ ان سے نمٹنا ہی دراصل ہماری ہمت اور بہادری کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ وقت آنکھوں میں آنسو بھرنے کا نہیں تھا۔ وہ لڑکی کو سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے ہاسٹل کی نزدیکی گلی میں تیزی سے داخل ہوکر اس کے آگے سڑک کے دوسری جانب غائب ہوگیا۔ ابھی تو کسی طرح یہاں سے نکل کر خطروں سے دور نکلنا ہوتا تھا۔

وہ اس تین چار گلیاں تقریباً دوڑتے قدموں سے طے کرتے ہوئے اس علاقے سے نکل آیا۔ ایک سنسان گلی آتے ہی وہ ذرا دیر کو رکا، جیب سے اپنے مکان کی چابی نکال کر پیکٹ میں کٹ لگایا اور اسے انگلیوں سے کھول دیا۔ اندر موجود اصل پیکٹ اس کی توقع کے عین مطابق سفید پاؤڈر ہی تھا۔ امجد کے لیے یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ موقع کوئی اور ہوتا تو اتنی بڑی کامیابی پر شاید وہ خوشی سے اچھل پڑتا لیکن پاؤڈر پر نظر پڑتے ہی اس کا دل جس درد سے بوجھل ہوا تھا، وہ ایک بے اختیاری عمل تھا۔ سرمئی آنکھوں والی معصوم چہرے کی اصلیت نے جو گھاؤ دیا تھا، اس پر سوچتے تو شاید اس کی ایک عمر حیرت میں بیتنے والی تھی۔ چہرے بھی دھوکا دیتے ہیں، سنا تو شاید ہزاروں مرتبہ تھا لیکن اپنی زندگی میں "یوں" پیش آئے گا، اس کا تو شاید تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

وہ حیرت سے وہیں کھڑی کاشف کا انتظار کر رہی تھی، جس کا ایک آدمی ابھی ابھی اس کے ہاتھوں سے پیکٹ واپس اچک کر لے گیا تھا۔ اب معلوم نہیں دوسرا پیکٹ کون لانے والا تھا۔ اس کی نظریں چھوٹی گلی اور دور سڑک پر اسی جانب لگی تھیں جہاں سے کاشف دوڑ کر گیا تھا لیکن اب نہ گلی میں وہ مشکوک آدمی تھا جو ناک منہ چھپائے آیا اور شاپر اچک کر لے گیا اور نہ ہی دور سے کاشف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نہایت پریشانی سے انگلیاں چٹخا رہی تھی، جب ہاسٹل کے گیٹ سے نکل کر ماریہ اس کے قریب آئی۔

"پارسل والا نہیں آیا ابھی؟"

"آیا تھا...... لیکن......!" وہ بری طرح نروس لگ رہی تھی۔ "لیکن ایک اور آدمی مجھ سے وہی پارسل لے کر ادھر سے نکل گیا۔" اس نے سامنے گلی کی طرف اشارہ کیا تو ماریہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آنے

والی تھی۔

"تو...... اب...... کیا کرنا ہے؟"

"پتا نہیں۔ وہ آدمی تو یہ کہہ گیا کہ کاشف دوسرا پارسل لا رہا ہے۔"

"کتنی دیر ہو گئی؟" ماریہ بھی ہر طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب تو بہت دیر ہو گئی۔"

"تو چلو۔ کاشف سے کال پر ہی بات ہو سکتی ہے اب تو۔ آ جاؤ۔" ماریہ پلٹی تو نورینہ بھی پیچھے چل پڑی۔ نظریں گھما کر البتہ اب بھی پیچھے دیکھ لیتی، لیکن کسی کو نہ پا کر اوپر آ گئی۔

"کیا مطلب...... کوئی اور کیسے لے گیا؟" صباحت منہ کھولے نورینہ کو دیکھ رہی تھی، جس پر وہ مزید بوکھلا گئی۔ سارا قصہ تفصیل سے گوش گزار کیا جس پر صباحت نے فوراً کال ملائی۔

"نہیں تو...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" کاشف ساری بات سن کر مزید ششدر رہ گیا۔ "میں نے کسی کو نہیں بھیجا، نہ ہی دوسرے پیکٹ کی کوئی بات ہے۔ ایک منٹ...... میں پتا کر کے بتاتا ہوں۔" اس نے فوراً کال کاٹ دی تو وہ ماتھا پیٹتی پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

کاشف نے اگلا فون رئیس کو ملایا لیکن اس نے بھی کسی آدمی کو نہیں بھیجا تھا...... اور اب تو جو بھی سنتا جا رہا تھا، مزید پریشان ہو رہا تھا۔ رئیس نے اگلی کال ایک اور آدمی کو ملائی لیکن سبھی بے خبر نکلے۔ اب معلوم نہیں اتنا اہم پیکٹ کون اڑا لے گیا تھا۔ دھیان پولیس کی طرف گیا تو فوراً اگلی کال جہانگیر سلیم کو ملا دی۔

"یہ کون سا وقت ہے کال کرنے کا؟" جہانگیر کا موڈ بگڑ گیا۔ ابھی ابھی تنویر سر اس کے سامنے بیٹھے تھے، پانچ منٹ پہلے ہی وہ یہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔

"صاحب! شاید پولیس کا کوئی بندہ ہمارا ایک پارسل چھین کر لے گیا ہے۔" وہ بوکھلا کر بتانے لگا اور جہانگیر کے پوچھنے پر جتنا معلوم تھا، سر کو بتا دیا۔ سن کر اس کا ماتھا بھی شکنوں سے پُر ہو گیا۔

کاشف کے ہاتھ سے کون یہ پیکٹ چھین سکتا تھا...... کوئی ان کا بندہ؟ لیکن کون......؟ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک کال ملائی لیکن جسے کال ملائی وہ بھی بے خبر تھا۔ شفقت کو بلا کر پچھلے چند دن میں لکھوائی گئی رپورٹس طلب کیں۔ ذہن میں ایک خیال آیا کہ شاید کوئی نئی شکایت درج ہوئی ہو لیکن پچھلے ایک ہفتے کے دوران تو ایسا کچھ نہیں ملا۔ تو کوئی پولیس والا ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ پھر پولیس کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ وہ کرسی پر گھومتے ہوئے دیر تک اسی مدعے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن کچھ پتے نہیں پڑا۔

☆☆☆

اس وقت وہ اپنے مکان پر واپس آیا تھا۔ تھک کر کرسی پر گرتے ہوئے اس نے لکڑی کی ٹیک سے سر ٹکایا اور ٹانگیں سامنے سیدھی کرتے ہوئے دونوں ہاتھ آنکھوں پر باندھ لیے۔ ناک سے باقاعدہ "شوں شوں" کی آواز سے گہری سانسیں نکل رہی تھیں، دماغ آپے میں نہ تھا، اعصاب ایک دم سست اور دل بےحد بوجھل تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا کرنے گھر سے نکلا تھا اور یہ کیا کر آیا تھا۔ صبح وہ چند نشانیوں کے بل پر جب گھر سے نکلا تو حد سے زیادہ ایکسائٹڈ تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ آج اپنے مشن کے کسی بہت اہم سرے تک وہ ضرور پہنچ جائے گا...... اور ہوا تو ایسا ہی تھا، پر کام کی راہ آگے چل کر دل کی تنگ گلیوں میں کہیں جا الجھے گی، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ لڑکی اس سے قبل اگر دو مرتبہ اس سے نہ ٹکراتی تو شاید یہ ایک معمولی واقعہ ہوتا یا پھر زیادہ سے زیادہ اس حد تک حیران کن کہ اسے تو بوائز کالج میں منشیات فروشی کی تحقیقات کے لیے بھیجا گیا تھا اور یہاں معلوم ہو رہا تھا کہ اس گھناؤنے کام میں تو گرلز بھی انوالو تھیں، بلکہ وہ سرمئی آنکھوں والی پیکٹ لیتے ہوئے بذاتِ خود پکڑی گئی تھی۔

امجد نے اپنی فوری سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے صرف وہ پیکٹ اپنے قبضے میں لیا تھا۔ ان تحقیقات کا مطلب ہی ماخذ تک پہنچنا تھا۔ یہ لڑکے، لڑکیاں تو ایسی درمیان کی کڑیاں تھیں جو خود بھی اس ظلم کا شکار ہو رہی تھیں۔ سرمئی آنکھوں والی معلوم نہیں کہ خود نشے کی عادی تھی یا رقم کے عوض اداروں میں اس زہر کو پھیلا رہی تھی۔

امجد کو یہ اندازہ تو بہت پہلے سے تھا کہ تحقیقات کا دائرہ پہلے وسیع ہوتا ہے اور پھر اچانک سمٹ کر کسی ایسے نکتے پر آ جاتا ہے کہ جہاں آپ کو فوری ایکشن لے کر سامنے بھی آنا پڑ سکتا ہے۔ امجد کو اندازہ تو نہیں تھا کہ وہ وقت اتنی جلدی آن پہنچے گا لیکن اس مرحلے کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔ تبھی شکن آلود ہی موڈ کاٹ کر اس نے خرم کو کال ملائی۔

لڑکی کے ہاتھ سے ایک اجنبی اتنا اہم پیکٹ چھین کر نکل گیا تھا، یہ بات معلوم نہیں کہاں کہاں پھیلنے والی تھی۔ اسے کاشف کے چوکنے اور کہیں چھپ جانے سے پہلے ہی اسے گرفت میں لینا تھا۔ خرم تین حوالداروں سمیت اسی وقت کاشف کے مکان پر پہنچا۔ خرم نے راستے میں ہی کال

کر بتایا کہ وہ کاشف کی گلی تک پہنچ چکے ہیں، تب امجد بھی تیز قدموں سے دوبارہ وہاں تک پہنچا تھا۔ جس وقت وہ پہنچا، خرم گھر کی تلاشی لے کر کاشف کو گرفتار کر چکا تھا۔ امجد نے ذرا دیر رک کر کچھ سوچا اور اس دوسرے مکان پر بھی ریڈ پڑوا دی جہاں ایک دن رئیس کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ دونوں مکان ایک ہی گلی میں تھے۔ رئیس تو موجود نہیں تھا لیکن تلاشی میں بہت سارا نشا آور مواد برآمد ہو گیا۔

کاشف سے وہیں کھڑے کھڑے کال کروائی گئی۔ رئیس کو بالکل شبہ نہیں گزرا کہ کاشف کسی دباؤ میں ہے۔ کاشف نے اس سے کہا کہ صاحب نے بلایا ہے، اس لیے فوراً میرے گھر آؤ، بائیک پر اکٹھے نکلتے ہیں۔ وہ اس وقت ایک نزدیکی چائے کے ہوٹل میں بیٹھا تھا، اس لیے بڑے سکون سے ٹہلتا ہوا کاشف کے گھر پہنچا۔ پولیس کی نفری اندر اس کے انتظار میں موجود تھی۔

ان دونوں کے قابو میں آتے ہی انہی کے ذریعے مزید کال کروا کر دو اور لڑکوں کو بھی اسی طرح بلوایا گیا۔ یہ وہ چاروں لوگ تھے جنہیں موٹر سائیکلوں اور موبائل چوری کے معمولی کیسز درج کروا کر اسی پولیس کے ملوث ارکان نے ضمانت پر آزاد کروا دیا تھا۔ خرم ان سب کو لے کر پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا اور امجد اپنے مکان پر واپس آ گیا۔ اس نے خرم سے کہا کہ اسے آج ہی کسی طرح ایس پی تحریر صاحب سے ملنا ہے۔

اس کے بعد ان چاروں سے تحقیقات کا آغاز کرنا تھا اور اس سب میں بھی زیادہ وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ چار لڑکے بھی جن کے ہاتھوں کا کھلونا تھے، ان تک یہ خبر بھی پہنچ سکتی تھی۔ خرم کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ لیڈیز ہاسٹل پر بھی ریڈ ہونی چاہیے لیکن امجد نے منع کر دیا تھا۔ اسے تو بس "دینے" والے ہاتھوں تک پہنچنا تھا...... اور اب یہ سامانِ تباہی کاشف وغیرہ کو کس نے دیا تھا، وہ ابھی جاننا باقی تھا۔ امجد بس دس منٹ ہی گھر میں بیٹھ پایا پھر خود بھی تھانے آ گیا۔

"کچھ معلوم ہوا؟" وہ سرسری سی نظر ان پر بھی ڈال لیتا۔

"زبانی سوالات تو آپ ہی پوچھیں، میں تو اپنے اسٹائل میں خبر لیتا ہوں۔" خرم اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شرافت سے بہت پوچھ لیا تھا۔ چاروں نیچے کھڑے تھے۔ اب اس کی برداشت جواب دے رہی تھی۔

"میں ذرا ان دو کو لے کر جاتا ہوں، آپ باقی دو سے اپنے انداز میں پوچھ کر دیکھ لیں۔" خرم جان بوجھ کر اندر دو کو لے گیا کیونکہ ایک کی درگت بنتی دیکھ کر دوسرا اوپر ہی منہ کھول دیا کرتا تھا۔ کاشف اور رئیس کو اندر لے جا کر

اس نے کاشف کو کرسی سے باندھا۔ رئیس کا چہرہ ہلدی جیسا ہو گیا۔ کاشف کی حالت تو مرنے جیسی ہو رہی تھی۔

"صاب...... مم...... میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے تو پتا بھی نہیں کہ پیکٹ میں کچھ غلط چیز تھی۔ صاب! میں غریب آدمی ہوں۔ صاب! ہم تو ہوٹل میں جڑے ہیں۔"

"پیکٹ دیا کس نے؟" خرم نے اس کی بات پر بھی دھیان ہی نہیں دیا اور اس کا کان اپنی مٹھی میں کھینچ کر اس زور سے مروڑا کہ کاشف کی ایک دردناک چیخ نکل گئی۔

"پپ...... پتا نہیں۔ دیکھا نہیں......؟"

"کیا دیکھا نہیں...... کتنی مرتبہ یہ دیہاڑی کما رہے تھے؟" خرم نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر کرسی کی پشت پر رکھا تو اس کا نرخرہ باہر کو نکل آیا، آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ اس نے کانپتے ہاتھ جوڑ کر بولنے کی اجازت مانگی کیونکہ حلق سے آواز ہی نہ نکل پا رہی تھی۔ خرم نے جھٹکے سے سر چھوڑا تو وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سیدھا ہوا۔ خرم اب کاشف کو چھوڑ کر رئیس کی طرف بڑھا۔

"تم تو ضرور شرافت سے بتاؤ گے...... ہے نا؟"

"جی جی، بالکل۔ وہ کیا ہے صاب! ہم تو ہوٹل پر جڑے ہیں نا...... تو ایک دن ایک آدمی کار پر آیا۔ پوچھا کام کی ضرورت ہے؟ ہم نے ہاں کر دی۔ پتا نہیں پیسے چیک تھے، کہتا ہے پہنچانے کی رقم دے گا۔ ایک پیکٹ کا پانچ سو۔ کام آسان تھا، بس اس لیے کرنے لگ گئے۔"

رئیس طوطے کی طرح بولتا چلا گیا۔ بات کے دوران چوری چوری کاشف کو بھی دیکھ لیتا۔ خرم نے ابرو اٹھا کر طنزیہ دیکھا اور تعریفی انداز میں ہاتھ لہرایا۔

"کیا روانی ہے بچے! اچ کے تو پھول جھڑ رہے ہیں۔ "باتوں" کا پانچ سو میری طرف سے۔" اس نے پہلے تو رئیس کا کندھا تھپکا اور پھر اچانک ایک لات اس کے پیٹ پر ماری کہ وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔ منہ سے ایک شدت کی کراہ نکلی۔ خرم نے اس کی پشت پر بوٹ والا پاؤں رکھا تو وہ پیٹ کے بل نیچے گر گیا۔ خرم نے اسے بالوں سے پکڑ کر سر کو اوپر کھینچا تو اس کی حالت کاشف سے بھی بدتر ہو گئی لیکن خرم اسے چھوڑ کر پھر کاشف کی طرف آیا۔ اس کی ٹانگ سے شلوار اونچی کی اور ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو انگلی پر مارتے ہوئے گھور کر کاشف کو دیکھا۔ صرف چند سیکنڈ سوچا اور زور سے ڈنڈا اس کے ننگے گھٹنے پر ایسے دے مارا کہ کاشف کی دلدوز چیخ نے کمرے کی چھت کو ہلا ڈالا۔ خرم نے اس کی چیخ کی پروا نہ کرتے ہوئے دوبارہ ڈنڈے کو ہوا میں لہرایا۔ کاشف نے روکنے کے انداز

میں ہاتھ آگے کیے۔
''شہزاد...... شہزاد فاروق۔''
''بولتے جاؤ۔'' اس نے ان سنی کرتے ہوئے پھر ڈنڈا ہوا میں اٹھایا۔
''گگ...... کباڑیا ہے۔ چھنی کے مین بازار میں پرانے ٹی وی، فریج اور سیکنڈ ہینڈ مشینری کی دکان ہے۔''
''رکو مت۔'' خرم اس زور سے چلایا کہ دور لیٹا رحیم بھی کانپ گیا۔
''ہمیں تو وہی سپلائی کرتا ہے صاب!''
''شہزاد کو کون دیتا ہے...... اس کا نام؟''
''نہیں پتا صاب! قسم سے نہیں پتا۔'' وہ ڈنڈا لگنے کے ڈر سے ہاتھ آگے کرنے لگا۔
''تمہیں بھی نہیں پتا؟''
''صاب! وہ شہزاد کسی کو فون پر خان جی کہہ کر بات کرتا ہے، وہی مال بھیجتا ہے۔''
''ہوں۔'' خرم نے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا اور دونوں سے ان تمام جگہوں اور ٹھکانوں کی تفصیل معلوم کی جہاں جہاں یہ مال بھیجا جاتا تھا۔ ان کی ساری باتیں موبائل میں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔ بعد میں آرام سے سن کر سمجھنا آسان ہو جاتا۔ ایک حوالدار کو بلا کر ان دونوں کو الگ الگ بند کروایا اور اپنے آفس میں آ گیا۔ یہاں امجد اکیلا بیٹھا تھا۔ باقی دو کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔
''ہوں...... پتا چل گیا ہے اصل بندے کا۔'' خرم نے اطلاعاً کہنا شروع کیا۔
''شہزاد فاروق۔'' امجد نے اطمینان سے بتایا تو خرم کو جھٹکا لگا۔
''کیسے جانا؟''
''دو بندے تم میرے پاس بھی چھوڑ گئے تھے نا۔''
''لیکن تم نے تو کوئی مار پیٹ نہیں کی، ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں۔''
''ہاں، بالکل نہیں کی۔ ویسے بھی وہ تمہارا کام ہے۔''
''ارے تو کیسے اگلوایا؟'' خرم کی حیرت میں فرق نہ آیا۔ امجد نے قہقہہ لگایا۔
''پہلے ان سے ان کی فیملی کی تفصیل پوچھی۔ ایک شادی شدہ تھا، بتانے لگا کہ تین بچے ہیں۔ فلاں فلاں اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ دوسرا کنوارا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی ورکشاپ پر کام کرتے ہیں، ماں گھروں میں ملازمہ ہے۔ بس میں نے سنتے ہی کہا کہ اب وہ سب ہمارے قبضے میں ہیں۔''
''ارررے...... بس اتنے پر ہی؟'' خرم کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ اس کا ہونق پن دیکھ کر امجد کی ہنسی نہ رک رہی تھی۔
''چلیں پھر...... دیر کی تو وہ کہیں چھپ نہ جائے۔''
''ہوں...... میں ذرا یہ رپورٹ واٹس ایپ کر دوں تنویر صاحب کو۔''
''او کے۔ میں پھر باہر ویٹ کر رہا ہوں۔''
''بس میں ابھی آیا۔'' خرم نے تسلی کے انداز میں انگوٹھا اٹھایا تو امجد باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آخری پیشی بھی آ کر گزر گئی۔ ضمیر جان کا وکیل کچھ نہ کر پایا۔ وکیل جبار کی جتنی جیب گرم تھی، تیاری بھی اتنی تگڑی تھی۔ دو قلعوں کی ملکیت کا فیصلہ ولید کے حق میں آیا تھا۔ امیر جان نے برسوں پہلے ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوا کر جو غلطی کی تھی، اس کا خمیازہ اب آفندی خاندان کو اس صورت میں بھگتنا پڑا کہ خاندانی ورثہ ایک غیر کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ضمیر جان ایک دم خاموش لیکن در اصل نہایت غصے کی حالت میں حویلی واپس آئے تھے۔ ان کا خون بری طرح کھول رہا تھا اور اندر کی یہ کھولن کسی پر فائر کھول کر بجھانے کی خواہش ہو رہی تھی۔ انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی، اپنے ہی بھتیجے سردار ولید خان کے ہاتھوں۔ وہ شکست کہ جس کے وہ حقدار ہی نہ تھے...... وہ شکست کہ جو ولید نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر انہیں دی تھی...... وہ شکست جو در اصل ولید کے حصے میں آنا تھی، اس کی دھوکا دہی اور بے ایمانی کی بدولت آج سردار ضمیر جان کا مقدر بن گئی تھی، مگر لگاتار سوچتے چلے جانے کے باعث آج ایک ہفتے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ ہی گئے تھے کہ ان کی شکست کے پیچھے ولید سے بھی بڑا ہاتھ اس حرام خور وکیل کا تھا جس نے ساری سچائی معلوم ہوتے ہوئے بھی ولید کو جیت دلوائی تھی۔
''میں نے کہا تھا جبار احمد......! میرے آڑے مت آنا۔'' وہ مٹھیاں بھینچے گہرے سانس لیتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہے جا رہے تھے۔
''کہا تھا اپنا علم 'غلط' پر مت لگانا، پر تم باز نہیں آئے۔ تم نے روپوں کے عوض میری جیتی بازی کسی اور کی جھولی میں ڈال دی۔'' یہاں آ کر سردار ضمیر کا خون اس بری طرح کھولتا کہ ان کا جی چاہتا اس جلتے الاؤ میں سب سے پہلے وہ جبار کو ڈبو کر اس کی چیخیں سنیں اور اندر تک سکون پائیں۔
''میں نے اسے ہوشیار بھی کیا تھا کہ اگر اس نے کچھ بھی ایسا ویسا کیا تو نتائج کا ذمے دار خود ہوگا، لیکن بات اس

بچے نہیں پڑی شیر دل!" ضمیر جان نے اپنی لال آنکھیں شیر دل پر گاڑیں تو وہ بھاگ کر نزدیک آیا۔

"خان جی! کیا حکم ہے...... کہیں تو قصہ ہی تمام کر دیں؟"

"نہیں، ٹھہرو۔" انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔ "اچھا، ذرا اپنے نالائق وکیل کا نمبر ملاؤ۔ کیا نام ہے کمبخت کا؟"

"جی، خان! شاہد ترین۔" وہ جلدی جلدی نمبر بھی تلاش کر رہا تھا، پھر نمبر ملتے ہی موبائل خان کی طرف بڑھا دیا۔

"السلام علیکم، خان صاحب!" شاہد ترین کی آواز کچھ دبی دبی سی تھی۔ جوش بھی ایک دم مفقود تھا۔ ضمیر جان کا کیس وہ ہار گئے تھے۔

"ہوں۔" ضمیر جان نے دھیان نہیں دیا۔ "یہ بتاؤ، کیس میں آگے کچھ گنجائش ہے یا بس بالکل ہی گئے...... یہ دو ٹکے؟"

"آں...... خان! گنجائش تو ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے اگر جرگے کے مشر تعاون کریں تو ایک درخواست دائر کی جاسکتی ہے۔ جرگے کے معاملات کو اگر یہاں کے مشران عدالت میں نہ اٹھانا چاہیں تو وہ ایکشن لے سکتے ہیں۔"

"تو یہ بات پہلے نہیں بتا سکتا تھا؟" ضمیر جان کا لہجہ تیز ہوا۔

"خان صاحب! مجھے تو ابھی بالکل آخری دنوں میں پتا چلا۔ عدالت میں کیس داخل ہو چکا تھا، ایک دو پیشیاں بھی ہو چکی تھیں۔ آپ کو تو معلوم ہے۔" وہ ہلکا سا منمنایا جس پر ضمیر جان بھی تھوڑا دھیمے پڑے۔

"ہاں ہاں...... لیکن وہ وکیل...... وہ پھر ولید کو الٹے مشورے نہ دے۔"

"اس کا تو ایک ہی حل ہے خان!" شاہد نے کچھ دیر سوچا۔ "اس بار کچھ تگڑی دھمکی دیں۔"

"ہوں...... سوچتے ہیں۔" ضمیر جان نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

امجد اور خرم دو حوالداروں سمیت جیپ پر جس وقت چکی پہنچے، مغرب بس ہونے ہی والی تھی۔ دونوں بازار میں شہزاد کباڑیے کا پوچھتے ہوئے جب وہاں پہنچے تو دکان بند تھی۔ آس پاس والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ عام حالات میں تو دکان آٹھ نو بجے تک کھلی ہوتی ہے لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ بند کر کے چلا گیا ہے۔

"لگتا ہے مخبری ہوئی ہے!" امجد نے خرم کو دیکھا۔ اس کے لب بے اختیار بھنچ گئے۔

"سمجھ سکتا ہوں...... کب ہوئی، کہاں سے ہوئی۔"

"بس اتنا بتا دو...... "کس" نے کی؟" امجد نے معنی خیزی سے مسکرا کر پوچھا۔

"آستین کے سانپ ہیں برادر...... چلو، راستے میں بتاتا ہوں۔" وہ سب دوبارہ جیپ میں آ بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک حوالدار تھا، دوسرا ساتھ والی سیٹ پر۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ خرم نے ایک نمبر نکال کر اپنا موبائل چپکے سے اس کے سامنے کیا جس پر اس نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلا دیا۔ ذرا دیر کے لیے کچھ سوچا پھر واٹس ایپ پر کچھ ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

"محکمے کا بندہ ہے تو اس کی کھنچائی کا وقت بھی آ گیا سمجھو۔" امجد نے ٹائپ کیا۔

"ہمم۔ یہی میں سوچ رہا ہوں۔ کب تک ڈھیل دیتے رہیں گے۔" خرم نے لکھا۔

"تمہاری اجازت ہے تو میں لیتا ہوں یہ ٹاسک۔" امجد نے جواب میں لکھا۔

"اچھا...... ابھی؟" خرم نے میسج لکھ کر حیرت بھری نظروں سے امجد کی طرف دیکھا جس پر اس نے مسکرا کر پلکیں موندیں، جس کا مطلب تھا کہ "ہاں ابھی"۔ خرم نے کچھ کر کندھے اچکا دیے اور تھمس اپ بھی کر دیا، جیسے کہہ رہا ہو "اجازت ہے"۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں واپس تھانے پہنچ گئے۔

ایس آئی جہانگیر سلیم اپنے آفس میں موجود تھا اور ایس پی تنویر احمد سے اس نے آتے ہی کال پر بات کی تھی۔ وہ آج پولیس ہیڈ کوارٹر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوری بات سن کر فی الفور ایکشن کی اجازت دے دی تھی۔ خرم نے نہایت تیزی سے امجد کی معیت میں ایک رپورٹ تیار کی جس میں ریکٹ تک پہنچنے کا سارا واقعہ درج کر کے محکمے کے چند ارکان پر شہزاد نامی سرغنہ کو بھگانے کا الزام شامل تھا۔ امجد رپورٹ لے کر اسی وقت بلا جھجک اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اپنا کارڈ دکھا کر اس نے سر تحریر کا واٹس ایپ سامنے کھولا جس میں انہوں نے کہا کہ وہ اپنے طریقے سے جیسے چاہے، جس سے چاہے تفتیش کر سکتا ہے۔ محکمے کے ارکان تعاون کرنے کے پابند ہوں گے۔ امجد نے جہانگیر سے اس کا موبائل طلب کیا جس پر اس نے لہجہ درشت کیا۔

"بے شک تعاون کریں گے، لیکن بنا کسی ثبوت کے آپ کسی کو شک کے دائرے میں نہیں ٹھہرا سکتے۔"

"سر! آپ مجھ سے زیادہ قانون سمجھتے ہیں۔ اس وقت یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایک مجرم کو دور نکل بھاگنے سے روکنے کی ایک کوشش ہے۔ آپ کو تعاون تو کرنا ہی

پڑے گا۔ پلیز اپنا پاسورڈ بتا دیں۔" اس نے اسی کا موبائل میز سے اٹھا کر جہانگیر کے سامنے کر دیا جس پر جہانگیر نے شعلہ بار نظروں سے امجد کو دیکھتے ہوئے بمشکل غصے کو قابو میں کیا اور موبائل اوپن کر دیا۔ امجد نے پہلے ہی ریکس سے شہزاد کا موبائل نمبر حاصل کر لیا تھا۔ اپنا موبائل کھول کر وہ نمبر دیکھا اور جہانگیر سر کے موبائل میں ڈائل کرنا شروع کیا تو پانچویں ہندسے پر ہی فاروق ایس لکھا ہوا ظاہر ہو گیا۔ اس نے کال لاگ چیک کیا تو آج کی ڈیٹ میں کال کی گئی تھی، وہ بھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے۔ اس نے جہانگیر سے کوئی بات کیے بنا فوراً تنویر سر کو کال کر کے بتایا کہ اس کا شک درست تھا۔ شہزاد کو بھگانے میں اپنے ہی لوگ شامل نکلے۔ سر تنویر نے بتایا کہ وہ ہیڈ کوارٹر سے نکل چکے ہیں، اس لیے سیدھے یہیں آ رہے ہیں۔ امجد نے خود بھی وہیں نشست جمالی۔

جہانگیر کے چہرے کے بدلتے رنگ، بے چینی سے پیچ و تاب کھانا سب دکھائی دے رہا تھا لیکن امجد نے سر تنویر کے آنے تک خود کو اپنے موبائل میں مصروف کر لیا۔ کچھ ہی دیر میں ایس پی تنویر احمد وہاں پہنچ گئے۔ تھانے میں واضح ہلچل مچ گئی تھی۔ تنویر احمد نے کھڑے کھڑے امجد کو سنا، موبائل ڈیٹا چیک کیا پھر جہانگیر کو دیکھا۔

"چار بج کر چھتیس منٹ پر آپ نے شہزاد کو [illegible] کال کی۔ کیا معاملہ تھا؟"

"سر! میں نہیں جانتا وہ کسی معاملے میں ملوث ہے۔ میں تو بس تھانے کا کچھ پرانا سامان سیل کرنے کا سوچ رہا تھا۔" اتنی ہی دیر میں جہانگیر بس یہی سوچ پایا۔

"کال کر کے پوچھیں، اس وقت وہ کہاں ہے؟"

تنویر سر نے اسی کا موبائل کھول کر نمبر ملایا اور اسپیکر بھی آن کر لیا۔ جہانگیر کے پاس بات سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

"جی صاب! اسلام۔" دوسری طرف سے ایک آواز سنائی دی۔

"کہاں ہو؟" جہانگیر نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

"صاب! آپ کے کہنے پر پشاور سے بھی نکل گیا ہوں۔ چیچی میں ہوں۔" امجد نے پیچھے جلدی سے لقمہ "لوکیشن" لکھ کر جہانگیر کے سامنے کیا۔

"کون سی جگہ؟" جہانگیر کی گھٹی گھٹی آواز پھر بڑی دقت سے نکل پائی۔

"صاب! آپ نے ہی تو کہا ہے کہ جابر سے ملوں۔ بس اسی کے پاس۔"

"آں... ہاں...!" وہ بس یہی کہہ پایا لیکن امجد نے پھر کچھ لکھ کر سامنے کیا۔

"میرے ساتھ رابطے میں رہنا اور میری جابر سے بات کروانا۔" اس نے امجد کا لکھا دہرایا تو شہزاد نے اوکے کر دیا۔ تنویر سر نے کال کاٹ کر امجد کو دیکھا۔

"سر! آئی تھنک... میں اور خرم چیچی کے لیے نکلتے ہیں... ابھی۔"

"ہوں۔ مطلب تب تک میں یہیں ہوں۔ لوکیشن میں بتاؤں گا۔" وہ بھی کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئے۔

جہانگیر کی حالت غیر تھی لیکن اسے اب کوئی پوچھ نہیں رہا تھا۔ چیچی وہاں سے بس آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ امجد اور خرم پھر انہی دو حوالداروں کے ساتھ اسی وقت روانہ ہو گئے لیکن اس بار ایک دوسری جیپ بھی ساتھ تھی۔ پچھلی جیپ میں بھی چار حوالدار تھے۔ اندازہ نہیں تھا آگے کتنے لوگوں سے واسطہ پڑ جائے۔ یہ امجد کے فوری ایکشن کا ہی نتیجہ تھا کہ کچھ ہی دیر میں وہ یقیناً اس پورے رینکٹ تک پہنچنے والے تھے۔

امجد اللہ کا بڑا شکر گزار تھا، خرم اور سر تنویر جیسے مخلص اور ایماندار افسران کے میسر آنے پر۔ سہ پہر ڈھلنے پر وہ چیچی پہنچے۔ سر تنویر نے ہی جہانگیر سے کال کروا کر لوکیشن تک پہنچا دیا۔ وہ ایک پرانی فیکٹری کی بیک پر بنا ایک کباڑ خانہ تھا۔ پرانے سامان سے بھرا، بالکل خستہ۔ نہ راستہ ٹھیک تھا، نہ سڑک پکی، لیکن سر تنویر نے جہانگیر سے کال کروا کر یقین انہیں شہزاد اور جابر کے سروں پر پہنچا دیا۔ سر جہانگیر کی کال سے شہزاد کو چونکہ قطعاً کوئی شبہ نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ لوگ بالکل ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ پولیس چاروں جانب سے اچانک گھیرا تنگ کرتی وہاں پہنچ گئی۔ کباڑ خانے میں اس وقت چھ آدمی موجود تھے۔ سبھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ شہزاد فاروق، جابر عالم کا بھی اسسٹنٹ تھا۔ ہتھکڑیاں لگا کر ان سب کو اریسٹ کیا گیا اور جگہ کی تلاشی لے کر چھ ایک پستول، ایک رائفل اور نشہ آور اشیا برآمد کر کے قبضے میں لے لی گئیں۔

شام سے رات ہو گئی تھی، جس وقت ان سب کو تھانے لا کر بند کیا گیا۔ سر تنویر وہاں سے جا چکے تھے۔ خرم نے بتایا کہ سر تنویر نے جہانگیر سلیم کو ایف آئی اے کے حوالے کر دیا ہے۔ خرم اور امجد نے باقی کی تفتیش اگلے دن پر اٹھا رکھی اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ سٹی تھانہ اس وقت منشیات فروشوں کے پورے گینگ سے بھرا پڑا تھا۔

معاشرتی برائیوں کے خلاف برسرپیکار نوجوان
کی داستان آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

urdunovels.com